حدیث
کے
اصلاحی مضامین

جلد ہشتم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

تفصیلات

کتاب کا نام:........... حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد ہشتم)

افادات:........ حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بہ اہتمام:..................خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم

صفحات:..................................۴۵۶

ناشر:.......................ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

99133,19190 / 99048,86188

ملنے کے پتے

- شعبۂ فیض محمود، سورت 99988,31838
- مفتی سلیمان شاہوی (دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر) 88666,21229
- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند 97562,02118
- مکتبۂ انور (مفتی عبدالقیوم راجکوٹی) جامعہ ڈابھیل 99246,93470
- حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)
- مدینہ ایجنسی جھانپا بازار سورت
- قاضی، نزد مرکز مسجد رانی تالاب سورت
- اسلامی کتب خانہ چوک بازار سورت
- رلا بیل شوپ رانی تالاب سورت

اجمالی فہرست مضامین ...... جلد ہشتم

تفصیلی فہرست مضامین ...... جلد ہشتم

جواز الاخذ من غير مسألة ولا تطلع اليه

بغیر سوال اور اشرافِ نفس کے کوئی چیز ملے؛ اس کو لینا

الحث علیٰ الأكل من عمل يده والتعفف به عن السؤال والتعرض للأعطاء

کمانے کے لیے محنت کرنے اور سوال وسوالی جیسی صورت بنانے سے بچنے کی ترغیب

الکرم والجود والانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ [۱]

سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

الکرم والجود والانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ [۲]

سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

الکرم والجود والانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ [۳]

سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

النَّهْيُ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ

بخل اور لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت

بَابُ الْإِيْثَارِ وَالْمُوَاسَاةِ

ایثار اور غم خواری

التَّنَافُسُ فِی أُمُوْرِ الآخرۃِ والإِسْتِکْثَارُ مِمَّا یُتَبَرَّکُ بِہٖ

آخرت کے کاموں میں سبقت لے جانے اور برکت والی چیز کو زیادہ حاصل کرنے کا اہتمام کرنا

فَضْلُ الْغَنِیِّ الشَّاکِر

شکرگزار مالدار کی فضیلت

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الْأَمَلِ[۱]

موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وقَصْرِ الأمَلِ[۲]

موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

بَابُ اِسۡتِحۡبَابِ زِيَارَةِ الۡقُبُوۡرِ لِلرِّجَالِ وَمَا يَقُوۡلُهُ الزَّائِر

مردوں کے لیے قبرستان جانے کا مستحب ہونا، اور وہاں کے اعمال

كَرَاهَةِ تَمَنِّي الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ وَلَا بَأْسَ بِهٖ لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ فِي الدِّيْنِ

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا

بَابُ الْوَرَعِ وَ تَرْكِ الشُّبُهَاتِ

احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا

اِسْتِحْبَابِ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ اَوِ الْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّيْنِ وَوُقُوْعٍ فِي حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَّنحوهَا

خلوت گزینی کا مستحب ہونا

بَابُ فَضْلِ الِاخْتِلَاطِ بِالنَّاس

لوگوں سے اختلاط کی شرائط

التَّوَاضُعِ وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ[۱]

تواضع اختیار کرنا

اَلتَّوَاضُعِ وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِیْنَ [۲]

تواضع اختیار کرنا

تَحرِیمُ الکِبرِ وَالاِعجَاب

کبر وخود پسندی کی حرمت

بابُ حُسْنِ الْخُلُق

اچھے اخلاق

باب الحلم والاناءة والرفق[۱]

حلم، وقار اور نرمی

بَابُ الحِلمِ وَالانَاءَةِ وَالرِّفق [۲]

حلم، وقار اور نرمی

باب العفو والاعراض عن الجاھلین

نادانوں کو معاف کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا

باب إحتمال الأذیٰ

پہنچائی جانے والی تکلیف کو برداشت کرنا

الغضب إذا انتہکت حرمات الشرع والانتصار لدین اللہ تعالیٰ

شعائر دین کی بے حرمتی کے وقت غصہ کرنا اور اللہ کے دین کے لیے بدلہ لینا

اداریہ

بسم اللہ رب البیت

ایک بات جو پہلے بار بار لکھی جا چکی ہے، اِس مجلد کے ابتدائی مضامین اِس کا عمدہ نمونہ ہیں، وہ یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے، کسی فرد، قوم، قبیلہ یا ملک کی جاگیر نہیں ہے، تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اِس کی تعلیمات میں جو ہمہ گیری اور جامعیت ہے، آج دنیا کا کوئی مذہب اِس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔

محترم قارئین! تنقید اور پروپیگنڈہ سب سے آسان کام ہے۔ آج اسلام پر کیچڑ اُچھالنے کے لیے میڈیا کا جس بے دردی سے اسراف کیا جارہا ہے، یہ حقانیتِ اسلام کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ.﴾ (الصف:۸) یہ لوگ اپنی پھونک سے نورِ الٰہی بجھانا چاہتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ٹھان رکھی ہے کہ اپنے نور کو تام کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو پسند نہ آئے:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن	❁	پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مسلمانو! میڈیا کی اِن شرارتوں اور ہتھکنڈوں سے کبھی بددل نہ ہونا، نہ احساسِ کمتری (Inferiority Complex) کا شکار بننا۔

اِس مجموعہ کے ابتدائی مضامین مالیات سے متعلق ہیں۔ جب ہم دنیا میں اُن قوموں کو دیکھتے ہیں جو مالیات کے سلسلے کی اسلامی تعلیمات سے ناآشنا ہیں، اُنھیں کچھ پتہ نہیں مال کیسے کمایا جائے؟ کیوں کر خرچ کیا جائے؟ تب ہمیں اپنے مذہب کی قدر ہوتی ہے۔ اپنے مذہب کو جانو، پہچانو! اِس کی گہرائی میں جاؤ؛ تاکہ پتہ چلے کہ اِس دین میں مخلوق کے لیے کیا خیرات و برکات ودیعت ہیں۔

کیا آج اسلام کے علاوہ کوئی مذہب یہ بتانے کی پوزیشن میں ہے کہ مال کی کیا حقیقت ہے؟ اِس کو حاصل کیسے کیا جائے؟ اِس کو خرچ کیسے کیا جائے؟ بچت کی جائے یا نہیں؟ بچت کتنی کی جائے؟ خود پر کتنا خرچ ہو؟ اوروں پر کتنا خرچ ہو؟ خرچ کرنے میں (Priority) کس کو دی جائے؟ ثانوی درجہ کس کو دیا جائے؟ خدا کے لیے خرچ کرنے پر دارین میں کیا فوائد حاصل ہوں گے؟ خدا کے یہاں سخی کا کیا مقام ہے؟ خدا کے دربار میں بخیل کی کیا حیثیت ہے؟ فضول خرچی کیا ہے؟ فضول خرچی کیا نہیں ہے؟ سخاوت واسراف میں کیا فرق ہے؟ اگر آپ کے پاس اِن سوالات کے جوابات نہیں، ولن تفعلوا؛ تو پھر آپ کو مذہبِ اسلام پر تنقید کا حق بھی نہیں۔

آج انسانوں کی اکثریت مال ومنال بڑھانے کے چکر میں نہ معلوم کن سنگلاخ وادیوں میں ماری ماری پھر رہی ہے، رات دن ایک کر رکھا ہے، بے چین و پریشان ہے، کانفرنسیں، نمائشیں (Exibitions)، اسکیمیں اور نہ معلوم کیا کیا کر رہی ہیں؛ لیکن سب لاحاصل، مندی عالمی شکل اختیار کر چکی ہے، مہنگائی ہے کہ گھٹنے کا نام نہیں لیتی، شریعتِ اسلام نے ایک چھوٹا سا لفظ پانچ حروف کا انسانوں کو دیا ''ق، ن، ا، ع، ت'' **قناعت**؛ جو تمام جھمیلوں سے انسان کی چھٹی کر دیتا ہے۔ اِس کا حاصل یہ ہے کہ، تم کو جتنا مل جائے اُس پر مطمئن بیٹھے رہو، کم ہو تو بھی، زیادہ ہو تب بھی، بہ سہولت بڑھے تو الحمد للہ، نہیں تو سبحان اللہ۔

اِس جلد میں جو مواد چنا گیا ہے یقیناً نایاب و بے نظیر ہے، اِس کا اندازہ تو پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔ حق یہ ہے کہ ایسی (Guidelines) کوئی ایک انسان تو کیا؛ سارے ممالک مل کر عظیم ترین کانفرنس کا انعقاد کر کے بھی مدوّن نہیں کر سکتے ﴿فتبارك الله أحسن الخالقين﴾ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ، ہم مال سے

کیا کما سکتے ہیں، اور کیا گنوا سکتے ہیں؟۔

پھر اللہ رب العزت نے ہمارے استاذ و مرشد، مربی و محسن، مشفق و محبوب حضرت اقدس دام مجدہم کو اندازِ بیان کے جن لطائف سے نوازا ہے، اُس نے سامعین و قارئین کے لیے اِن نورانی ہدایات و تعلیمات کا سمجھنا اور سیکھنا انتہائی آسان کر دیا ہے۔ اللہ جل جلالہٗ کی جانب سے یہ ملکہ حضرت اقدس کو عنایت فرمایا گیا ہے کہ، مضمونِ درس کو آسان ''Live'' بنا کر پیش فرماتے ہیں، جس کی وجہ سے سامعین، پھر قارئین کے لیے اُکتاہٹ اور اُلجھن کے بغیر مضمونِ ارشادِ نبوی کی گہرائی تک پہنچنا سہل ہو جاتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے علمائے حق کی طرف سے ''اصلاحی مضامین'' کو سندِ پسندیدگی و قبولیت الحمدللہ پیش کی جا چکی ہے، اِس سے مراد وہ حضرات ہیں جو وقتاً فوقتاً حضرتِ اقدس زیدت معالیہم سے ملاقات کے موقعوں پر اظہارِ پسندیدگی فرما چکے ہیں۔

بہت سی مساجد و مجالس میں اِس کتاب کا باقاعدہ اجتماعی مطالعہ ہو رہا ہے، کہیں ماہِ مبارک: رمضان میں وعظ و ارشاد کے لیے اِسی گلدستہ سے عطر بیزی کی جاتی ہے، تو بہت سے خطباء و واعظین کے لیے یہ مجموعہ تقریر کے لیے تیار مواد (ReadyMade Material) فراہم کر رہا ہے، جیسا کہ متعدد احباب کے بتانے سے معلوم ہوا۔

حضرت اقدس کی مجالس کی ایک اَور خوبی یہ رہی ہے (واللہ زادہ فیہ) کہ بغیر شدید ترین ضرورت کے موضوع سے نہیں ہٹتے، ہاں! جب کوئی اہم بات چھڑ جاتی ہے تو پھر اُسے پوری کیے بغیر چھوڑتے بھی نہیں۔

ایسا عموماً تب ہوتا ہے جب بات معاشرہ میں تعلیمات اسلامی کے متعلق پھیلی

ہوئی غلط فہمیوں کی نکل آتی ہے، جیسا کہ اِس جلد میں بھی آپ مطالعہ فرمائیں گے۔ یا کسی ایسے منکر کا تذکرہ چھڑ جائے جو سماج میں رواج کی شکل اختیار کر جاتا ہے، تب موضوع پر سکتہ (،) کر کے پہلے اُس گناہ کی شناعت وقباحت کو قلوبِ سامعین میں خوب پیوست فرماتے ہیں، اور پھر موضوع پر آ جاتے ہیں۔

ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ ہمیں عمومی درسِ حدیث ایک ایسی ہستی سے حاصل کرنے کا شرف مل رہا ہے جسے تدریس، تعلیم وتربیت، انتظام وانصرام اور راہِ سلوک واحسان کا طویل ترین تجربہ حاصل ہے۔ کہتے ہیں: "سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيْمَ" یعنی تجربہ کار اور حکیم کی رائے میں تعارض ہو، تو ترجیح تجربہ کار کی بات کو دی جائے گی۔

ہمارے حضرت اقدس دام مجدہم کی فراغت دار العلوم اشرفیہ راندیر سے ہے، اِس کے بعد دار العلوم دیوبند میں دو سال گزارے، جس میں تکمیل فنون وافتاء وغیرہ کیا، اِس ضمن میں حضرت اقدس فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ٹچ "Touch" میں آئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے باقاعدہ تلمذ کا شرف حاصل ہونے کے علاوہ حضرت قطب الاقطاب شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت واسترشاد اور حضرت کے ایماء پر حضرت اقدس فقیہ الامتؒ کی مخصوص تربیتی توجہ پھر شفقت وفیضان کے موردِ خاص بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

دیوبند سے فراغت کے بعد ڈابھیل میں تدریسی تقرر ہوا؛ لیکن حضرت اقدس فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ کے دمِ واپسیں تک ضابطہ ورابطہ رہا، جس کی نظیر ہمارے دَور میں کم ملتی ہے۔

اپنے معمولات وحالات کی باقاعدہ خطوط کے ذریعہ اطلاع، پھر حضرت کی ہدایات پر سختی سے عمل، نجی معاملات میں مشورہ لینا؛ ہمیشہ کا معمول رہا۔ حضرت اکثر سناتے ہیں کہ: ایک مرتبہ حضرت اقدس کو خط لکھا کہ معمولات چھوٹ رہے ہیں، جواب

آیا کہ: ”پھر وہ معمولات کہاں ہوئے، وہ تو متروکات ہو گئے“، فرمایا: بس! اِس جواب نے اِتنا اثر کیا کہ پھر کبھی معمولات ناغہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: میں نے اپنے اکابر میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہ کو شدید بیماری سے کچھ پہلے تک اور حضرت شیخ الاسلام اور اپنے چچا جان کو دیکھا کہ بہت اہتمام سے ذکر بالجہر کرتے رہے۔ (آپ بیتی ۱/ ۶۶۴ مطبوعہ اشاعت العلوم سہارن پور)

ہمارے مرشد و مربی حضرت دامت برکاتہم کو بھی اللہ جل جلالہٗ نے اِس نعمت سے حظِ وافر قابلِ رشک حد تک عطا فرمایا ہے۔ فللّٰہ الحمد۔

راقم آثم کو یاد ہے کہ، کبھی کوئی معمولی بات ہوئی تو فوراً پوسٹ کارڈ لکھ کر حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے نام روانہ فرماتے۔ ربیع الاول کے بیانات کی دعوت کا سلسلہ شروع ہوا، تو اپنے مرشد سے باضابطہ استفسار کر کے ہی آگے قدم بڑھایا۔

خلاصۂ کلام ایں کہ کسی کو اپنے شیخ سے رابطہ کا تعلق ہوتا ہے کسی کو ضابطہ کا، الحمدللہ ہمارے حضرت کو اپنے حضرت سے دونوں تعلقات کاملاً حاصل تھے۔

تعطیلات کے زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ جہاں ہوتے، ہمارے حضرت باقاعدہ اجازت حاصل کر کے وہ قیمتی زمانہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزار کر مراحلِ سلوک طے فرماتے رہے۔ اُس زمانہ میں دو ہی بڑی تعطیلات تھی: ایک عیدالاضحیٰ، دوسری سالانہ۔ حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول بقرعید باندہ میں کرنے کا تھا، ہمارے حضرت بھی اجازت حاصل کر کے اُس موقع سے فائدہ اٹھاتے۔

سالانہ جلسہ ہوتے ہی دیوبند پہنچ جاتے، اور عشرۂ اخیر میں بہ ارشادِ حضرت ڈابھیل واپسی ہوتی۔ ڈابھیل میں ششماہی تعطیلات ایک ہفتہ کا سلسلہ شروع ہوا، تو یہ

گویا حضرت دام مجدہم کے لیے اپنے شیخ سے استفاضہ کا ایک اَور سنہری موقع ہوگیا، چناں چہ یہ تعطیلات بھی حضرت کے ساتھ گزرنے لگیں۔ یہ تو سفرنامۂ سلوک کے چند اشارات ہیں، پورا سفرنامہ تو مسافر ہی لکھ سکتا ہے۔

جس شخصیت نے ایسی باضابطگی کے ساتھ اپنے مرشد سے تربیت حاصل کی ہو، وہ کن کن اوصاف کی حامل ہوگی! کون اندازہ لگا سکتا ہے!!۔

جہاں تک تدریسی تجربہ کا سوال ہے، تو الحمدللہ اِس کی نصف صدی مکمل فرما کر اب درسِ نظامی کی سدرۃ المنتہٰی صحیح بخاری جلد اول کی کامیاب تدریس کا دوسرا سال چل رہا ہے۔ اس طویل مدت میں کیا کیا نشیب وفراز سے گزریں ہوں گے؟ اس عرصۂ دراز میں حضرت کا یہ امتیاز رہا کہ درس طلبہ کو گھول کر پلا دیتے ہیں، کوئی سبق بغیر تیاری کے نہیں پڑھاتے، حد یہ ہے کہ شنبہ کے اس عمومی درس کی بھی باضابطہ تیاری فرما کر تشریف لاتے ہیں۔ اس درس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ ''عیاں راچہ بیاں''۔

ناظرین بزرگوار! بندہ کو چاپلوسی سے نفرت ہے؛ لیکن مجبوری یہ ہے کہ بہ قول حضرت اقدس تھانویؒ: ''ہندوستان کے خمیر میں مردہ پرستی ہے''۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بزرگوں کی حیات میں اُن کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی جاتی، اُن سے تربیت حاصل نہیں کی جاتی، پھر وفات کے بعد اُن کے گُن گائے جاتے ہیں، کیوں نہ ہم اُن کی حیات ہی میں استفادہ کے ہر موقعہ کو غنیمت سمجھ لیں۔ حضرت اقدس کے مفصل حالاتِ زندگی کے لیے ''مقدمۂ محمود الفتاویٰ'' کے مطالعہ کا مشورہ ہے۔

یہ تو جملۂ معترضہ تھا، گو تھوڑا طویل ہی سہی، اب ہم مضامینِ کتاب کی طرف لوٹتے ہیں، ہدایات بہ سلسلۂ مالیات ہی کے بیان میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ''شکر گزار مالدار کی فضیلت'' کا عنوان قائم فرما کر شاید اِس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ، مالدار ہونا

مطلقاً برا نہیں ہے، جیسا کہ بعضوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، مالدار اگر شاکر ہو تو اُس کے با قاعدہ فضائل وارد ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون جو اِس سے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ''فضائل صدقات'' میں نقل فرمایا ہے، قابلِ مطالعہ ہے۔

حدیث میں ''غنیٰ'' سے مطلقاً پناہ نہیں مانگی گئی ہے؛ بلکہ ایسے غنیٰ سے پناہ مانگی گئی ہے جو سرکش بنانے والا ہو۔ ''وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ كُلِّ غِنًى يُّطْغِيْنِيْ'' (الحزب الاعظم) معتدل غنیٰ کا سوال کیا گیا ہے۔ ''وَأَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ غِنَايَ وَغِنَا مَوْلَايَ، أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ غِنَى الْأَهْلِ وَالْمَوْلٰى''۔ اے اللہ! دنیا دے کر میرے دین پر مدد فرما: ''أَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰى دِيْنِيْ بِالدُّنْيَا'' (الحزب الاعظم)

وجہ اِس کی یہ ہے کہ مالدار ہونا، یہ ایک غیر اختیاری امر ہے، جیسے: فقر؛ اور اسلام نے غیر اختیاری امور پر فی نفسہٖ کوئی فضیلت یا وعید بیان نہیں کی ہے۔

مالیاتی ہدایات کے معاً بعد حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ''موت کی یاد اور امیدوں کا اختصار'' عنوان قائم کر کے شاید ہیلپ لائن (Help Line) بتائی ہے کہ: جو شخص ہر وقت موت کو یاد رکھے گا، امیدوں کو مختصر کرے گا، اُس کے لیے سخاوت آسان، بخل مشکل، مانگنا مشکل، قناعت آسان، محنت مشقت کر کے حلال کمانا آسان، ایثار و مواسات سہل ہو جائے گا، اور دینی امور میں تنافس کا جذبہ قدرتی طور پر پیدا ہو جائے گا۔

حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی انگوٹھی پر لکھوایا تھا: ''نصیحت کرنے کے لیے موت کافی ہے'': كفىٰ بالموت واعظاً۔

کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے	۞	ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
موت آ کر ہی رہے گی یاد رکھ	۞	جان جا کر ہی رہے گی یاد رکھ

انسان کو مرنے کے بعد منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے، اِس طرح قبرستان

وجود میں آتے ہیں، اب اِن سے متعلق احکام کے جاننے کی ضرورت پڑے گی؛ اِس لیے مصنفِ علامہ نے سرخی قائم کی: ''مَردوں کے لیے زیارتِ قبور کا استحباب، زائر کیا پڑھے؟'' اِس ضمن میں بیش قیمت مواد موجود ہے۔

موت کی یاد کے فوائد پڑھ کر شاید کسی کو خیال ہو کہ موت کی دعا ہی کیوں نہ کر لوں، تو فوراً امام رحمۃ اللہ علیہ نے بتادیا کہ: ٹھہرو! ابھی موت کی تمنا مت کرو، اِس سلسلے کی اسلامی ہدایات پڑھ لو، سمجھ لو؛ تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون سے اسباب وعوامل ہیں جن میں تمنائے موت کی اجازت ہے اور نہیں ہے؟ پھر اُن کو اپنے ذاتی حالات پر منطبق کر دیکھو، خود فیصلہ کرلو کہ آپ کے لیے تمنائے موت کی اجازت ہے یا نہیں؟۔

موت کا استحضار ہونے کے بعد انسان کا قلب دنیا کی طرف سے قدرتی طور پر سرد ہو جاتا ہے، اور وَرع وترکِ شبہات کی طرف طبیعت چلنے لگتی ہے؛ اِس لیے صاحبِ کتاب نے عنوان شروع کیا: ''وَرع وترکِ شبہات کا بیان'' اِس سرخی کو حضرت اقدس نے کماحقہٗ تشریح فرما کر بے غبار فرما دیا ہے۔ ورع کا مطلب کیا ہے؟ اسلاف نے ورع کا کیا نمونہ دیا۔ واقعات کی شکل میں اِسے بیان فرمایا ہے۔

اِس کے بعد والے عنوان میں مصنفِ ریاض الصالحین نے یہ بتایا ہے کہ ۱ لوگوں اور زمانے کے بگاڑ کے وقت ۲ دین کے اندر فتنہ میں مبتلا ہونے کے اندیشہ کے وقت ۳ اور حرام یا مشتبہ امور میں مبتلا ہونے کے ڈر کے وقت آدمی کے لیے مستحب ہے، کہ گوشہ نشینی اختیار کرلے۔

لیکن کہیں اِس کو مطلقاً افضل نہ سمجھ لیا جائے؛ اِس لیے بعد والے عنوان میں بتادیا کہ عام حالات میں لوگوں میں رہنا ہی پسندیدہ ہے۔

اب تواضع کا نمبر ہے۔ انسان جب شریعتِ مطہرہ کی اِتنی زبردست پابندی

کرے گا تو ظاہر ہے کہ شیطان ہاتھ پر ہاتھ دیے تو نہیں بیٹھا رہے گا، اب وہ کبر کے دام میں پھنسا کر انسان کو بھی اپنی طرح راندۂ درگاہ کروانے کے فراق میں رہے گا؛ اِس لیے امام علام رحمۃ اللہ علیہ نے تواضع پر مواد اکٹھا فرمایا؛ تاکہ آدمی آپے سے باہر نہ ہو جائے۔

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صاحب نے لکھا کہ: حضرت! ایک طویل عرصہ سے تہجد کی پابندی ہو رہی تھی، ایک دن چھوٹ گئی، اِس کا بہت رنج ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ہوسکتا ہے اِس لیے چھڑوائی گئی ہو کہ آپ میں کبر نہ پیدا ہو جائے:

دلا گر تواضع کنی اختیار	۞	شود خلقِ دنیا ترا دوست دار

اِس عنوان کے تحت اصل کتاب کے علاوہ اِس کی تشریحات میں بڑے نایاب مضامین ہیں۔

''وبضدها تتبين الاشياء'' تواضع کو سمجھنا ہو تو تکبر سمجھ لیں، تواضع خود بہ خود واضح ہو جائے گا؛ اِسی لیے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تواضع کے بیان سے فارغ ہو کر ''تکبر اور خود پسندی کی حرمت'' کا باب قائم فرمایا ہے، اور اِس کے تحت آیات و روایات پیش فرما کر اِس کی شناعت وقباحت بتانے کی کامیاب سعی فرمائی ہے۔ اِس مضمون کی تشریح طبیبِ حاذق کی زبان سے اگر سننے کو ملے تو کیا لطف آجائے!۔

اب عنوان ہے: ''اچھے اخلاق کا بیان''، اچھے اخلاق کا لفظ جس کثرت سے ہمارے معاشرہ میں مستعمل ہے، اُتنی ہی اُس کی حقیقت سے ناواقفیت بھی ہے۔ حسن خُلق اور اخلاق سے کیا مراد ہے؟ اِس عنوان کے تحت ہمارے قارئین اِن شاء اللہ ایسی تشریح پڑھ سکیں گے کہ، مضمون پوری طرح نکھر کر سامنے آجائے گا۔

حسنِ خلق ایک درخت ہے، جس کی مختلف شاخیں ہیں: بردباری، وقار، نرمی، عفوو درگزر وغیرہ؛ اِس لیے امام ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اِن مختلف شاخوں کو مستقل عنوان دے کر متعلقہ آیات وروایات کو اِن کے تحت جمع فرما دیا ہے۔

مواد کی فراہمی یعنی سی ڈی (CD) سے کاغذ پر مضامین لکھنا کسی بھی درسی تقریر کی طباعت میں اہم ترین مرحلہ شمار ہوتا ہے، الحمد للہ ہمارے حضرت اقدس کے محبین، مسترشدین وتلامذہ کی تقریباً ایک پوری جماعت ہے جو اِس گھاٹی سے ہمیں گزارتی ہے، چاہے لکھ کر یا اپنے تلامذہ واحباب سے لکھوا کر؛ ہم اُن سب ہی احباب کے ممنون ہیں۔ اِس جلد کے لیے مواد کی فراہمی میں بھی جناب مفتی رفیق صاحب کوکنی مدفیضہٗ اور اُن کے رفقاء، حضرت مفتی عارف صاحب کنجروی زید فضلہ اور اُن کے احباب کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اِسی طرح آئندہ جلدوں کے مواد کی تیاری میں بھی دیگر بہت سے احباب بہ رضا ورغبت بڑی عرق ریزی وخوش اسلوبی سے لگے ہوئے ہیں، بہت سارا مواد تو الحمد للہ ہم تک پہنچ چکا ہے۔

اے اللہ! تو اِن تمام احباب کو اپنی شایانِ شان جزائے خیر عطا فرما کر اِن کے علوم واعمال، قربِ الٰہی میں بے پناہ ترقی عطا فرما، دنیا وآخرت کی بھلائیاں نصیب فرما، حاجات کا تکفل فرما، آئندہ مزید در مزید کی توفیق عطا فرما۔ آمین

ابوزاہر

۲۱ / ۱۱ / ۱۴۳۳

۷ / ۱۰ / ۲۰۱۲

القناعة والعفاف والاقتصاد فی المعیشة

قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا اور معیشت میں میانہ روی

﴿مجلس ۱﴾

یکم ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۳/جون ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ، وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّهۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:

ترجمۃ الباب کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے: قناعت اختیار کرنا اورسوال سے بچنا، زندگی گزارنے اور خرچ کرنے کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنا اور بلاضرورت سوال کرنے کی برائی۔

پہلی بات ''قناعت'' ہے۔قناعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کو جو کچھ ملے اُس پر راضی اور خوش رہے، جس کو گجراتی میں (aitmi si^tii!Si) کہتے ہیں، گجراتی کی کہاوت ہے: ''si^tii!Si& nir siDi si#Ki&'' جو آدمی قناعت والا ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوش اور عیش وآرام میں رہتا ہے۔

دوسری بات ''عَفاف'' ہے۔اِس کا مطلب ہے: اپنے آپ کو سوال سے بچانا، کسی کے سامنے سوال نہ کرنا۔ ویسے عفت روکنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، کہ نفس کو ہر ایسی چیز سے روکنا جو اُس کے لیے تکلیف کا ذریعہ ہو، اِس کے لیے لفظ عَفاف استعمال ہوتا ہے۔ اور عام طور پر یہ لفظ دو چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے: ایک تو سوال سے بچنے کے لیے، اور دوسرا اپنی شرمگاہ کو زنا وغیرہ گناہ سے بچانے کے لیے بھی اِس کا استعمال ہوتا ہے، جس کو ''عفت و پاک دامنی'' کہتے ہیں؛ لیکن عربی زبان میں

''عفاف'' ایک الگ ہی مفہوم رکھتا ہے۔اگرچہ یہاں یہی مرادلیا گیا ہے کہ،آدمی اپنے آپ کولوگوں سے سوال کرنے سے بچائے۔

اورتیسری بات یہ ہے کہ،زندگی گذارنے اورخرچ کرنے کے معاملہ میں آدمی میانہ روی اختیارکرے،نہ تو بہت زیادہ خرچ کرے اورنہ بخل سے کام لے؛ بلکہ درمیانی راہ اختیارکرے۔

نہ اسراف کی اجازت،اورنہ بخل کی

اسلام نے ہر معاملہ میں میانہ روی کو پسند کیا ہے،اور نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے۔﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندے اورعبادالرحمٰن کی جوعلامتیں اورنشانیاں بتلائی گئی ہیں،اُن میں ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی بھی نہیں کرتے،کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہوں،اوراُس میں کمی اوربخل سے بھی کام نہیں لیتے؛ بلکہ ضرورت کے بہ قدرخرچ کرتے ہیں،اوردرمیانی راہ اختیارکرتے ہیں۔

''اسراف'' کا اطلاق دوچیزوں پر ہوتا ہے، جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے وہاں خرچ کرنا،اوردوسرے جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں بھی جتنا خرچ کرنا چاہیے اُس سے زیادہ خرچ کرنا؛اِن دونوں کے لیے''اسراف''بولا جاتا ہے۔بعضوں نے اسراف اور بسط میں فرق کیا ہے،قرآنِ پاک میں ایک اَورجگہ بھی باری تعالیٰ نے ارشادفرمایا ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ اپنا ہاتھ بندھا ہوا بھی مت رکھو،اور بالکل کھلا بھی نہ چھوڑو۔خرچ کرنے کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے میانہ روی اختیارکرنے کا حکم دیا ہے،یعنی ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی خرچ ہی نہ کرے،مٹھی بندرکھے۔اوریہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک

دَم کھول دے؛ بلکہ میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے؛ ورنہ ایسا ہوگا کہ اگر زیادہ خرچ کروگے تو جیب خالی ہوجائے گا، اور بالکل غمگین ہوکر سر جھکا کر بیٹھ جاؤگے۔

پھر آدمی بے صبری سے کیوں کام لے؟

اِسی سلسلہ میں قرآنِ پاک کی ایک آیت ذکر کی ہے: ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الأَرْضِ إِلاَّ عَلَى اللهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ روئے زمین پر جتنے بھی جاندار ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوپر اُن کی روزی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُن کی روزی کا ذمہ لے رکھا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے روزی کا ذمہ لے رکھا ہے تو پھر آدمی کیوں بے صبری سے کام لے؟ بس! اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر روزی دے گا، ہماری روزی وقت پر ضرورت کے بہ قدر مل ہی جائے گی، وہ کہیں جانے والی نہیں ہے ﴿وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا﴾ آدمی کا جو مستقل جائے قیام اور ٹھکانہ (permenanat Address) ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے آدمی کہیں جاتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ دنیا کا دستور تو یہ ہے اگر کسی کا کہیں وظیفہ مقرر ہو تو وہ اُس کی مقررہ جگہ (permenanat Address) پر پہنچتا ہے۔ اگر اُس کو کہیں سفر درپیش ہو تو اُس کو پہلے سے درخواست دینی پڑتی ہے، اور محکمہ میں اطلاع کرنی پڑتی ہے کہ اِتنے دنوں کے واسطے مَیں فلاں جگہ جا رہا ہوں، میرا وظیفہ مجھے وہاں پر بھیج دیا جائے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ مَیں دہلی جانے والا ہوں، میری روزی وہاں بھیج دی جائے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں، آپ مستقل طور پر جہاں قیام فرما ہیں وہ بھی، اور جہاں تھوڑی دیر کے لیے جانے والے ہیں اُس سے بھی اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

سوال کرنے کا ایک قدرتی اثر

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً(البقرة:۲۷۳)﴾ صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں؟ اِس سلسلے میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: یہ اُن فقیروں کا حصہ ہے جو اللہ کے راستہ میں روک دیے گئے۔ گویا جو لوگ اللہ تعالیٰ ہی کے کاموں کے لیے اپنی ذات کو روکے ہوئے ہیں، اُن کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے، جہاد کی مصروفیت کی وجہ سے، اور دوسرے دینی امور کی مصروفیت کی وجہ سے روزی حاصل کرنے کے لیے زمین میں سفر نہیں کر پاتے، اور جو آدمی اِن کی حالت سے ناواقف ہے وہ بھی اُن کی ظاہری حالت دیکھ کر اُن کو مال دار سمجھتا ہے، کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے۔ اور چاہے اپنی زبان سے سوال نہیں کرتے اور جزع فزع اور بے صبری کے ذریعہ اپنی حالت کا لوگوں کے سامنے اظہار بھی نہیں کرتے؛ لیکن اُن کے چہرے کی علامتوں سے آپ اُن کو پہچان لیں گے۔ ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً﴾ یہ ایسے لوگ ہیں جو لوگوں سے اصرار کر کے مانگتے نہیں ہیں۔ اِس آیت کا یہی جملہ ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً﴾ خاص طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اِن کی خاص شان یہ بتلائی کہ باوجود ضرورت مند ہونے کے وہ سوال نہیں کرتے۔

آگے روایتیں آئیں گی کہ اپنی ضرورت ہو تب بھی آدمی کو اپنے آپ کو سوال سے بچانا چاہیے۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ سوال ہی ہماری ضرورتوں کا حل ہے، حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: سوال کے نتیجہ میں آپ کی ضرورت ختم نہیں ہوگی؛ بلکہ اَور بڑھ جائے گی۔ سوال کرنے کا یہ قدرتی اثر ہے۔

مقصدِ زندگی

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ﴾ مَیں نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت اور فرماں برداری کے لیے پیدا کیا ہے؛ اِس لیے آپ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اپنا کام کیجیے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: مَیں اُن سے روزی نہیں مانگتا، مَیں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں؛ بلکہ اُن کو روزی تو مَیں دیتا ہوں۔ دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ آقا لوگ غلاموں کو کام کاج میں لگا کر اُن کی آمدنی سے اپنی روزی کے طور پر کچھ حاصل کرتے ہیں، باری تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کہ بندوں کو روزی کموانے کے لیے پیدا کیا ہو۔

حقیقی مالداری؛ دل کی صفت

۵۲۲:- عن أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ. (متفق علیه)

(العَرَضُ) بفتح العين والرَّاء: هُوَ الْمَالُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالداری مال وسامان کی کثرت اور زیادتی کا نام نہیں ہے؛ بلکہ حقیقی مالداری دل کی بے نیازی ہے۔

افادات:- غِنیٰ اور مالداری سامان کی زیادتی کا نام نہیں؛ بلکہ دل کی بے نیازی ہے، آدمی کے دل میں ایک قسم کا سکون واطمینان ہو، بے نیازی کی کیفیت ہو، اور لوگوں سے سوال نہ کرے۔ باقی بہت سے لوگوں کے پاس بہت سارو پیہ ہوتا ہے، اِس کے باوجود اُن کے دل میں حرص وطمع بھری ہوئی ہوتی ہے، اِتنا ساز وسامان اور روپیہ ہونے کے باوجود اُن کو صبر اور قرار نہیں ہوتا۔

وہ آدمی کامیاب ہوگیا

۵۲۳:-وعن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافاً، وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کامیاب ہوگیا وہ آدمی جو اسلام لایا (اِس لیے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے) اور اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ قدرِ ضرورت روزی دی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو جو دیا پھر اُس پر قناعت بھی عطا فرمائی۔

افادات:- یعنی اُس کے دل میں کوئی حرص اور لالچ نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ملا، اُسی پر وہ راضی اور خوش ہے، اور اُسی سے وہ اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، زیادہ کی طلب میں لگا ہوا نہیں ہے۔

بغیر سوال ملنے پر برکت کا وعدہ

۵۲۴:-عن حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سألتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَأَعْطَانِي ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَأَعْطَانِي، ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَأَعْطَانِي، ثُمَّ قَالَ: يَا حَكِيمُ، إِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرٌ حُلْوٌ فَمَنْ أَخَذَهُ بِسَخَاوَةِ نَفْسٍ بُورِكَ لَهُ فِيهِ، وَمَنْ أَخَذَهُ بِإِشْرَافِ نَفْسٍ لَمْ يُبَارَكْ لَهُ فِيهِ، وَكَانَ كَالَّذِي يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ، وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى. قَالَ حكيم: فقلتُ: يَا رسول الله! وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَرْزَأُ أَحَداً بَعْدَكَ شَيْئاً حَتَّى أُفَارِقَ الدُّنْيَا. فَكَانَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ يَدْعُو حَكِيماً لِيُعْطِيَهُ الْعَطَاءَ، فَيَأْبَى أَنْ يَقْبَلَ مِنْهُ شَيْئاً، ثُمَّ إِنَّ عُمَرَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دَعَاهُ لِيُعْطِيَهُ فَأَبَى أَنْ يَقْبَلَهُ. فقال: يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! أُشْهِدُكُمْ عَلَى حَكِيمٍ أَنِّي أَعْرِضُ عَلَيْهِ حَقَّهُ الَّذِي قَسَمَهُ اللّٰهُ لَهُ فِي هٰذَا الْفَيْءِ فَيَأْبَى أَنْ يَأْخُذَهُ. فَلَمْ يَرْزَأْ حَكِيمٌ

أَحداً مِنَ النَّاسِ بَعْدَ النبی ﷺ حَتَّى تُوُفِّي. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

((يَرْزَأُ)) بِراءٍ ثُمَّ زايٍ ثُمَّ همزة؛ أيْ: لَمْ يَأْخُذْ مِنْ أحَدٍ شَيْئاً، وَأَصْلُ الرُّزْءِ النُّقْصَان، أيْ: لَمْ يَنقُص أحَداً شَيْئاً بِالأخذِ مِنْهُ. وَ((إِشْرَافُ النَّفْسِ)): تَطَلُّعُهَا وَطَمَعُهَا بِالشَّيْءِ. وَ((سَخَاوَةُ النَّفْسِ)): هِيَ عَدَمُ الإِشْرَافِ إِلَى الشَيْءِ، وَالطَّمَعِ فِيهِ، وَالمُبَالاةِ بِهِ وَالشَّرَهِ.

ترجمہ:- حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: مَیں نے نبیٔ کریم ﷺ سے مال کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے مجھے عطا فرمایا۔ مَیں نے پھر مانگا تو آپ ﷺ نے پھر عطا کیا، مَیں نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے پھر عطا فرمایا۔ اِس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اے حکیم! یہ مال بڑا سرسبز وشیرین اور میٹھا ہے (دیکھنے میں بھی آدمی کو بہت اچھا لگتا ہے، اور برتنے اور خرچ کرنے میں بھی۔ یعنی اِس کو جب استعمال کیا جاتا ہے تب بھی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے) جو آدمی اِس کو سخاوتِ نفس (یعنی نفس کے استغناء) کے ساتھ حاصل کرے گا، اُس کے لیے اِس میں برکت دی جائے گی۔ اور جو آدمی اِس کو اشرافِ نفس (یعنی نفس کی حرص وطمع) کے ساتھ لے گا تو اُس کے لیے اِس میں برکت نہیں ہے، اور اِس کا حال ایسا ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھاتا رہتا ہے اور پیٹ نہیں بھرتا، اور اوپر والا ہاتھ، نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (نبیٔ کریم ﷺ نے مال کے سلسلے میں میری درخواست پوری کرنے کے بعد جب مجھے یہ نصیحت فرمائی، تو اِس نصیحت کو سن کر) میں نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے، مَیں آج کے بعد کسی کے مال میں کمی نہیں کروں گا (کسی سے مال کا مطالبہ کرکے اُس کو زحمت میں نہیں ڈالوں گا) یہاں تک کہ دنیا سے جدا ہو جاؤں (یعنی مجھے موت آ جائے)۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے دورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو بلوا بھیجتے؛ تاکہ اُن کو اُن کا حصہ دیں؛ لیکن وہ اُس میں سے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ

خلافت میں حضرت حکیم بن حزام ؓ کو مقررہ وظیفہ لینے کے لیے بلایا؛ لیکن انہوں نے انکار کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: اے مسلمانوں کی جماعت! میں تم کو اِس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے حکیم بن حزام کو ان کا بیت المال میں مقررہ حصہ پیش کیا؛ لیکن اُنہوں نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کو بھی تکلیف نہیں دی، کسی سے بھی مال کا مطالبہ نہیں کیا اور کوئی چیز نہیں لی، یہاں تک کہ اِن کا انتقال ہوا۔

افادات:- سخاوت کا مطلب ہے کہ دل میں لالچ اور حرص نہ ہو، اور ''اِشراف'' عربی زبان میں کہتے ہیں کہ اونچائی پر سے کسی چیز کو دیکھنا اور جھانکنا، گویا نفس کسی چیز کے متعلق اپنے اندر طلب رکھتا ہو، اُسی کو نفس کی تاک جھانک کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی آدمی یوں سوچے کہ مجھے فلاں آدمی یہ چیز دے دے، مجھے ہدیہ دے، مجھے فلاں کی طرف سے یہ چیز مل جائے۔ آدمی کے دل میں ایسی طلب ہو، چاہے اس کو سامنے والا کچھ نہ دے۔ ایک تو ہوتا ہے زبان سے مانگنا اور سوال کرنا، اور ایک ہے دل سے کسی کی چیز کے متعلق لالچ اور خواہش رکھنا کہ فلاں آدمی مجھے فلاں چیز دے؛ اس کو ''اشراف'' کہتے ہیں۔ جس طرح زبان سے سوال کرنا حرام ہے، اسی طرح اشراف بھی حرام ہے۔ دونوں ہی ممنوع ہیں۔

اسی لیے اشرافِ نفس کے ساتھ کوئی چیز ملی ہو مثلاً دل میں ایسی لالچ پیدا ہوگئی کہ فلاں آدمی مجھے ہدیہ دے، اس کے بعد واقعۃً اس نے ہدیہ دیا تو اس میں برکت نہیں ہوگی، اور اس کا لینا پسندیدہ نہیں ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو آدمی دل کی لالچ اور طلب کے ساتھ کوئی چیز لیتا ہے، تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور اس کا حال ایسے جانور یا آدمی جیسا ہوتا ہے جس کو جوع البقر کی بیماری ہوگئی ہو کہ وہ کھانا کھاتا رہتا

ہے اور اس کا پیٹ نہیں بھرتا، ایسا ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ کتنا ہی مال اس کے پاس آئے، لیکن اس کی طمع اور طلب میں کمی نہیں آئے گی۔

''اوپر والا ہاتھ'' یعنی دینے والا ہاتھ، یا نہ مانگنے والا اور سوال نہ کرنے والا ہاتھ؛ ''نیچے والے ہاتھ'' یعنی سوال کرنے والے ہاتھ، یا نہ دینے والے ہاتھ؛ یا لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

مال کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصیحت فرمانے پر حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کرلیا کہ آئندہ موت تک میں کبھی کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ خصوصیت تھی کہ جب کسی بات پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کو ٹوکا جائے، نصیحت و تنبیہ کی جائے، تو بس! پھر مضبوطی سے اس کو ایسا پلے باندھ لیتے تھے کہ دوبارہ اس سلسلہ میں ان کو اصلاح کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ وہ ہمارے جیسے نہیں تھے کہ بار بار ٹوکا جائے، تنبیہ کی جاتی رہے؛ تب بھی دو دن کے بعد، دو مہینے یا دو سال کے بعد بھول جاتے ہیں۔ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ کسی بات پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنبیہ فرمادی، تو زندگی بھر کے لیے کافی ہوجاتی تھی۔

عہد نبھانے کا سبق آموز نمونہ

دیکھو! ان کے اس سوال پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطورِ نصیحت کے یہ چیزیں ارشاد فرمائی تھیں جس میں بتلادیا کہ سوال نہ کرنے کی یہ فضیلت ہے، اور بغیر سوال کے جو چیز ملتی ہے اس میں برکت ہے۔ سوال دو طریقوں سے ہوتا ہے، ایک تو زبان سے اور دوسرا دل سے؛ دونوں کے اندر برکت نہ ہونے کو بتلایا ہے۔

تو انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہی عہد کرلیا کہ آئندہ کسی سے سوال

نہیں کروں گا اور کسی کو زحمت نہیں دوں گا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے دورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام کو بلوا بھیجتے کہ مالِ غنیمت آیا ہوا ہے، اس میں تمہارا جو حصہ ہے، یا بیت المال میں جو وظائف مقرر کیے جاتے تھے، اس میں تمہارا جو وظیفہ مقرر ہے، وہ آ کر لے جاؤ یعنی ان کو باقاعدہ بلواتے تھے، لیکن وہ انکار کر دیتے تھے اور کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے بھی حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقررہ وظیفہ لینے کے لیے بلایا لیکن انہوں نے انکار کیا۔ چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آخرت کا بڑا فکر رہتا تھا کہ ابھی نہیں لیتے، اگر کل کو قیامت میں میرے خلاف اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعویٰ کر دیا کہ عمر نے میرا حق نہیں دیا تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں موجود مسلمانوں کو گواہ بنا کر یہ کہا کہ تم گواہ رہو کہ میں نے ان کا حصہ ان کو پیش کیا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور آیا۔ اس لیے کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ ان کی زندگی کے ساٹھ (۶۰) سال کفر کی حالت میں، اور ساٹھ (۶۰) سال اسلام کے اندر گزرے؛ کسی بھی دور میں انہوں نے کچھ بھی نہیں لیا۔

میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ وعدہ جو انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تھا اس کو طویل زمانہ تک نبھایا۔ یہ ان حضرات کی عزیمت اور پختگی کی بات ہے۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کو بھی تکلیف نہیں دی، کسی سے بھی مال کا مطالبہ نہیں کیا اور کوئی چیز نہیں لی یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوا۔

چیتھڑوں والا غزوہ

۵۲۵:- وعن أبي بردة عن أبي موسى الأشعري رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ

رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فِيْ غَزَاةٍ وَنَحْنُ سِتَّةُ نَفَرٍ، بَيْنَنَا بَعِيْرٌ نَعْتَقِبُهُ، فَنَقِبَتْ أَقْدَامُنَا وَنَقِبَتْ قَدَمِيْ، وَسَقَطَتْ أَظْفَارِيْ، فَكُنَّا نَلُفُّ عَلٰى أَرْجُلِنَا الْخِرَقَ، فَسُمِّيَتْ غَزْوَةَ ذَاتِ الرِّقَاعِ لِمَا كُنَّا نَعْصِبُ عَلٰى أَرْجُلِنَا مِنَ الْخِرَقِ۔ قَالَ أَبُوْ بُرْدَةَ: فَحَدَّثَ أَبُوْ مُوسٰى بِهٰذَا الْحَدِيْثَ، ثُمَّ كَرِهَ ذٰلِكَ، وَقَالَ: كَأَنَّهٗ كَرِهَ أَنْ يَكُوْنَ شَيْئًا مِنْ عَمَلِهٖ أَفْشَاهُ. (متفق علیه)

ترجمہ:۔ حضرت ابو بُردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک روز فرمایا کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ کے لیے نکلے۔ ہم چھ آدمیوں کی ایک جماعت بنائی گئی تھی اور ہمارے درمیان سواری کے واسطے ایک ہی اونٹ تھا، ہم باری باری اس پر سوار ہوتے تھے (جب چھ آدمی باری باری سوار ہوں گے تو ایک مرتبہ جو آدمی سوار ہو چکا اس کی باری اتنی دیر بعد آئے گی کہ درمیان میں پانچ آدمی سوار ہوں گے۔ اور پیر میں جوتے بھی نہیں تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدل چلنے کی وجہ سے) ہمارے پاؤں میں شگاف پڑ گئے، میرے پاؤں میں بھی شگاف پڑ گئے اور میرے ناخن تک گر گئے (ان شگافوں کی وجہ سے جو تکلیف ہوتی تھی اس سے بچنے اور چلنے میں آسانی ہو اس کے لیے) ہم اپنے پاؤں کے اوپر کپڑے کے چیتھڑے لپیٹتے تھے، اسی لیے اس غزوہ کا نام ''غزوۂ ذات الرقاع''، ''چیتھڑوں والا غزوہ'' ہے (''رِقاع'' عربی زبان میں چیتھڑوں کو کہتے ہیں) حضرت ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ واقعہ بیان کرنے کو تو کر گئے (ہو سکتا ہے کسی خاص جذبہ اور کیفیت میں بیان کر دیا ہو) لیکن پھر ان کی طبیعت میں ناگواری پیدا ہوئی اور خیال ہوا کہ مجھے یہ بیان نہیں کرنا چاہیے تھا (کہ ہم نے دین کے لیے ایسی مشقتیں اُٹھائیں ہیں) راوی کہتے ہیں گویا کہ انہوں نے اپنے کسی عمل کے ظاہر کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔

افادات:- اس روایت کو لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے ایسی سخت تکلیفوں پر بھی صبر کیا لیکن کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ ''عفاف''، یعنی اپنے آپ کو اتنی سخت حاجت کے باوجود سوال سے بچایا۔

دیکھو! ایک تو یہ ہے کہ عمل کرتے وقت آدمی کے دل میں ایسا خیال پیدا ہو، یہاں ایسی بات نہیں تھی، اس لیے کہ عمل تو ہو چکا تھا، اور عمل ہو چکنے کے بعد اس کو بیان کرنے سے اگر مقصود آدمی کی ریا و شہرت ہو؛ تو وہ بھی برا ہے۔ اور ظاہر ہے ان کا مقصود ریا اور شہرت نہیں تھی، لیکن وہ حضرات اپنے نفس کے کید اور نفس کی طرف سے پیش آنے والی برائیوں سے بے خوف نہیں رہتے تھے، بلکہ ڈرتے رہتے تھے۔

صفتِ استغناء پر سندِ نبوی

۵۲۶:- وعن عمرو بن تغلِبَ ۔ بِفَتْحِ الْمُثَنَّاةِ فَوْقَ وإسكان الغين المعجمة و كسر اللام: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم أَتَى بِمَالٍ أَوْ سَبْيٍ فَقَسَّمَهُ، فَأَعْطَى رِجَالاً، وَتَرَكَ رِجَالاً، فَبَلَغَهُ أَنَّ الَّذِيْنَ تَرَكَ عَتَبُوا، فَحَمِدَ اللهَ، ثُمَّ أَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ! فَوَاللهِ إِنِّيْ لَأُعْطِي الرَّجُلَ وَأَدَعُ الرَّجُلَ، وَالَّذِيْ أَدَعُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الَّذِيْ أُعْطِيْ، وَلٰكِنِّيْ إِنَّمَا أُعْطِي أَقْوَامًا لِمَا أَرَى فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِنَ الْجَزَعِ وَالْهَلَعِ، وَأَكِلُ أَقْوَامًا إِلَى مَا جَعَلَ اللهُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِنَ الْغِنَى وَالْخَيْرِ، مِنْهُمْ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ۔ قَالَ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ: فَوَاللهِ مَا أُحِبُّ أَنَّ لِيْ بِكَلِمَةِ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم حُمْرَ النَّعَمِ۔

(رواه البخاری) (الْهَلَعُ): هُوَ أَشَدُّ الْجَزَعِ ، وقِيْلَ : الضَّجَرُ۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمرو بن تَغلِب رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ایک صحابی ہیں وہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ مال یا قیدی آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مال لوگوں کے درمیان تقسیم کیا (لیکن وہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سب کو دیا جاسکتا اس لیے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے کچھ لوگوں کو دیا اور کچھ لوگوں کو نہیں دیا۔ پھر نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو نہیں دیا ان کو کچھ ناراضگی اور ناگواری ہوئی ہے (جب آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو حضور نے ایک تقریر فرمائی، اس میں) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا: اللہ کی قسم! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں ایک آدمی کو دیتا ہوں اور دوسرے کو نہیں دیتا (اس کی وجہ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو دیا جارہا ہے اس کے ساتھ محبت کا تعلق زیادہ ہے، اسی لیے تو اس کو دیا اور جس کو چھوڑا گیا شاید اس کے ساتھ وہ تعلق اور محبت کا رشتہ نہیں ہے، اسی لیے اس کو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن یاد رکھو! صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ) جس کو میں نے نہیں دیا، وہ میرے نزدیک -اس کے مقابلہ میں جس کو میں نے دیا ہے- زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کو دیا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض لوگوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بے صبری اور بے چینی کی کیفیت ہوتی ہے (اگر ان کو نہ ملے تو وہ چپ نہیں رہ سکتے، ان کی بے صبری ان کو مانگنے پر آمادہ کردے گی، اس لیے وہ مانگنے کے لیے آئیں اس سے پہلے ہی میں ان کو دے دیتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن سے تعلق زیادہ ہوتا ہے ان کو چھوڑ کیوں دیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں استغناء، اور بے پرواہی کی صفت رکھی ہے (ان کو کسی طرح کی بے صبری اور بے چینی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ''عفت'' یعنی سوال سے اپنے آپ کو بچانے اور ''قناعت'' کا وصف رکھا ہے، اس کی وجہ سے میں اُن کو نہیں دیتا) انہی میں -اس روایت کے نقل کرنے والے- عمرو بن تَغلِب بھی ہیں (حضور اکرم ﷺ نے صراحت کے ساتھ ان کا نام لیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد) حضرت عمرو بن تَغلِب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ نبیٔ کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بدلہ میں مجھے سرخ اونٹ ملیں (نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے ایسی اونچی سند دی گئی ہے کہ ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی وہ نہیں مل سکتی ہے۔)

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرایوں کو دے کر اپنے والوں کو نہیں دیتے اس لیے کہ پرائے بخشیں گے نہیں، لہٰذا ان کو دیدو، اپنے لوگوں کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا، ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نہیں دیتا وہ دراصل ان کی خوبیوں یعنی صفتِ استغناء اور صفتِ قناعت کی وجہ سے نہیں دیتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اخلاق سے متصف تھے، اور اہلِ ایمان کو بھی تاکید کی گئی ہے: ''تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ'' اور اللہ تعالیٰ بھی جب کسی کو دیتے ہیں اور کسی کو نہیں دیتے؛ وہاں پر بھی یہی معاملہ ہوتا ہے کہ جن کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر ان کو نہ دیا جائے تو پتہ نہیں وہ کیا کر ڈالیں، ہوسکتا ہے کہ نہ ملنے پر بے صبری میں ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں، اس لیے ان کے ایمان کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے ہیں۔ اور بعض ایسے مضبوط ایمان والے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی آزمائش کو برداشت کر لیتے ہیں، یا ان کے دینی حالات ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نہیں دیا جاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس طرح بھی سوچا کرے۔

القناعة والعفاف والاقتصاد فی المعیشة

قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا اور معیشت میں میانہ روی

﴿مجلس ۲﴾

۸/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۰/جون ۲۰۰۰ء

باب چل رہا ہے کہ آدمی قناعت اختیار کرے اور اپنے آپ کو سوال کرنے سے بچائے اور اپنی معیشت یعنی زندگی گذارنے میں میانہ روی اختیار کرے۔

جو آدمی سوال سے بچنا چاہتا ہے......

۵۲۷:-وعن حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ، وَخَیْرُ الصَّدَقَةِ مَا کَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًی، وَمَنْ یَسْتَعْفِفْ یُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَمَنْ یَسْتَغْنِ یُغْنِهِ اللّٰهُ. (متفق علیه) هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیِّ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ اخصر۔

ترجمہ:- حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اوپر والا ہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (یعنی مانگنے والے ہاتھ) کے مقابلہ میں بہتر ہے (اس سے مانگنے کی بُرائی معلوم ہوئی) اور اگر آپ کوئی چیز خرچ کرنا چاہتے ہیں تو جن کا نفقہ اور ذمہ داری آپ پر ہے ان سے شروع کیجئے۔ اور بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی بے پرواہی اور دل کے اطمینان کے ساتھ دیا کرتا ہے۔ اور جو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچانا چاہتا ہے، عفت اختیار کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرماتے ہیں۔ اور جو آدمی مستغنی بننا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کو دوسروں سے مستغنی بنا دیتے ہیں۔

افادات:- ایک آدمی کا ارادہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اللہ کے راستہ میں مال خرچ کروں، تو پہلے ان لوگوں پر خرچ کرے جن کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور جن کا نفقہ برداشت کرتا ہے: مثلاً بیوی، بچے، ماں باپ اور دوسرے قریب و دور کے اعزاء و اقارب جن کی ذمہ داری درجہ بدرجہ اس کے اوپر آتی ہے، انہی سے شروعات اور ابتداء کرنی چاہیے۔ جب ان کی ضرورتیں پوری ہو

جائیں اس کے بعد دوسروں کے اوپر خرچ کرنا چاہیے۔اس لیے کہ ویسے بھی جب ان کا نفقہ آدمی کے اوپر واجب ہے تو اس حیثیت سے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔کسی بھی نیک کام میں خرچ کرنے کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہی اصول بتلایا ہے کہ ابتداء ان لوگوں سے ہونی چاہیے جن کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔

کوئی آدمی باہر تو بہت کچھ خرچ کرتا ہے،اور جو لوگ اس سے قریبی تعلق رکھنے والے ہیں: مثلاً اس کے رشتہ دار، بھائی،بہنیں،اس کے بھتیجے،بھانجے؛ وغیرہ؛ ان کو نہیں دیتا،وہ بیچارے اپنی ضرورتوں کی وجہ سے دوسروں کے محتاج ہیں۔یہ تو ایسا ہی ہو گیا جیسا کہ گجراتی میں کہاوت ہے:(Gir nii! Ci!kri! Gi^T& ciiT! upiiDyiiyi ni! aiTi!)''یعنی گھر کے بچے چکی پر لگا آٹا چاٹ رہے ہیں،اور اجنبی پر آٹے کی سخاوت ہو رہی ہے''اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ابتداء انہی سے کرے۔

بے نیازی سے دینے کے دو مطلب

''عَنۡ ظَھۡرِ غِنًی'' کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ دینے کے بعد اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر دل میں خیال نہ آئے کہ میں نے خرچ نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا۔اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اُس کے پاس اتنا مال ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے بعد بھی اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے واسطے مال بچ جاتا ہے جس سے اپنی اور اپنے ماتحتوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی؛ تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔گویا اس کو مستغنی کرنے والی چیز موجود ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مال خرچ کرنے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا، جیب خالی ہو جاتی ہے،لیکن اس کا دل اتنا قوی ہے،اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتنا زیادہ

اعتماد و بھروسہ ہے کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی جب وہ خرچ کرے گا تو بعد میں بھولے سے بھی یہ خیال آنے والا نہیں ہے کہ میں نے خرچ نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا؛ تو اس صورت میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

تو جو صدقہ استغناء کے ساتھ دیا گیا ہو یعنی جو چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کی گئی ہے، بعد میں اس کی طرف حرص باقی نہ رہے؛ وہ بہترین صدقہ ہے۔

''وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ'' جو آدمی مستغنی بننا چاہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دوسروں سے مستغنی بنا دیتے ہیں۔ جب احادیث میں سوال کرنے کی ممانعت آئی ہے تو اب اپنے آپ کو سوال سے بچانے کے لیے کون سی تدبیر اختیار کرے اور استغناء والی صفت کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اسی کو بتایا گیا: ''مَن يَّسْتَعْفِفْ'' یعنی جو اپنے آپ کو بہ تکلف سوال سے بچائے گا۔ دوسری روایت میں ''مَن يَّتَعَفَّفْ'' بھی آیا ہے یعنی ہمت و ارادہ کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچائے گا۔ یعنی ہوسکتا ہے کہ حالات کے پیشِ نظر ایسی نوبت آجائے کہ اس کا نفس یہ کہے کہ لوگوں سے مانگ لو، ایسے حالات میں بھی وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے ہمت سے کام لے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، گویا حالات اور نفس کے تقاضہ کے باوجود بہ تکلف سوال کرنے سے اپنے آپ کو روکتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو صفتِ عفت و استغناء عطا فرما دیتے ہیں۔

اوصافِ کمال حاصل کرنے کا طریقہ

دنیا میں کمال کے جتنے بھی اوصاف ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو محنت اور مجاہدہ سے کام لینا پڑتا ہے، ریاضت کرنی پڑتی ہے، کچھ مشقت اُٹھانی پڑتی ہے؛ تب ہی وہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا

چاہتا ہے، تو اس صفت کو پیدا کرنے کے لیے کچھ مشقت اُٹھانی پڑے گی، انسان کی طبیعت تو اس کو بے صبری پر آمادہ کرے گی، نفس اُبھارے گا، حالات بھی ایسے ہو سکتے ہیں کہ وہ بے صبری کا اظہار کرے، لیکن اس کو چاہیے کہ ہمت سے کام لے کر، بہ تکلف اپنی ذات پر جبر کر کے، نفس پر دباؤ ڈال کر صبر سے کام لے؛ جب ایسا کرتا رہے گا تو دھیرے دھیرے یہ صفت اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح عفت کی صفت کا حال بھی ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اسی کو کہا گیا کہ جو آدمی لوگوں سے اپنے آپ کو مستغنی اور بے پرواہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو صفتِ غنیٰ عطا فرما دیتے ہیں۔ یعنی حالات اور حوادث تو اس کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار کرے، لیکن اگر وہ ہمت سے کام لے کر اور ذرا مجاہدہ و مشقت برداشت کر کے اپنے آپ کو اس سے بچائے گا، تو دھیرے دھیرے صفتِ غنیٰ یعنی اس کے دل کے اندر بے نیازی کی صفت اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیں گے۔ کسی بھی صفت کو حاصل کرنے کے لیے آدمی ارادہ کر لے کہ مجھے اپنے اندر اس صفت کو پیدا کرنا ہے، اس کے بعد ہمت سے کام لے۔ بس! یہ دو کام کرے گا تو پھر ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ وہ اس صفت کو پورے طور پر حاصل کر لے گا۔

دنیوی اعتبار سے بھی جو کمالات ہوا کرتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کوئی بھی آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے کمالات لے کر پیدا نہیں ہوتا، البتہ قدرتی صلاحیتیں اس کے اندر ہوتی ہیں، انہی صلاحیتوں کے اوپر محنت کر کے اگر ان کو اُجاگر کرتا ہے، تو وہ ان صفات اور کمالات کو حاصل کر لیتا ہے، چاہے وہ دنیوی ہوں یا اُخروی ہوں۔

یہاں پر بھی عفت اور غنیٰ حاصل کرنے کا طریقہ بتایا کہ شروع میں آدمی کو

ارادہ وہمت سے کام لے کر اپنی ذات پر کچھ جبر کرنا پڑے گا، بوجھ ڈالنا پڑے گا، ہمت سے کام لینا پڑے گا؛ جب بار بار ایسا کرتا رہے گا تو پھر ایک وقت آئے گا کہ یہ چیز اس کی طبیعت بن جائے گی۔

جیسے بھوک ہم برداشت تو نہیں کر سکتے، لیکن اگر ہم دھیرے دھیرے عادت ڈالیں کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا، دوسرے وقت نہیں کھایا، تیسرے وقت نہیں کھایا؛ تو بھوک برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے گی، اور ایک وقت آئے گا کہ پھر چار پانچ وقت کے بعد بھی آدمی کو بھوک کی تکلیف نہیں ہوتی۔ شروع میں بہت بے چینی ہوتی تھی لیکن جب عادت پڑ گئی تو طبیعت پر کوئی بے چینی نہیں ہے۔ ہر چیز کا یہی حال ہے۔

سوال کرنے والوں کے لیے خاص ہدایت

۵۲۸:- وعن أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَان رضی اللہ تعالٰی عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَا تُلْحِفُوا فِي الْمَسْأَلَةِ، فَوَاللهِ لَا يَسْأَلُنِي أَحَدٌ مِنْكُمْ شَيْئًا، فَتُخْرِجَ لَهُ مَسْأَلَتُهُ مِنِّي شَيْئاً، وَأَنَا لَهُ كَارِهٌ، فَيُبَارَكَ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتُهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سوال کرنے میں اصرار سے کام نہ لو۔ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی آدمی مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے اور مجھ سے کوئی چیز نکلوالے، حالاں کہ میں دینا نہیں چاہتا تھا، تو پھر جو میں دیتا ہوں اس میں اس کو برکت عطا نہیں ہوتی۔

افادات:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لوگ اپنی اپنی حاجتیں لے کر آتے تھے، جیسے: بڑوں کے پاس جاتے ہیں، یا جو لوگ دوسروں کی حاجتیں پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں ان کے پاس بھی لوگ پہنچتے ہیں؛ ایسے لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ہدایت فرمائی کہ اپنی ان حاجتوں کو پورا کروانے کے لیے مانگنے میں اِصرار نہ کیا کرو، کسی سے لپٹ کر نہ مانگو۔ جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس کے سامنے وہ اپنی حاجت پیش کرتے ہیں، تو گویا اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں، جب تک وہ ان کی حاجت کو پورا نہ کرے وہاں تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے، اس کو تنگ کر کے رکھ دیتے ہیں، بہت سی مرتبہ تو وہ آدمی عاجز آ کر اور مجبور ہو کر اس کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ شریف آدمی کے ساتھ جب اصرار کا معاملہ کیا جاتا ہے تو باوجود جی نہ چاہنے کے بھی وہ دے دیتا ہے۔

بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی حاجت مند کی حاجت اور حالت کا جائزہ لے کر خود ہی برضا و رغبت اس کی مانگ کو پورا کرتا ہے؛ تب تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اور وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ اپنی حاجت کی جتنی مقدار بتا رہا ہے، اس کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے، اور وہ امداد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، لیکن یہ اس کے پیچھے پڑ کر زبردستی اس کے پاس سے نکلواتا ہے؛ تو پھر اس میں اس کو برکت عطا نہیں ہوتی۔ گویا جو مال جبراً نکلوایا جاتا ہے وہ مال بغیر کسی فائدہ کے ضائع ہو جاتا ہے، اور وہ آدمی دوبارہ لوگوں سے سوال کرنے لگتا ہے، اس طرح سوال کر کے درحقیقت وہ آدمی اپنے مسئلہ کو بجائے حل کرنے کے اور زیادہ اُلجھا رہا ہے، ضرورت تو اس بات کی تھی کہ وہ صبر سے کام لیتا اور عفت اختیار کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی راستہ کھول دیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی حاجت مند ہو؛ تب بھی اپنی حاجت کا سوال کرنے میں اصرار سے کام نہیں لینا چاہیے۔

سوال نہ کرنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت

۵۲۹:- وعن أبي عبد الرحمٰن عوف بن مالك الأشجعي رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ:

كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تِسْعَةً أَوْ ثَمَانِيَةً أَوْ سَبْعَةً. فَقَالَ: أَلَا تُبَايِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. وَكُنَّا حَدِيْثِيْ عَهْدٍ بِبَيْعَةٍ. فَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. ثُمَّ قَالَ: أَلَا تُبَايِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ. فَبَسَطْنَا أَيْدِيَنَا. وَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ فَعَلَامَ نُبَايِعُكَ؟ قَالَ: عَلٰى أَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، وَتُطِيْعُوا اللّٰهَ (وَأَسَرَّ كَلِمَةً خَفِيْفَةً) وَلَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا. فَلَقَدْ رَأَيْتُ بَعْضَ أُولٰئِكَ النَّفَرِ يَسْقُطُ سَوْطُ أَحَدِهِمْ، فَمَا يَسْأَلُ أَحَدًا يُنَاوِلُهُ إِيَّاهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو عبدالرحمن عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازخود ارشاد فرمایا: تم لوگ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے؟ (عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) ہم نے ابھی تازہ تازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی (یعنی ہمیں بیعت ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرما رہے تھے کہ تم اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتے؟ تو) ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے ہیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتے؟ (جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری مرتبہ فرمایا) تو ہم نے بیعت ہونے کے لیے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے ہیں (ارشاد فرمایئے) آپ کس چیز پر ہم سے بیعت لینا چاہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تم کو بیعت کر رہا ہوں اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کروگے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، پانچوں نمازیں اپنے وقت پر ادا کروگے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کروگے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بات بہت آہستہ ارشاد فرمائی: کسی سے کچھ نہیں مانگو گے۔ حضرت عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے ان میں سے

بعضوں کو دیکھا کہ وہ حضرات اس عہد و پیمان کا اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے، اس پر عمل کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا، اس کا کوڑا نیچے گر جاتا تو وہ کسی سے مانگتا نہیں تھا (کہ میرا کوڑا دے دو) بلکہ خود اُتر کر لیتا تھا (اس لیے کہ یہ بھی کسی سے مانگنا اور سوال کرنا ہوا اور انہوں نے سوال نہ کرنے کا نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر عہد و پیمان کیا تھا۔)

افادات:- بیعت؛ ایک طرح کا عہد و پیمان ہوتا ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کرتا ہے اور جس کے ہاتھ پر بیعت ہو رہا ہے اس کو اپنے اس عہد و پیمان پر گواہ بناتا ہے کہ میں یہ کام کروں گا اور یہ کام نہیں کروں گا۔ سوال کی ممانعت کو بتلانے کے لیے اس روایت کو یہاں لائے ہیں۔

مانگنے کی عادت پر سزا

۵۳۰:- عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن النبی ﷺ قال: لَا تَزَالُ الْمَسْأَلَةُ بِأَحَدِكُمْ حَتّٰى يَلْقَى اللهَ تَعَالٰى وَلَيْسَ فِيْ وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ. (متفق علیه)

((الْمُزْعَةُ)) بضم الميم وإسكان الزاي وبالعين المهملة: الْقِطْعَةُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جس شخص کو مانگنے کی عادت ہو جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت نہ ہوگا۔

اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ

۵۳۱:- وعنه أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ، وَذَكَرَ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ، اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ

الْمُنْفِقَةُ، وَالسُّفْلیٰ هِيَ السَّائِلَةُ. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر تشریف فرما ہونے کی حالت میں اپنی تقریر میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا تذکرہ کیا، اور سوال سے بچنے کا بھی تذکرہ کیا (کہ کسی سے سوال مت کرو۔ اس میں یہ بھی فرمایا) اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والا ہاتھ ہے، اور نیچے والا ہاتھ وہ لوگوں سے سوال کرنے والا ہاتھ ہے۔

اس روایت میں اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ کس کو کہتے ہیں وہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلادیا ہے۔

وہ کیا جمع کررہا ہے؟

۵۳۲:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ سَأَلَ النَّاسَ تَكَثُّرًا فَإِنَّمَا يَسْئَلُ جَمْرًا، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْلِيَسْتَكْثِرْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے مال میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے، تو گویا وہ اپنے لیے انگارے جمع کررہا ہے۔ اب اس کی مرضی کی بات ہے، چاہے کم مانگے، چاہے زیادہ مانگے۔

افادات:- بعض لوگوں کی سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے، گویا انہوں نے سوال کرنے اور مانگنے ہی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے، جیسے آج کل ایک طبقہ ہے جو اسی لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے کہ مانگ کر مال اکٹھا کرے، حالاں کہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ان کے پاس بہت کچھ موجود ہوتا ہے۔

نصاب کی تین قسمیں

دیکھو! کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ نصاب تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک

نصاب تو وہ ہے جس میں آدمی کے اوپر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ قربانی و صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے؛ ایسا آدمی زکوٰۃ کا مال اور واجب صدقات نہیں لے سکتا۔ اس کا نصاب یہ ہے کہ کسی آدمی کے پاس ۸۷ر گرام اور ۴۸۰ ملی گرام سونا، یا ۶۱۲ رگرام اور ۳۵۰ ملی گرام چاندی ہو، یا اسی کے بقدر پیسے ہوں، یا تجارت کا اتنا سامان ہو، اور اس پر کچھ قرض بھی نہ ہو؛ تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ بھی فرض ہے، صدقۃ الفطر بھی واجب ہے، اور قربانی بھی واجب ہے۔ ایسا آدمی کسی سے زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ یہ تو پہلے نمبر کا نصاب ہوا۔

دوسرا نصاب

دوسرے نمبر کا نصاب یہ ہے کہ جس میں آدمی کے اوپر قربانی اور صدقۃ الفطر واجب ہوتا ہے، اور وہ آدمی زکوٰۃ بھی نہیں لے سکتا، لیکن اس کے اوپر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی مثلاً کسی کے پاس سونا چاندی تو نہیں ہے، روپے بھی نہیں ہیں، تجارت کا سامان بھی نہیں ہے، لیکن گھر میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ سامان موجود ہے، جیسا کہ آج کل عام طور پر کچھ زائد چیزیں بطورِ شو کے گھروں میں رکھنے کا مزاج بنا ہوا ہے؛ اسی کو لایعنی کہتے ہیں۔

لایعنی کی ایک اور قسم

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ" آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چھوڑ دے۔ عام طور پر شراحِ حدیث لایعنی کا مطلب بے کار کام اور بے کار بات بتاتے ہیں۔ یعنی جس میں نہ دنیاوی اعتبار سے کوئی فائدہ ہو، نہ آخرت کے اعتبار سے کوئی فائدہ ہو، ایسی بات اور

ایسے کام کو لایعنی کہتے ہیں، لیکن آج کل لایعنی کی ایک اور قسم ''لایعنی اشیاء'' نکلی ہے، مثلاً گھر کے کونہ میں بہت بڑا پوٹ رکھا ہوا ہے۔ پہلے زمانہ میں اس میں پانی بھر کر رکھا جاتا تھا، لیکن آج کل وہ صرف شو کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اور بھی بے شمار چیزیں ایسی ہونے لگی ہیں جو کسی کام کی نہیں ہوا کرتیں، اور ہزاروں روپیہ اس پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر یہی روپیہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا گیا ہوتا، کسی نیکی کے کام میں لگایا گیا ہوتا، صدقۂ جاریہ میں استعمال کیا گیا ہوتا؛ تو کتنا اجر وثواب ملتا۔ اس وقت ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں محض دکھلاوے کے لیے ہم نے اس طرح کی کچھ چیزیں اپنے ذہن سے گھڑ لی ہیں کہ ہمارے گھر میں شو کا سامان ہوگا تب ہی یوں سمجھا جائے گا کہ نشاط سوسائٹی (اُس جگہ کا نام جہاں حضرت کی مجلس ہوا کرتی ہے) میں مکان بنا کر رہنے کے قابل ہے، ورنہ یہاں رہنے کے قابل نہیں۔ تو بھائیو! ہم نے ایسا جو مزاج بنایا ہے شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ ہم اس کو حرام تو نہیں کہیں گے لیکن اس کو پسندیدہ بھی قرار نہیں دیا گیا ہے، یہ بے کار چیزیں ہیں، جن سے کوئی حاصل نہیں ہے۔

ضرورت کی چیز کیا ہے؟

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کے پاس ضرورت سے زائد چیز ہو۔ اور ضرورت کی چیز کیا ہے؟ دو چار پتیلیاں جو کھانا پکانے کے کام آتی ہیں اور چند پلیٹ اور پیالے جو کھانا کھانے کے کام آتے ہیں۔ یہ چیزیں بھی ہمارے حساب سے ہیں، ورنہ آپ کو یاد ہوگا، میں نے پہلے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ بیان کیا تھا کہ ان کے پاس مٹی کا صرف ایک پیالہ تھا، وہی کھانا کھانے کے لیے اور وہی پانی پینے کے لیے تھا۔ تو استعمال کی کچھ چیزیں، پہننے کے کچھ لباس، اور کچھ ضروری چیزیں بستر وغیرہ ہوں۔ یہ

ضرورت کی چیزیں ہیں۔

چوتھا بستر شیطان کا

حدیثِ پاک میں تو یہاں تک آتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس تین بستر ہونے چاہئیں، ایک اپنا، دوسرا بیوی کا، تیسرا مہمان کا۔ اگر چوتھا بستر ہے تو وہ شیطان کا ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب اللباس) اس سے نبی کریم ﷺ ہمیں یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جو چیزیں بھی زائد ہیں وہ سب شیطان کے نام پر ہیں، شیطان اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ایسی زائد چیزوں کے لیے عام طور پر حدیثِ پاک میں شیطان ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شیطان کے لیے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے حق میں اجر وثواب کی نہیں ہے، بلکہ اس کا مال بے کار ضائع ہو رہا ہے۔ بہر حال! ضرورت سے زائد تمام چیزیں اس میں داخل ہیں۔

جس کے یہاں ٹی وی ہو؛ اس کو زکوٰۃ دینا

تو اگر ضرورت سے زائد چیزوں کی قیمت ۶۱۲ر گرام اور ۳۵۰ر ملی گرام چاندی کے برابر ہو جاتی ہے، تو اس کے اوپر قربانی واجب ہے، اور صدقۃ الفطر بھی واجب ہے، ایسا آدمی زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اب مثلاً کسی کے گھر میں ٹی وی (TV) ہے تو سب جانتے ہیں کہ ٹی وی (TV) ضروریاتِ زندگی میں سے نہیں ہے۔ اگر اس ٹی وی (TV) کی قیمت چاندی کے نصاب جتنی ہے؛ تو ایسے آدمی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، سیدھی سادی بات ہے۔ اگر ایسے آدمی کو زکوٰۃ دو گے تو ادا نہیں ہوگی۔ اس طرح کی اور بھی زائد چیزوں کا یہی حکم ہے۔

اس لیے زکوٰۃ دینے والے کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پہلے دیکھ لے کہ جس کو

زکوٰۃ دے رہا ہے وہ حقدار بھی ہے یا نہیں؟ البتہ اگر وہ مقروض ہے اور اس پر اتنا زیادہ قرضہ ہے کہ اس کو ادا کرنے بعد اس کے پاس جو سامان رہتا ہے اس کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی، مثلاً دس لاکھ کا مقروض ہے، تو اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

جس پر صدقۂ فطر واجب؛ اس پر قربانی واجب

دیکھو! ہمارے معاشرہ میں لوگوں نے بہت سے مسئلے اپنے ذہن سے بنا رکھے ہیں۔ بہت سوں کے پاس اس نوع کا نصاب ہوتا ہے اور ان پر قربانی واجب ہوتی ہے، وہی لوگ رمضان کے مہینہ میں صدقۃ الفطر دیتے ہیں، لیکن قربانی کے زمانہ میں قربانی نہیں کرتے۔ ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ صدقۃ الفطر واجب ہے، پھر اگر انہی سے کہیں کہ قربانی بھی واجب ہے، تو کہیں گے کہ قربانی واجب نہیں ہے۔ یہ اپنے طور پر ہی فتویٰ دے رہے ہیں، حالاں کہ کتابوں میں صدقۃ الفطر اور قربانی میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، جس پر صدقۃ الفطر واجب ہے، اس پر قربانی بھی واجب ہے، اور جس پر صدقۃ الفطر واجب نہیں، اس پر قربانی بھی واجب نہیں، لیکن لوگوں نے دونوں کو الگ کہاں سے کیا، یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر! یہ دوسرا نصاب ہے۔

تیسرا نصاب

تیسرا نصاب کتابوں میں لکھا ہے، اور دراصل مَیں اسی کو بتلانا چاہتا تھا کہ کسی کو آج اپنی اور اپنے ماتحتوں؛ بیوی، بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کھانے پینے کا سامان میسر ہے؛ تو یہ آدمی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا، کسی سے سوال نہیں کر سکتا، ایسے آدمی کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔ اس کو حرمتِ سوال (سوال کے حرام ہونے) کا نصاب کہتے ہیں۔ علماء نے کتبِ فقہ میں باقاعدہ تیسری قسم کا یہ نصاب لکھا ہے۔

یہ پیسے نہیں، انگارے ہیں

اب اگر کوئی کہے کہ اس کے پاس آئندہ کل کے لیے کچھ نہیں ہے؛ تب بھی نہیں مانگ سکتا؟ تو اس سے کہیں گے کہ بھائی! جب کل آئے اور اس وقت اگر کچھ نہ ہو تو مانگے، لیکن آج سے کیوں مانگتا ہے؟ جیسے بھیک مانگنے والے کرتے ہیں۔ آج کل کے جو بھیک منگے ہیں وہ سب کیا بھوکے مر رہے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ آپ تو اخباروں میں پڑھتے ہی ہوں گے کہ بھیک منگوں کی موت آتی ہے تو وہ ہزاروں لاکھوں روپے اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے جو لوگ سوال کرتے ہیں وہ صرف اپنے مال کو بڑھانے کے لیے سوال کرتے ہیں، ان کا سوال فقط مال کے اضافہ کے لیے ہوتا ہے۔

اور بعض مانگنے والے ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر سڑکوں کے اوپر کھڑے رہ کر بھیک نہیں مانگتے، لیکن انھوں نے بھی اپنی عادت بنالی ہوتی ہے، ان کی ضرورت کا ان کے پاس موجود ہوتا ہے، پھر بھی لوگوں سے مانگتے رہتے ہیں؛ وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی لوگوں سے سوال کرے تا کہ اس کے مال میں اضافہ ہو، ایسا آدمی گویا اپنے لیے انگارے جمع کر رہا ہے، اب اس کی مرضی کی بات ہے، چاہے کم مانگے، چاہے زیادہ مانگے۔ اس طرح سوال کر کے اور مانگ کر جتنے بھی پیسے آئیں گے، درحقیقت وہ پیسے نہیں ہیں، بلکہ جہنم کے انگارے ہیں۔ اس لیے سوال سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے کہ سوال کرنا حرام ہے۔

سوال کرنا چہرہ پر خراش ہے

۵۳۳:- وَعَنْ سَمُرَةَ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّ الْمَسْأَلَةَ كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ، إِلَّا أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَانًا أَوْ فِيْ أَمْرٍ لَا بُدَّ

مِنْهُ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح) **(الْكَدُّ: الْخَدْشُ وَنَحْوُهُ)**

ترجمہ:- حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سوال کرنا آدمی کے چہرہ پر خراش ہے جس کے ذریعہ سے آدمی اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے، مگر یہ کہ آدمی کسی حاکم سے سوال کرے، یا کسی ایسی چیز کے لیے سوال کرتا ہے کہ جس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔

افادات:- ناخن جب چہرے پر مارے جاتے ہیں تو اس کی وجہ سے چہرے پر خراش اور زخم پڑ جاتے ہیں، ایسے آدمی کا چہرہ بھدّا اور بدصورت معلوم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگوں سے سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے چہرے کو زخمی کرنا۔ اور ایسا آدمی قیامت کے روز ایسی حالت میں اُٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔

کن صورتوں میں سوال کی اجازت ہے؟

اور چوں کہ حاکموں کے ساتھ لوگوں کی حاجتیں متعلق کردی گئی ہیں اس لیے حاکم کے سامنے اگر کوئی آدمی سوال کرتا ہے تو اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے۔

یا کسی ایسی چیز کے لیے سوال کرتا ہے کہ جس کے بغیر چارۂ کار نہیں، مثلاً کوئی آدمی مقروض ہوگیا، قرض کا دباؤ اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ اس کی ادائیگی کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے، اور قرض خواہوں کی طرف سے شدید تقاضا ہے، ایسی حالت میں اگر وہ اس کی ادائیگی کے لیے کسی سے مدد مانگے اور سوال کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یا روزمرّہ کی ضرورتوں کے لیے تو پیسے موجود ہیں، لیکن کوئی ایمرجنسی صورت پیش آگئی جیسے: اچانک ایکسیڈنٹ ہوگیا اور بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اب باپ کے پاس

اس کا علاج کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں، تو مجبوراً کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔

فاقہ کہاں پیش کرنا چاہیے؟

۵۳۴:-وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ أَصَابَتْہُ فَاقَةٌ فأَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتُهُ. وَمَنْ أَنْزَلَهَا بِاللّٰهِ، فَيُوْشِكُ اللّٰهُ لَهُ بِرِزْقٍ عَاجِلٍ أَوْ آجِلٍ. (رواہ ابوداودوالترمذی، وقال: حدیث حسن)

(يُوشِكُ) بكسر الشين: أي يُسْرِعُ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کو فاقہ پیش آیا (یعنی مال نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، اور اس کو ایک دو وقت بھوکا رہنا پڑا) پھر اس نے اپنے اس فاقہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا (یعنی لوگوں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ میں تو بھوکے مر رہا ہوں، مجھے کچھ دو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ) اس کا فاقہ بند ہونے والا نہیں ہے (مانگ کر وقتی طور پر تو ضرورت پوری ہو جائے گی، لیکن وہی ضرورت پھر دوبارہ پیدا ہوگی اور وہ ضرورت مند ہی رہے گا) اور جس نے اس فاقہ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ جلدی ہی اس کے فاقہ کو دور کریں گے، یا تو فوری روزی کے ذریعہ، یا بعد میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی اسباب مہیا کر دے گے (اور اس کی حاجت پوری ہو جائے گی۔)

نہ مانگنے پر جنت کی ضمانت

۵۳۵:-عن ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ تَكَفَّلَ لِيْ أَنْ لَا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئاً، وَأَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ؟ فَقُلْتُ أَنَا. فَكَانَ لَا يَسْأَلُ أَحَداً

شَیْئًا. (رواہ أبو داود بإسناد صحیح)

ترجمہ:- حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو مجھے اس بات کی گارنٹی دے کہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا، تو میں اس کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو اس بات کی گارنٹی اور ضمانت دیتا ہوں کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی سے کوئی چیز مانگتے نہیں تھے (یہاں تک کہ کوڑا بھی زمین پر گرجاتا تو مانگتے نہیں تھے، بلکہ خود اتر کر لے لیا کرتے تھے۔)

سوال کرنا تین آدمیوں کے لیے جائز ہے

۵۳۶:- وعن أَبِي بِشْرٍ قَبِيصَةَ بنِ المُخَارِقِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: تَحَمَّلْتُ حَمَالَةً، فَأَتَيْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أَسْأَلُهُ فِيهَا، فَقَالَ: أَقِمْ حَتَّى تَأْتِيَنَا الصَّدَقَةُ فَنَأْمُرَ لَكَ بِهَا. ثُمَّ قَالَ: يَاقَبِيصةُ! إنَّ المَسْأَلَةَ لاَ تَحِلُّ إلاَّ لأَحدِ ثلاثةٍ: رَجُلٌ تحمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قواماً مِنْ عَيش - أَوْ قَالَ: سِدَاداً مِنْ عَيْشٍ - وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُولَ ثَلاَثَةٌ مِنْ ذَوِي الحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلاناً فَاقَةٌ. فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يصيب قواماً من عيش - أَوْ قَالَ: سداداً من عيشٍ - فما سِوَاهُنَّ مِنَ المسألَةِ يَاقَبِيصَةُ سُحْتٌ، يَأْكُلُهَا صَاحِبُهَا سُحتاً. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت قبیصہ بن مُخارق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بوجھ اپنے سر لیا تھا، اس سلسلہ میں کچھ مدد حاصل کرنے کے لیے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انتظار کرو، ہمارے پاس کہیں سے کوئی مال آئے گا تو ہم تمہیں دیں گے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سوال کرنا (چندہ کرنا) جائز نہیں ہے، مگر تین آدمیوں کے لیے۔

ایک تو وہ جس نے کوئی بوجھ اپنے سر لیا ہو، اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ جتنا بوجھ اپنے سر لیا ہے وہ پورا کر لے، پھر سوال سے رک جائے۔ دوسرا وہ آدمی جس کو اچانک کوئی مصیبت پیش آئی جس نے اس کا سارا مال ہلاک کر دیا، ایسے آدمی کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ اور تیسرا وہ آدمی جس کو فاقہ لاحق ہو اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمیوں کے سامنے اس کے حالات ہوں جو اس کے متعلق گواہی دیں کہ واقعتاً اس کو فاقہ ہے، تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے، لیکن اتنا ہی جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یہ ارشاد فرمانے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: اے قبیصہ! اس کے علاوہ جو سوال کرتا ہے وہ سب حرام ہے، اور ایسا آدمی اپنے پیٹ میں حرام ڈال رہا ہے۔

افادات:- ''حَمَالَةٌ'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی ایسی صورت پیش آتی ہے کہ دو گروہ ہوں یا دو آدمیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا، ان کا جھگڑا ختم کرانے کے لیے کوئی آدمی صلح صفائی کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش کے دوران ضرورت پیش آئی کہ وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لے، مثلاً ایک آدمی کے دوسرے کے اوپر دو لاکھ نکلتے ہیں، وہ مانگنے گیا تو اس نے کہا کہ میں نہیں دوں گا، اور دونوں میں لڑائی ہوئی، اِس کے بھی رشتہ دار آئے، اُس کے بھی رشتہ دار آئے، اور لڑائی برابر چھڑ گئی، مقدمہ بازی ہوئی، کوئی بھی اپنا مقدمہ ہٹانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دو چار آدمی دونوں پارٹیوں کے پاس گئے کہ بھائیو! آپ کا جھگڑا کس چیز کا ہے؟ بتایا گیا: ایسی بات ہے کہ یہ ہمارے پیسے نہیں دیتے۔ دوسرے فریق سے پوچھا: تمہارے ذمہ ہیں یا نہیں؟ انہوں نے اقرار کیا کہ: ہاں! ہمارے ذمہ ہیں لیکن اس وقت دینے کے لیے ہمارے پاس نہیں ہیں اور ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا، اس لیے ہم نہیں دیں گے۔ اب بیچ بچاؤ کرنے والا یوں کہہ دے کہ: اچھا بھائی! ایسا کرو کہ تم کچھ چھوڑ دو، میں پچاس ہزار اپنی

طرف سے تم کو دے دوں گا، لیکن یہ لڑائی ختم کرو۔ کبھی ایسی نوبت آتی ہے کہ جھگڑوں کو ختم کرانے، اور صلح صفائی کے واسطے آدمی کوئی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے؛ اس قسم کی ذمہ داری کو حدیث میں ''حَمَالَۃٌ'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے بشرطیکہ آدمی نباہ سکے۔ اور جو آدمی نبھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو ایسی چیزوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ نیکی کا ہر کام استطاعت پر موقوف ہے جیسے: رات بھر جاگنے کی عادت اور طاقت نہیں، پھر بھی رات بھر جاگو گے تو دوسرے دن بیمار ہو جاؤ گے، ایسے آدمی سے یہی کہیں گے کہ رات بھر جاگنا تمہارا کام نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کا بوجھ اپنے سر لینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ جو کر سکتا ہو اسی کے لیے نیکی ہے۔

اور جو لوگ اس قسم کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں وہ احباب کے حلقے میں بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ ایسا جھگڑا ہوا تھا، میں نے پچاس ہزار کی ذمہ داری لے لی ہے، اب اس میں کون میری مدد کرے گا؟ اپنے دوسرے ساتھیوں سے ایسا مطالبہ کیا جاتا ہے، اس قسم کے سوال کے لیے عام ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا، بلکہ کچھ خصوصی لوگوں کے سامنے بات پیش کی جاتی ہے؛ تو ایسی اپیل کرنے کی بھی اجازت ہے۔

اسی طرح مدرسہ والے اور مہتمم صاحب بچوں کو مدرسہ میں داخلہ دیتے ہیں، اور بچوں کا بوجھ اپنے سر پر لے لیتے ہیں کہ ان کا کھانا پینا رہائش کا سارا انتظام ہم کریں گے، اور اسی بوجھ کو پورا کرنے کے لیے وہ چندہ کے لیے نکلتے ہیں؛ وہ بھی ''تحمَّلَ حَمَالَۃً'' میں داخل ہے۔ یا رفاہِ عام کے کام کرنے والے ذمہ دار حضرات درخواست کرتے ہیں، مثلاً: کسی ہسپتال، یا کسی ادارے کے ذمہ دار لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے چندہ کی اپیل کرتے ہیں؛ وہ بھی ''تحمَّلَ حَمَالَۃً'' میں داخل ہیں۔

دوسرا وہ آدمی جس کو اچانک کوئی ایسی مصیبت پیش آئی جس نے اس کا سارا

مال ہلاک کر دیا؛ ایسے آدمی کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ مثلاً: قومی فساد ہوا، بڑا مالدار آدمی تھا، تاجر تھا، لیکن فسادیوں نے سب کچھ لوٹ لیا، کاروبار کو آگ لگا دی، اور وہ بیچارہ فٹ پاتھ پر آ گیا، اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔

یا سیلاب آیا اور اس میں اس کا سب کچھ بہہ گیا۔ یا آگ لگ گئی، اس میں سب جل کر راکھ ہو گیا اور کچھ بھی نہیں بچا؛ تو ایسا آدمی بھی اتنا سوال کر سکتا ہے کہ جس سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اور جس سے معیشت اور گزران ٹھیک ہو جائے۔

اور تیسرا وہ آدمی جس کو فاقہ لاحق ہو، اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمیوں کے سامنے اس کے حالات ہوں اور وہ اس کے متعلق گواہی دیتے ہوں کہ واقعتاً اس کو فاقے ہیں؛ تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے۔ لیکن اتنا ہی جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ ویسے فاقہ کا دعویٰ تو ہر آدمی کر سکتا ہے کہ میرے فاقے چل رہے ہیں، جو بھکاری ہوتے ہیں وہ بھی اپنے فاقے ہی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

حقیقی مسکین کی پہچان

۵۳۷:- وعن أَبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لَيْسَ المسكينُ الَّذِي يَطُوفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ، وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، وَلٰكِنَّ المِسكينَ الَّذِي لاَ يَجِدُ غِنىً يُغْنِيهِ، وَلاَ يُفْطَنُ لَهُ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ، وَلاَ يَقُومُ فَيَسْأَلَ النَّاسَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے پاس سوال کے لیے چکر لگاتا رہے اور ایک دو لقمے یا ایک دو

کھجوریں اس کو لوگوں کے دروازوں سے آگے بڑھا دیں، بلکہ حقیقت میں ضرورت منداور مسکین وہ آدمی ہے جس کے پاس اتنا نہیں ہے جس سے وہ اپنی ضرورت پوری کر سکے، اور (ساتھ ہی) اس نے اپنی حالت بھی ایسی نہیں بنائی ہے کہ کسی کو پتہ چلے کہ وہ اس کی ضرورت پوری کر دے، اور کہیں کھڑے رہ کر لوگوں سے سوال بھی نہیں کرتا۔

افادات:- بھیک مانگنے والے کو آپ دو پیسے دیدیں تو وہ آگے چل دیتا ہے، روٹی کا ایک ٹکرا دے دو تو آپ کا پیچھا چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا، ایسا آدمی مسکین اور ضرورت مند نہیں ہے، وہ تو مانگ کر اپنی ضرورتیں پوری کر ہی رہا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ حقیقی معنیٰ میں مسکین (جس کے اوپر صدقہ کرنے کی قرآنِ پاک میں تاکید آئی ہے) کہلانے کا حقدار وہی آدمی ہے جس کی ظاہری حالت سے بالکل پتہ نہ چلے کہ وہ مستحق بھی ہے۔ اس لیے مال خرچ کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ جس شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقیقی معنوں میں مسکین کہا ہے اس کا پتہ چلا کر اس تک مال کو پہنچائیں۔

خرچ کرنے والوں کا فریضہ

اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب وہ مانگتا نہیں ہے، اور اس نے ظاہری طور پر اپنی حالت بھی ایسی نہیں بنائی ہے جس سے اندازہ ہو؛ تو ایسے آدمی کا پتہ چلانا کیسے ممکن ہے؟ اگر وہ سوال کرے تب تو پتہ بھی چلے کہ وہ حق دار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے وسائل اور ذرائع سے ایسے لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں اور معلوم کریں، اور اپنے مال کو صحیح ٹھکانے پر پہنچانے کے لیے اُن تک صدقہ پہنچانے کی کوشش کریں، یہ مال خرچ کرنے والوں کا فرض اور ذمہ داری ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو زیادہ ثواب کے حقدار ہوں گے۔ اسلاف کے حالات جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اس کا نہایت اہتمام کیا کرتے تھے۔

اِدھر بھی توجہ دیں

آج کل تو صدقہ کہاں کرنا چاہیے اور اس کا زیادہ حقدار اور صحیح مصرف کون ہے اس کو معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ رمضان المبارک میں بہت سے لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں تو ان کے دروازہ پر بھیک مانگنے والے جمع ہو جاتے ہیں، وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ مال موجود ہے پھر بھی وہ لوگ انہیں کو زکوٰۃ کا مال دیدیتے ہیں، حالاں کہ اپنے ہی محلے، بستی اور علاقے میں بہت سارے ضرورت مند لوگ فاقوں میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں، وہ محتاج اور مقروض ہیں، لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ صدقہ کرنے والوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اپنے وسائل استعمال کر کے حقیقی ضرورت مندوں کے بارے میں آگاہی حاصل کریں اور ان پر خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا اہتمام کریں۔

اللہ تعالیٰ سب کو توفیق واہتمام نصیب فرمائے۔

دعا

اے اللہ! قناعت اور سوال سے بچنے کی صفت ہمیں نصیب فرما، اے اللہ! تیرے دئے ہوئے پر راضی رہنے کا وصف ہمیں عطا فرما۔ اے اللہ! بے صبری، جزع فزع اور طمع وحرص سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ دنیا اور مال وجاہ کی محبت سے ہمارے دلوں کو پاک اور صاف فرما۔ ہماری ضروریات کی خزانۂ غیب سے کفالت فرما۔ اے اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن اوصاف وکمالات کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے حصول

کی ترغیب دی ہے، وہ تمام اوصاف وکمالات محض اپنے فضل سے بلا استحقاق ہمیں نصیب فرما۔ اور وہ تمام برائیاں جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اے اللہ! محض اپنے فضل سے ان سے بچنے کا اہتمام نصیب فرما، اور محض اپنے فضل سے ان سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری حفاظت فرما۔ ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ قید وبند میں محبوسین کو رہائی نصیب فرما، مقدمات میں ماخوذوں کو بری فرما۔ اے اللہ! جو جس مصیبت میں گرفتار ہے اس کو اس سے نجات عطا فرما۔ اے اللہ! پورے عالم میں جہاں کہیں بھی مسلمان آزمائش، پریشانیوں اور مصائب کا شکار ہیں ان کو عافیت نصیب فرما۔ اے اللہ! اسبابِ لعنت وغضب سے اُن کی پوری پوری حفاظت فرما کر اسبابِ رحمت ومغفرت اختیار کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔ حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنی بھی خیر وبھلائی تجھ سے مانگی؛ وہ ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور جن شرور وبرائیوں سے پناہ چاہی، ان سے حفاظت فرما۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التوّاب الرحيم ۔ وصلى الله تعالىٰ علىٰ سيدنا ومولانا محمد وعلىٰ اٰله واصحابه أجمعين، برحمتك يا ارحم الراحمين۔

جواز الاخذ من غیر مسألة ولا تطلع الیه

بغیر سوال اور اشرافِ نفس کے کوئی چیز ملے، اس کو لینا

۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۷/جون ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ، وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡكَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:

باب کا عنوان

پہلے ایک عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ملے اس پر آدمی قناعت اختیار کرے اور اپنے آپ کو بلا وجہ سوال سے بچانے کا اہتمام کرے۔ سوال کی جو مذمت اور برائی احادیث میں آئی ہے، وہ بیان ہو چکی۔ اب اسی مناسبت سے ایک اور باب قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز بغیر سوال کے، یا بغیر کسی تدبیر کے آجائے۔ نہ تو اس نے کوئی مطالبہ کیا، نہ اس کی طرف کوئی لالچ رکھی، اس کے دل میں اس کا کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بھیج دی؛ تو پھر اس کو لینا چاہیے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں روایت لائے ہیں۔

بغیر اشراف وسوال کے کچھ ملے تو؟

۵۳۸:- عن سالم بن عبد اللہ بن عمر، عن أبیہ عبد اللہ بن عمر، عن عمر رضی اللہ عنہم قَالَ: کَانَ رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یُعْطِینِی العَطَاءَ، فَأَقُولُ: أعطِہِ مَنْ ھُوَ أَفْقَرُ إِلَیْہِ مِنِّی. فَقَالَ: خُذْہُ، إِذَا جَاءَكَ مِنْ ھَذَا المَالِ شَیْءٌ وَأَنْتَ غَیْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ، فَخُذْہُ فَتَمَوَّلْہُ۔ فَإِنْ شِئْتَ کُلْہُ، وَإِنْ شِئْتَ تَصَدَّقْ بِہِ، وَمَا لَا، فَلَا تُتْبِعْہُ

نَفْسَكَ. قَالَ سَالِمٌ: فَكَانَ عَبْدُ اللهِ لَا يَسْأَلُ أَحَداً شَيْئاً ، وَلَا يَرُدُّ شَيْئاً أُعْطِيَه.

ترجمہ:- حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی مجھے کوئی بخشش یا عطیہ عنایت فرماتے، تو مَیں عرض کرتا: اے اللہ کے رسول! آپ کی اس بخشش اور عطیہ کا جو آدمی مجھ سے زیادہ حاجت مند ہے آپ اس کو عنایت فرمائیے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے: مَیں جو دے رہا ہوں وہ لے لو (پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہدایت فرمائی کہ دیکھو!) مال کے قبیل سے کوئی چیز اگر تمہارے پاس آئے، اور اس چیز کے متعلق تم نے اپنے دل میں کوئی تمنا بھی نہیں کی تھی، اور نہ ہی زبان سے سوال کیا تھا؛ تو اس کو لے لو اور مالک بن جاؤ، پھر چاہو تو صدقہ کر دو۔ اور اگر زبانی یا دلی طلب کے بغیر کوئی چیز نہ ملے تو پھر اپنے آپ کو اس کے پیچھے مت تھکاؤ۔ حضرت سالم فرماتے ہیں (چوں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بہت زیادہ متبعِ سنت تھے، اس لیے) ان کا معمول یہ تھا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کرتے تھے اگر کوئی چیز کسی کی طرف سے بغیر سوال کے دی جاتی تو (اسی حدیث پر عمل کرنے کی غرض سے) اس کو رد بھی نہیں فرماتے تھے۔

افادات:- چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قناعت کی فضیلت سن رکھی تھی، اور یہ بات بھی ان کے علم میں تھی کہ آدمی کو مال کی حرص نہیں کرنی چاہیے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا فرمانے پر وہ یہ سمجھ کر کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میری ضرورت کے لیے کافی ہے، آپ جو مجھے عطا فرما رہے ہیں اس کے حقدار میرے مقابلہ میں دوسرے ہیں؛ لہٰذا وہ عرض کرتے کہ یہ چیز آپ دوسروں کو عنایت فرمائیے۔ یہ عرض کر کے گویا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بخشش اور عطیہ کو قبول کرنے سے معذرت کرتے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرمایا کہ جو مَیں دے رہا ہوں وہ لے لو۔

بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی کو دیکھ کر اپنے دل میں سوچتا ہے کہ وہ مجھے فلاں چیز دیدے تو اچھا ہے۔ یعنی زبان سے تو اظہار نہیں کیا لیکن دل میں یہ جذبہ موجود ہے کہ فلاں آدمی مجھے بخشش اور ہدیہ کے طور پر کچھ دے؛ اسی کو اشراف کہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ آپ نے نہ تو زبان سے سوال کیا، اور نہ دل میں ایسا کوئی خیال گزرا، اور وہ چیز تمہیں مل رہی ہے، تو اب تم اس چیز کو لے لو، اس کے مالک بن جاؤ۔ اس کے بعد اگر تمہیں ضرورت ہے تو اپنے استعمال میں لاؤ، اور اگر تمہیں ضرورت نہیں ہے تو کسی دوسرے کو دیدو، لیکن اس چیز کو واپس مت کرو۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں لگائی ہیں، ایک یہ کہ زبان سے سوال نہ کیا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ دل میں بھی خواہش اور طلب پیدا نہ ہوئی ہو۔ دلی اور زبانی طلب کے بغیر اگر کوئی چیز میسر آجائے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے۔

یہ اشراف نہیں ہے

اب دلی طلب کے سلسلہ میں ایک تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی دل میں یہ سوچتا ہے کہ فلاں آدمی مجھے ہدیہ کرے، اور اس کی طرف سے نہ ملنے پر دل میں رنج وملال بھی ہوتا ہے، اگر ایسی صورت ہے اور پھر کوئی آدمی کچھ دے رہا ہے؛ تو لینا جائز نہیں ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی عادت ہی ہے کہ آپ اس کے یہاں جاتے ہیں، یا آپ کا جب اس سے ملنا ہوتا ہے، تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش کرتا ہے، اس کی اُسی عادت کی وجہ سے آپ کے دل میں خیال آیا کہ یہ مجھے کوئی چیز دے گا، تو اس کے قبول کرنے کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ نقل فرماتے تھے کہ وہ پنجاب کے کسی شہر میں تشریف لے جایا کرتے تھے، وہاں کے نواب صاحب کے وزیر بھی عالم

تھے، اور وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دیا کرتے تھے اور یہ حضرات تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں جاتے وقت حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: اچھا! ایک بات بتلاؤ، ہم وزیر صاحب کے یہاں جاتے ہیں اور ان کا معمول ہے کہ جب ہم جاتے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دل میں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ کچھ دیں گے؛ تو یہ اشراف تو نہیں ہے؟ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا! آپ یہ بتاؤ کہ اگر وہ نہ دیں تو دل میں کوئی رنج وملال پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا: نہیں! بس ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عادت ہے تو وہ دیں گے، باقی اگر کچھ نہ دیں تو دل میں ذرّہ برابر بھی ناراضگی اور ملال نہیں ہوتا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر تو یہ اشراف میں داخل نہیں ہے۔

ایک اہم سبق

دیکھو! حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ کے درجہ میں ہیں لیکن یہ حضرات اپنے نفس کے معاملہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہیں کرتے تھے، جہاں اپنی ذات کا معاملہ ہوتا وہاں دوسروں سے پوچھا کرتے تھے، اس لیے کہ نفس اپنے لیے تو اچھی شکل ہی گھڑ لیا کرتا ہے، اپنے فعل کو تو اچھے محمل پر ہی محمول کیا کرتا ہے، اس لیے اپنے ذاتی معاملہ میں دوسروں سے پوچھا جائے۔

سلیقہ مند شاگرد کی ذکاوت...... واقعہ

اور اشراف ہی کے سلسلہ میں ایک واقعہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسلام کے نظامِ تعلیم وتربیت'' میں نقل کیا ہے۔ ایک بڑے عالم تھے جو درس دے رہے تھے، ان کے اوپر فاقہ کی حالت گزر رہی تھی، ان کے چہرہ اور آواز سے

ظاہر ہورہا تھا کہ کئی وقت سے فاقہ ہے۔ اگر کم مدت کا فاقہ ہوتو اس پر قابو بھی پایا جاسکتا ہے۔ خیر! ان کے پاس پڑھنے والوں میں ایک رئیس بھی تھے، انہوں نے جب استاذ کی یہ کیفیت دیکھی تو کسی بہانہ سے اجازت لے کر گھر گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد ایک خوان لے کر آئے جس میں کھانے پینے کی مختلف اشیاء تھیں اور استاذ کی خدمت میں پیش کیا۔ اب کئی وقت کا فاقہ تھا لیکن جب یہ لائے تو استاذ صاحب نے کہا: دیکھو! اس کا لینا میرے لیے جائز نہیں ہے اس لیے میں قبول نہیں کرسکتا، کیوں کہ جب تم مجھ سے اجازت لے کر یہاں سے اُٹھے، اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میرے واسطے کچھ لینے جارہے ہو۔ چوں کہ میرے دل میں اس کی طرف رغبت پیدا ہوئی تھی اور آپ لے کر آئے ہیں؛ تو یہ اشراف ہے؛ اس لیے میرے لیے اس کا قبول کرنا جائز نہیں۔ وہ شاگرد بھی سمجھدار تھے، جب استاذ نے منع کیا تو پورا خوان لے کر فوراً چلے گئے، استاذ کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، تھوڑی دیر کے بعد پھر لے کر حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! اب تو دل میں خیال نہیں رہا تھا؟ استاذ نے کہا: ٹھیک ہے اب نہیں رہا تھا تو عرض کیا: اب تو قبول فرمالیجئے۔ دیکھئے! ''محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھادے گی'' اسی کو کہتے ہیں۔

الحث على الأكل من عمل يده
والتعفف به عن السؤال
والتعرض للأعطاء

کمانے کے لیے محنت کرنے
اور
سوال وسوالی جیسی صورت بنانے
سے بچنے کی ترغیب

۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۷/جون ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

روزی تلاش کرنے کی ترغیب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے: اپنی روزی کے لیے اپنے ہاتھ سے محنت کرنے، دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچانے، اور سوالی کی سی حالت بنانے سے بچنے کی ترغیب۔

سوال کی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ کہ آدمی زبان سے کوئی چیز مانگے کہ مجھے دو۔ اور دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ زبان سے تو اظہار نہیں کرتا لیکن اپنی حالت ایسی ظاہر کرتا ہے جس سے دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کو کچھ دینا چاہیے، تو ان دونوں کی ممانعت ہے۔

ایک آیت لائے ہیں: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ جب نمازِ جمعہ پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی روزی تلاش کرو۔ چوں کہ اس آیت میں باری تعالیٰ نے روزی تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر ایک کو یہ بات کہی جا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کی اپنے ہاتھ کی محنت کی کمائی زیادہ پسندیدہ ہے۔

خود کام کرنا بہتر ہے

۵۳۹:- وعن أبي عبد الله الزبير بن العوّام رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم:

لأَنْ يَأخُذَ أحَدُكُمْ أحبُلَهُ ثُمَّ يَأتِيَ الجَبَلَ، فَيَأْتِيَ بحُزمَةٍ مِنْ حَطب عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبِيعَهَا، فَيكُفّ اللهُ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أنْ يَسْألَ النَّاسَ، أعْطَوْهُ أوْ مَنَعُوهُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنی رسیاں اُٹھائے (تاکہ لکڑیاں چن کر جمع کرے تو ان کو باندھنے کے کام آئے) اور پہاڑ پر جاکر لکڑیوں کا گٹھر اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آئے پھر بازار میں فروخت کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو دوسروں کے سامنے سوال کی بے عزتی سے بچائے؛ یہ اس بات سے بہتر ہے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے، پھر وہ چاہے تو دے، چاہے تو منع کردے۔

۵۴۰:- **وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لأَنْ يَحْتَطِبَ أحَدُكُمْ حُزْمَةً عَلَى ظَهْرِهِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أنْ يَسْألَ أحداً، فَيُعْطِيَهُ أوْ يَمْنَعَهُ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر لے کر آئے وہ اس کے لیے زیادہ مناسب ہے اس بات سے کہ کسی سے سوال کرے، پھر وہ چاہے تو دے، چاہے تو نہ دے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جنگل میں جاکر لکڑیاں چن کر لاکر بازار میں فروخت کرنا اور اس طرح دوسروں کے سامنے سوال کی بے عزتی سے بچنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ پہلے بھی روایت آچکی ہے کہ سوال کے نتیجہ میں قیامت کے روز چہرے پر خراش نمایاں ہوگی۔ اور یہ آدمی محنت مزدوری کرکے اپنی ضرورت پوری کررہا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو بدنما ہونے سے بچا رہا ہے۔ اس لیے کہ کوئی آدمی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے تو اس بات کی کوئی گارنٹی تو ہے نہیں کہ اس کا سوال پورا ہی کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ نہ دے۔ جب اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے رسوا کرکے بھی ضرورت پوری ہونے کی گارنٹی نہیں ہے تو اس کے مقابلہ میں محنت مزدوری سے جو بھی حاصل ہوا وہ زیادہ اچھا

ہے، اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے عزت تو رکھ لی۔

نبی اور بادشاہ بھی ہاتھ سے کماتے تھے

۵۴۱:- وعنه عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قالَ: كَانَ دَاوُدُ علیہ السلام لَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلِ يَدِهِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتے تھے۔

افادات:- حالاں کہ ان کے پاس بڑی بادشاہت تھی، ان کے ہاتھوں میں ملک کے خزانوں کی چابیاں تھیں، وہ مالک ومختار تھے، اس کے باوجود شاہی خزانہ سے نہیں کھاتے تھے، بلکہ اپنے ہاتھ سے مزدوری کرتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لوہے کو موم کی طرح نرم بنادیا تھا، وہ اس سے زِرَہ یعنی لوہے کی شیروانی بناتے تھے اور اسی کو بیچ کر جو مزدوری آتی تھی اس سے اپنا گزران کرتے تھے، حالاں کہ اتنی بڑی حکومت کے مالک تھے، لیکن حکومت کی رقم کو اپنی ضرورتوں میں استعمال نہیں کرتے تھے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا پیشہ

۵۴۲:- وعنه رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قالَ: كَانَ زَكَرِيَّا علیہ السلام نَجَّاراً.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے (جس کو ہم سُتھار ''si#Awiir'' کہتے ہیں۔ اور اس کی جو اجرت آتی تھی اس سے اپنا گزربسر کرتے تھے۔)

افادات:- ویسے بھی جو چیزیں انسانی ضرورت کی ہیں ان پیشوں کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی لوگوں تک پہنچایا ہے۔ جیسے کپڑے

بننے اور سینے کا کام، بڑھئی، سنّاری، لوہاری کا کام، زراعت اور طب وغیرہ؛ چوں کہ یہ سب انسانی ضرورتوں کی چیزیں ہیں، اس لیے یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر وحی کے ذریعہ سے القاء فرمائیں، پھر انہی کے واسطے سے لوگوں کو سکھلائی گئی ہیں۔

ہاتھ کی کمائی

۵۴۳:- وعن المقدام بن مَعْدِیکرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَاماً قَطُّ خَيْراً مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللهِ دَاوُدَ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت مقدام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی نے کوئی کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں کھایا۔ اور بے شک اللہ کے نبی داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

افادات:- اپنے ہاتھ سے جو محنت مزدوری کر کے حاصل کرے گا، اور اس سے کھانے کی چیز خرید کر کھائے گا، وہ اس کے حق میں سب سے بہتر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو خود کمانے کے واسطے کوشش کرنی چاہیے، چاہے وہ مزدوری کی شکل میں ہو، زراعت اور کھیتی باڑی کی شکل میں ہو، یا محنت کی جو بھی مختلف شکلیں ہیں ان میں سے کوئی بھی جائز شکل اختیار کرے؛ تو وہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے۔ باقی آدمی اگر بیٹھا رہے اور دوسروں کے اوپر نگاہیں ڈالے رہے، تو یہ شکل شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے۔ البتہ وہ حضرات جن کو توکل کا اونچا مقام حاصل ہے، وہ محنت مزدوری نہ کرنے کے باوجود کسی کے اوپر نگاہ ڈالے ہوئے نہیں ہوتے؛ ان کے لیے کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

الکرم والجود
اوالانفاق فی وجوہ الخیر
ثقۃ باللہ تعالیٰ

سخاوت اختیار کرنا
اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے
نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

﴿مجلس ۱﴾

۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۷/جون ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

ترجمۃ الباب کا خلاصہ

پچھلے باب میں کمانے کی فضیلت آئی تو ظاہر ہے جب آدمی محنت مزدوری کرے گا تو اس کے نتیجہ میں ہاتھ میں پیسہ آئے گا تو اس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے؟ اسی کو اس باب میں بتلایا جارہا ہے۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے سخاوت سے کام لینا۔ یعنی آدمی کے پاس مال ہوتا ہے تو نفس و شیطان اس کو ترغیب دیتے ہیں کہ مال کو خرچ مت کرو، کچھ اپنے پاس بھی رہنے دو، آڑے وقت کام آئے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ آڑے وقت اگر ضرورت بھی پڑے گی تو کتنے کی پڑے گی؟ ہزار، دو ہزار، پانچ ہزار کی پڑے گی، لیکن جو دس لاکھ پڑے ہیں اس کو آڑے وقت کے نام سے خرچ کرنے سے نفس روکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ آدمی کو ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے خرچ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ابھی دیا ہے تو اس وقت بھی وہی دے گا اور ضرورت پوری کرے گا۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے ہاتھ کو روکنا پسندیدہ نہیں ہے۔

﴿وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَھُوَ یُخۡلِفُہٗ﴾ (سورۂ سبا:۳۹) جو کچھ بھی تم خرچ کروگے، اللہ تعالیٰ اس کا معاوضہ اور بدلہ دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔

﴿وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ.(البقرة۲۷۲)﴾ جو کچھ بھی مال تم خرچ کروگے وہ اپنے واسطے ہی کروگے، یعنی اس کا فائدہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تم کو ہی پہنچنے والا ہے، وہ کہیں ضائع جانے والی چیز نہیں ہے۔ اور مال میں سے جو کچھ تم اللہ کو راضی کرنے کے لیے خرچ کروگے، اللہ تعالیٰ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دے گا، اور تمہارے خرچ کئے ہوئے کے اجر وثواب میں دنیا کے بدلہ میں ذرّہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔

حسد جائز نہیں ہے مگر......

۵۴۴:- وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالاً، فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ. وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ حِكْمَةً، فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ومعناه: يَنْبَغِي أَنْ لَا يُغْبَطَ أَحَدٌ إِلَّا عَلَى إِحْدَى هَاتَيْنِ الْخَصْلَتَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حسد جائز نہیں ہے، مگر دو آدمیوں کے معاملہ میں۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا، اس کے بعد اس کو حق میں (نیکی کے کاموں میں) اس مال کے ختم کرنے پر مسلط کر دیا۔ اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو بھی علم سکھلاتا ہے۔

افادات:- ویسے حسد کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا کی ہے، صاحبِ نعمت کی اس نعمت کو دیکھ کر کوئی آدمی یوں سوچے کہ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اس کے پاس سے چھین کر مجھے دیدے؛ اس کو حسد کہتے ہیں اور یہ حرام ہے۔ اور اگر یہ

خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت اس کو عطا فرمائی ہے، اس کے پاس بھی باقی رہے اور ایسی نعمت اللہ تعالیٰ مجھے بھی دے؛ تو اس کو عربی میں ''غبطہ'' کہتے ہیں، اور اردو میں اسی کو ''رشک'' کہتے ہیں۔ اس روایت میں فرمایا گیا کہ دو آدمیوں کے اوپر حسد کر سکتے ہیں۔ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ یہاں حسد بول کر رشک اور غبطہ مراد ہے کہ دو آدمی ایسے ہیں کہ اُن کی نعمت کو دیکھ کر تم اپنے دل میں یہ تمنا کر سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایسی نعمت اس کے ہاتھ سے چھینے بغیر ہمیں بھی عطا فرمائے۔

''فِي الْحَقِّ'' یعنی نیکی کے کاموں میں جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے پاس مال ہوتا ہے تو وہ نیکی کے کاموں میں خوب خرچ کرتے ہیں اور اس کثرت سے خرچ کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کو مال سے عداوت اور دشمنی ہے، اس کو اپنے پاس رکھنا ہی نہیں چاہتے؛ ایسے آدمی کو دیکھ کر کوئی رشک کرے اور دل میں یہ تمنا کرے کہ: کاش! اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی مال دیا ہوتا تو میں بھی مال کو نیکی کے کاموں میں اسی طرح خرچ کرتا جس طرح یہ آدمی خرچ کرتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اور لوگوں کو علم سکھلاتا ہے؛ یہ آدمی بھی اس قابل ہے کہ اس پر رشک کیا جائے۔ ہم یوں سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسا علم دیتا تو ہم بھی اسی طرح حق کے مطابق فیصلہ کرتے اور لوگوں کو یہ علم سکھاتے۔ یہ دو آدمی ہیں جن پر رشک کیا جا سکتا ہے اور اس کی ترغیب آئی ہے۔

مؤمن کا حقیقی مال تو یہی ہے؟

۵۴۵:- وعنه قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: أَيُّكُم مَالُ وَارِثِهِ أَحبُّ إِلَيهِ

مِنْ مَالِهٖ؟ قالوا: یَارسول اللهِ! مَا مِنَّا أَحَدٌ إِلَّا مَالُهُ أَحَبُّ إِلَیْهِ. قَالَ: فَإِنَّ مَالَهُ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهٖ مَا أَخَّرَ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا: تم میں سے کون ہے جس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر ایک کو اپنا ہی مال زیادہ محبوب ہے (وارث کا مال کس کو محبوب ہوگا؟) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (اگر اپنا ہی مال محبوب ہے تو) اپنا مال تو وہ ہے جو آگے بھیج دیا جائے، جو مال چھوڑ کر گئے، وہ وارث کا مال ہے (تو اب دیکھ لو کہ تم کون سے مال سے محبت کرتے ہو)

افادات:- عام طور پر آدمی کا جو فطری تقاضہ اور طبیعت ومزاج ہے کہ ہر ایک کو اپنا ہی مال دوسرے کے مال کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ دوسرے کا مال ہلاک بھی ہو جائے تو کچھ پرواہ نہیں ہوا کرتی۔

بہت سی مرتبہ آدمی زندگی بھر لاکھوں روپے جمع کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا مال ہے، لیکن جب موت آتی ہے تو اس مال کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے، نہ تو اس مال کو اپنی ضروریات (کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں) استعمال کیا، نہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا؛ بس! ایسے ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ اب پتہ چلا کہ وہ جس کو زندگی بھر اپنا مال سمجھتا رہا، وہ اس کا نہیں تھا بلکہ وارثوں کا تھا جن کے ہاتھ میں اب پہنچا ہے۔ تو اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنا تو وہی ہے جو خرچ کر کے آگے بھیج دو۔ اس روایت میں اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے زائد ہو اس کو خرچ کر کے آگے بھیج دے، ورنہ تو دوسروں کے لیے پیچھے چھوڑ کر جانا ہوگا۔

اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی؟

اور پھر جو بھی کام اپنے لیے کرلے گا وہ اس کے لیے آخرت میں کام آنے والا ہے، دوسروں پر بھروسہ کرنا اور دوسروں سے امید وتوقع رکھنا فضول ہے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ خود کمایا، اپنے پاس اپنی تحویل میں، اپنے کنٹرول میں اور اپنے اختیار میں رہا، پھر بھی اپنے لیے خرچ نہیں کیا، اور جب مرا تو دوسروں کے لیے چھوڑ کر گیا پھر یہ امید رکھتا ہے کہ اب دوسرے میرے لیے کچھ خرچ کریں گے، اس سے زیادہ نادانی اور بے وقوفی اور کیا ہوگی! جب تمہارے ہاتھ میں تھا، تم نے کمایا تھا، تم مالک تھے پھر بھی خود خرچ نہیں کیا کہ آخرت میں کام آئے، اور اب یہ امید رکھتے ہو کہ میرے بعد میری اولاد اس مال میں سے میرے لیے کچھ خرچ کرے گی۔ جب خود خرچ نہیں کیا، تو وہ کیا خرچ کرے گی؟ یہ امید تو فضول ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے مال میں سے اپنے ہاتھوں سے خود ہی خرچ کرلے۔

ایک غلط سوچ اور اس کی اصلاح

آدمی یوں سوچتا ہے کہ اگر میں اولاد کے لیے نہیں چھوڑوں گا تو میرے بعد میری اولاد کیا کرے گی؟ اللہ اکبر! ارے بھائی! تمہاری اولاد کو جس خدا نے پیدا کیا ہے وہی اس کا انتظام کرے گا۔ گویا ہم تو (نعوذ باللہ) خدا بنے بیٹھے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو پال رہے ہیں، ان کی ضرورتیں ہم پوری کررہے ہیں۔ حالاں کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں تھا؛ اس وقت اس کی ضرورتیں کون پوری کررہا تھا؟ ہر ایک کی ضرورت اللہ تعالیٰ ہی پوری کرتا ہے۔ آدمی یوں سوچتا ہے کہ بچوں کے لیے میں کچھ کرکے جاؤں۔ تو بھائیو! ان کے لیے اگر کچھ کرنا ہی ہے تو وہ کرو جس کی شریعت نے آپ کو

تاکید کی ہے یعنی ان کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرو، ان کو علم سکھاؤ، اچھے اعمال کا پابند بناؤ، ان کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دو۔ اصل کام تو یہ ہیں جو ہر آدمی کو اپنی اولاد کے لیے کرنے چاہئیں، اور شریعت میں انہی کی تاکید کی گئی ہے۔

اگر کسی روایت میں یہ آیا ہو تو ہمیں بتاؤ کہ اپنی اولاد کے لیے مکان چھوڑ کر جاؤ، زمین چھوڑ کر جاؤ، روپے پیسے چھوڑ کر جاؤ۔ ہاں!۔ یہ حکم تو آیا ہے کہ جب تک وہ چھوٹے ہیں، حاجت مند ہیں، آپ کی تحویل میں ہیں تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرو، لیکن یہ بھی سوچو کہ وہ چھوٹے ہیں تب بھی اگر آپ کو موت آگئی تو آپ کے بعد ان کا کیا حال ہوگا؟ ان کی ضرورتیں پوری ہوں گی یا نہیں؟ ضرور پوری ہوں گی۔ آدمی ایک طرف یوں سمجھ رہا ہے کہ جب بڑے ہوں گے اس کے بعد یہ مجھے کما کر کھلائیں گے، اور دوسری طرف یوں سوچتا ہے کہ میں ان کے لیے کچھ چھوڑ کر جاؤں۔ یعنی ہماری زندگی تضادات کا شکار ہے، آدمی دونوں طرف کی باتیں کرتا ہے، اولاد سے امید بھی رکھتا ہے، اور اولاد کے لیے کچھ چھوڑنا بھی چاہتا ہے۔

کھجور کے ایک ٹکڑے کی تاثیر

۵۴۶:- وعن عَدِيِّ بن حَاتِمٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ **أَنَّ رسولَ اللهِ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **قَالَ: اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، چاہے کھجور کے آدھے ٹکڑے کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- اگر آپ کھجور کا ایک ٹکڑا اللہ کے راستہ میں صدقہ کریں گے تو گویا اس کے ذریعہ سے آپ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا رہے ہیں۔ جب کھجور کے ایک ٹکڑے میں یہ تاثیر ہے تو زیادہ خرچ کرنے میں کیا کچھ تاثیر نہیں ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی ''نا'' نہیں کہا

۵۴۷:-عن جابرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: مَا سُئِلَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شَیْئًا قَطُّ، فقالَ: لاَ. (متفقٌ عَلَیْہِ)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ نے ''نا'' کہا ہو۔

افادات:- جب بھی کوئی چیز مانگی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً دے دی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ سے سوال کیا گیا ہو اور آپ نے انکار فرمایا ہو، بلکہ اگر آپ کے پاس نہیں ہوتا تو وعدہ فرمالیتے تھے، دوسرے وقت بلالیتے تھے۔ بعض لوگوں کو یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ کسی سے لے لو، میں تمہارا قرضہ ادا کردوں گا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ کِھل گیا

ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ایک آدمی آیا، اس نے اپنی حاجت پیش کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اچھا بھائی! تم کہیں سے اُدھار لے لو، بعد میں مَیں ادا کردوں گا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جو چیز آپ کے پاس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا آپ کو مکلف نہیں بنایا ہے، پھر آپ بلاوجہ بوجھ کیوں اپنے سر لے رہے ہیں؟ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس بات سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت زیادہ ناگواری ہوئی۔ ایک انصاری نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ خوب خرچ کیجیے اور عرش والے کی طرف سے ذرّہ برابر بھی کمی کی پرواہ نہ کیجیے، یعنی اللہ تعالیٰ محروم نہیں کرے گا۔ یہ سن کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ کِھل گیا اور فرمایا: مجھے اسی کا حکم ہے۔ (مسند بزار: ۲۷۳/ تہذیب الآثار للطبری: ۱۱۸)

بہرحال! حضور ﷺ نے کبھی کسی مانگنے والے کو انکار نہیں فرمایا، بلکہ جو چیز مانگی گئی وہ عطا فرمادی، حتیٰ کہ آپ ﷺ کی ضرورت کی ہوتی تھی وہ بھی دے دیا کرتے تھے۔

باوجود سخت ضرورت کے چادر دے دی

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چادر لے کر آئی جو لنگی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ اس نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اپنے ہاتھ سے سوت کات کر یہ چادر بنائی ہے، تاکہ آپ اس کو لنگی یا ازار کے طور پر استعمال کریں۔ راوی کہتے ہیں: عین ایسے موقعہ پر آکر اس عورت نے وہ چادر پیش کی تھی کہ آپ ﷺ کو خود اس کی سخت ضرورت تھی، اس وقت آپ کے پاس لنگی نہیں تھی۔ چناں چہ آپ ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا، پھر آپ مکان میں تشریف لے گئے، اس کو پہن کر تشریف لائے۔ جب آپ ﷺ اپنی مجلس میں بیٹھے تو ایک صحابی آپ ﷺ کے قریب ہوئے اور اس کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! یہ مجھے دے دیجئے۔ حضور ﷺ نے کہا: ٹھیک ہے۔ آپ ﷺ دوبارہ گھر میں تشریف لے گئے اور وہ چادر تہ کر کے بھجوائی۔ جب آپ ﷺ گھر میں تشریف لے گئے تو دوسرے صحابہؓ نے ان صحابی کو آڑے ہاتھوں لیا کہ تمہیں سمجھ نہیں پڑتی، تمہیں معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت کوئی کپڑا نہیں ہے، آپ کو بڑی شدید ضرورت تھی ایسی حالت میں یہ چادر آپ کے پاس ہدیہ میں آئی، آپ نے اس کو زیب تن کیا اور تم نے اس کو مانگ لی؟ انہوں نے کہا: میں نے اس لیے مانگی ہے کہ یہ میرا کفن بنے۔ چناں چہ روایتوں میں ہے اس چادر کو ان صحابی نے محفوظ رکھا یہاں تک کہ انتقال کے بعد ان کے کفن میں استعمال ہوئی۔

(بخاری شریف. باب مَنِ اسۡتَعَدَّ الۡکَفَنَ فِی زَمَنِ النبی ﷺ فَلَمۡ یُنۡکَرۡ عَلَیۡہِ. حدیث رقم: ۱۲۷۷)

یہاں تو بتانا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیز تھی پھر بھی نبی کریم ﷺ نے عطا فرمادی۔

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرزدق شاعر کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

مَا قَالَ لاَ قَطُّ اِلاَّ فِیْ تَشَهُّدِهٖ ❁ لَوْلاَ التَّشَهُّدُ لَكَانَتْ لاَءُهٗ نَعَمْ

انہوں نے کلمۂ شہادت کے علاوہ کبھی اپنی زبان سے ''لا'' کہا ہی نہیں۔ اگر کلمۂ شہادت نہ ہوتا تو ان کی زبان پر ''لا'' آتا ہی نہیں۔

سخاوت کی برکت اور بخل کی نحوست

۵۴۸:-وعن أَبی هريرة رضی اللہ تعالٰی عنہ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَا مِنْ يَوْمٍ يُصبحُ العِبَادُ فِيهِ إِلاَّ مَلَكَانِ يَنْزِلانِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقاً خَلَفاً، وَيَقُولُ الآخَرُ: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكاً تَلَفاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر دن جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے اُترتے ہیں (بعض روایتوں میں ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں) ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! جو تیرے راستہ میں خرچ کرنے والا ہو اس کو اس مال کا جو اس نے خرچ کیا ہے بدلہ عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! جو خرچ کرنے کی جگہ میں خرچ نہیں کرتا، روکے رکھتا ہے، اس کے مال کو ہلاک کردے۔

افادات:- ظاہر ہے کہ فرشتوں کی دعا تو ضرور قبول ہوگی۔ بعض شرّاح نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ''مُمْسِكاً تَلَفاً'' میں مطلق تلف فرمایا گیا ہے۔ گویا جو آدمی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے، اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں خرچ نہیں کرتا ہے، تو صرف مال ہی نہیں، بلکہ اس کی دوسری صلاحیتیں بھی ضائع ہوتی ہیں، اللہ کی راہ میں استعمال میں نہیں آتیں۔ بخل کی یہ نحوست ہے۔

پہلے خالی کرو، تو بھری جائے گی

۵۴۹:- وعنه أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَنْفِقْ يَا ابْنَ آدَمَ يُنْفَقْ عَلَيْكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (یہ حدیث قدسی ہے) اے انسان! خرچ کر؛ تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔

افادات:- باری تعالیٰ فرماتے ہیں: تم خرچ کرو تو تم کو ملے گا۔ اگر خرچ نہیں کروگے تو نہیں ملے گا۔ ہر چیز کے اندر قدرت کا یہی قانون ہے جیسے: آپ یہاں کی کھڑکیاں بند کر دیں، ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہ رکھیں؛ تو تازہ ہوا نہیں آئے گی۔ اگر آپ کھڑکی کھول دیں گے، ہوا کے جانے کا راستہ نکال دیں گے؛ تو نئی ہوا آئے گی۔ اسی طرح آپ کی جیب بھری کی بھری ہے، تو دوسرا کہاں سے آئے گا، پہلے اس کو خالی کرو تو دوبارہ بھری جائے گی۔ جیب بھری کے بھری ہی رہنے دیتے ہیں، خالی تو کرتے نہیں، پھر دوسرے کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ برتن بھرا ہوا ہے تو نئی چیز اس میں کیسے آئے گی؟ نئی چیز لینا چاہتے ہو تو اس برتن کو پہلے خالی کرو، پھر اس میں نئی چیز آئے گی۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خرچ کیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں میں خرچ کرنے کی تاکید فرمائی اور ترغیب دی ہے، اس میں خرچ کرنے کے معاملہ میں آدمی کو بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

الکرم والجود
اوالانفاق فی وجوہ الخیر
ثقۃ باللہ تعالیٰ

سخاوت اختیار کرنا
اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے
نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

﴿مجلس ۲﴾

۲۲ / ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۲۴ / جون ۲۰۰۰ء

بیان چل رہا تھا کہ اللہ کے اعتماد پر نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا اور سخاوت وفراخ دلی سے کام لینا۔ اسی سلسلہ میں آگے مزید روایتیں پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے اعمال میں بہترین عمل

۵۵۰:- وَعَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ عَمۡرِو بۡنِ الۡعَاصِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: أَیُّ الۡاِسۡلَامِ خَیۡرٌ؟ قَالَ: تُطۡعِمُ الطعامَ وَ تَقۡرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنۡ عَرَفۡتَ وَمَنۡ لَّمۡ تَعۡرِفۡ. (متفقٌ عَلَیۡہِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے سوال کیا: اسلام کے اعمال میں سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: کھانا کھلانا۔ اور جس کو پہچانتے ہو اور جس کو نہیں پہچانتے؛ سب کو سلام کرنا۔

افادات:- سلام؛ مسلمان ہونے کے ناطے سے اسلامی ایک حق ہے، اس میں پہچان والا ہونا ضروری نہیں ہے، بس! جس کا مسلمان ہونا معلوم ہو جائے اس کو سلام کیا جائے؛ چاہے اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو، بلکہ صرف پہچان والے کو سلام کرنا تو آخری زمانہ کی نشانی بتلائی گئی ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسلام کے سب سے اچھے عمل میں نمبر اول پر کھانا کھلانا بتلایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیکی کا ایسا کام ہے جو مال خرچ کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس روایت میں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ آدمی اس کام میں اپنا مال خرچ کرے۔

یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے

۵۵۱:- وعنہ قَالَ: قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: أَرۡبَعُوۡنَ خَصۡلَةً: أَعۡلَاهَا

مَنِیحۃُ العَنْزِ، مَا مِنْ عَامِلٍ یَعْمَلُ بِخَصْلَۃٍ مِنْھَا؛ رَجَاءَ ثَوَابِھَا وَتَصْدِیقَ مَوْعُودِھَا إِلاَّ أَدْخَلَہُ اللہُ تَعَالَی بِھَا الجَنَّۃَ. (رواہ البخاری. وقد سبق بیان ھٰذا الحدیث فی باب بَیَانِ کَثْرَۃِ طُرُقِ الخَیْرِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: چالیس کام ایسے ہیں کہ کوئی بھی اللہ کا بندہ اگر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور اس کام پر دنیا اور آخرت میں جو ثواب اور بدلہ ملنے والا ہے اس وعدہ کو سچا سمجھتے ہوئے کسی بھی ایک کام کو کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے۔ ان چالیس کاموں میں سے ایک کام دودھ دینے والی بکری کسی کو عاریت کے طور پر دینا ہے۔

افادات:- بہت سی جگہوں پر دیہاتوں میں آج بھی یہ رواج ہے کہ کسی آدمی کے پاس بہت سارے دودھ دینے والے جانور رہیں، مثلاً: کئی بکریاں دودھ دیتی ہیں، خود مالک کی دودھ کی ضرورت تو ایک دو سے پوری ہو جاتی ہے، تو ان میں سے ایک دو بکری اپنے کسی رشتہ دار، یا کسی غریب کو دیدیتے ہیں کہ جب تک یہ جانور دودھ دیتا رہے، تم اس کو اپنے پاس رکھو، اور اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاؤ، جب یہ جانور دودھ دینا بند کر دے تو واپس کر دینا۔ دودھ دینے والی بکری، اونٹنی، گائے یا بھینس؛ جب تک کہ وہ دودھ دے کسی کو استعمال کرنے کے لیے دینا، تا کہ وہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھائے -نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ جن چالیس کاموں میں سے کسی بھی ایک کام کے کرنے پر اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرماتے ہیں ان میں- یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ گویا خرچ کرنے کی ایک چیز یہ بھی ہے، اس لیے اس کو یہاں ذکر کیا ہے۔

مال خرچ کرنے کی تعلیم اور ترتیب

۵۵۲:- وعن أَبِي أُمَامَۃَ صُدَیِّ بْنِ عَجْلاَنَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسولُ اللہِ

ﷺ: یَاابْنَ آدَمَ ! إِنَّكَ أَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَيْرٌ لَّكَ. وَاَنْ تُمْسِكَهُ شَرٌّ لَّكَ. وَلَا تُلَامُ عَلَى كَفَافٍ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ. وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت اَبواُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے انسان! تو اپنا زائد مال خرچ کردے، یہ تیرے لیے بہتر ہے۔ اور اس کو اپنے پاس رہنے دے، یہ تیرے لیے برا ہے۔ البتہ آئندہ جتنی مقدار کی ضرورت پڑنے والی ہے اس کو اگر تو اپنے پاس روکے رکھے، اس پر کوئی ملامت نہیں (حرج کی بات بھی نہیں ہے) اور جب خرچ کرنا شروع کرے تو جن لوگوں کا خرچہ تیرے ذمہ ہے، ان سے خرچ کرنے میں شروعات کر۔ اور اوپر والا ہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا) نیچے والے (یعنی مانگنے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

افادات:- زائد مال کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ضرورتیں پوری ہوجانے کے بعد جو بچ جائے۔ اس مال کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا بہتر ہے، اس لیے کہ اگر خرچ نہیں کروگے تو ایک وقت آئے گا جب تم دنیا سے جارہے ہوگے، تو سب مال یہیں چھوڑ کر جاؤگے، اس وقت وہ تمہارے کسی کام آنے والا نہیں ہے۔ تمہارے بعد جو لوگ آنے والے ہیں ان کے ہاتھ میں پہنچے گا۔ اگر تم نے اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کردیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ذخیرہ ہوجاتا، وہاں کے بینک میں جمع ہوجاتا اور تمہارے لیے کارآمد ہوتا۔

اور جب خرچ کرنا شروع کرو تو جن کے خرچ کی ذمہ داری تم برداشت کرتے ہو پہلے ان کو دو، شروعات اپنے گھر ہی سے کرنی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آپ نیکی کے طور پر خرچ کرنا شروع کریں تو دوسروں کو تو دیں اور جن کے خرچ کی ذمہ داری تمہارے سر ہے، وہ بیچارے محروم رہیں، دوسروں کو آپ کی سخاوت سے فائدہ ہورہا ہے، اور یہ بیچارے بھوکے مر رہے ہیں۔

سخاوت سے اسلام محبوب بن جاتا

۵۵۳:- وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ مَا سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَلَى الإِسْلَامِ شيئاً إِلاَّ أَعْطَاهُ. وَلَقَدْ جَاءَهُ رَجُلٌ، فَأَعْطَاهُ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ، فَرَجَعَ إِلَى قَوْمِهِ، فَقَالَ: يَا قَوْمِ! أَسْلِمُوا؛ فَإِنَّ مُحَمَّداً يُعطِي عَطَاءَ مَن لا يَخْشَى الْفَقْرَ، وَإِنْ كَانَ الرَّجُلُ لَيُسْلِمُ مَا يُرِيدُ إِلاَّ الدُّنْيَا، فَمَا يَلْبَثُ إِلاَّ يَسِيراً حَتَّى يَكُونَ الإِسْلاَمُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی طرف سے اسلام قبول کرنے کے اوپر بطور شرط کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی چیز کا سوال ہوتا تو آپ ضرور دیدیتے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی آیا، اس نے مسلمان ہونے پر شرط رکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو دو پہاڑوں کے درمیان (جو وادی ہوتی ہے، وہ پورا) میدان بکریوں سے بھرا ہوا دے دیا۔ جب اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت دیکھی تو اپنی قوم میں واپس گیا اور کہا: اے میری قوم! مسلمان ہو جاؤ؛ وہ تو اتنا دیتے ہیں کہ ان کو فقر کا ڈر ہی نہیں ہے (حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) کبھی کوئی آدمی فقط دنیا کے واسطے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا سا زمانہ نہیں گزرتا تھا کہ اس کے دل ودماغ میں اور اس کی نگاہ میں مذہبِ اسلام؛ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے ان سب سے زیادہ محبوب ہو جاتا تھا۔

افادات:- اگر کوئی آدمی آکر یوں کہتا: اے اللہ کے رسول! مجھے یہ چیز دیجیے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا، یا اگر آپ مجھے اتنا مال دیں تو میں اسلام قبول کرتا ہوں؛ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ وہ جو بھی چیز اسلام قبول کرنے کے لیے شرط کے طور پر مانگتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عنایت فرما دیتے تھے۔ اور عام طور پر آدمی جب خرچ کرتا ہے تو سوچتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں رہے گا تو میں کیا کروں گا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ایسا

سوچتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں ہے کہ اس کے ترغیب دینے پر اس کی پوری قوم مسلمان ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت اس کے اوپر اتنا اثر کرگئی کہ وہ خود تو اسلام لایا ہی، اپنی پوری قوم کو بھی اسلام لانے پر آمادہ کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی مطالبہ لے کر آتا کہ مجھے فلاں چیز چاہیے، اگر آپ دیں تو میں اسلام لاتا ہوں، حالاں کہ کھلم کھلا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کی فلاں چیز کے واسطے ہی اسلام لا رہا ہے، لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیدیتے اور اس کو اسلام کے لیے آمادہ کرتے۔ اولاً تو اسلام لانے کی شکل یہی ہوتی تھی کہ اپنی غرض کی خاطر وہ اسلام لاتا تھا، لیکن پھر تھوڑا سا زمانہ نہیں گزرتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں اور اس کی نگاہ میں مذہب اسلام؛ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سب سے زیادہ محبوب ہوجاتا تھا۔ یعنی اس کے اسلام کی ابتداء تو یہ ہوتی تھی لیکن بعد میں پھر اس کی نگاہ میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی اور وہ پکا سچا مسلمان ہوجاتا تھا۔

غیر حقدار کو دینے کی وجہ

۵۵۴:- وعن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ قَالَ: قَسَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَسْماً، فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! لَغَیْرُ ھٰؤُلَاءِ کَانُوا أَحَقَّ بِهِ مِنْهُمْ؟ فَقَالَ: إِنَّهُمْ خَيَّرُونِيْ أَنْ يَسْأَلُوْنِيْ بِالْفُحْشِ، أَوْ يُبَخِّلُوْنِيْ، وَلَسْتُ بِبَاخِلٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم فرمایا، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں اس مال کے زیادہ حقدار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انہوں نے مجھے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا، یا تو وہ فحش گوئی کرکے مجھ سے مانگیں (اگر میں دے دوں تو ٹھیک ہے) ورنہ وہ مجھے بخیل کہیں،

اور مَیں بخیل نہیں ہوں (اس لیے باوجود اس کے کہ دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہوتے ہیں، میں ان کو دیتا ہوں، دوسروں کو نہیں دیتا)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت کا نمونہ

۵۵۵:- وعن جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: بَيْنَمَا هُوَ يَسِيرُ مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَقْفَلَهُ مِنْ حُنَيْنٍ، فَعَلِقَهُ الأَعْرَابُ يَسْأَلُونَهُ، حَتَّى اضْطَرُّوهُ إِلَى سَمُرَةٍ، فَخَطِفَت رِدَاءَهُ، فَوَقَفَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: أَعْطُونِي رِدَائِي، فَلَوْ كَانَ لِي عَدَدُ هَذِهِ الْعِضَاهِ نَعَماً، لَقَسَمْتُهُ بَيْنَكُمْ، ثُمَّ لا تَجِدُونِي بَخِيلاً وَلاَ كَذَّاباً وَلاَ جَبَاناً۔ (رواہ البخاری)

((مَقْفَلَهُ)) أَيْ: حَالَ رُجُوعِهِ. وَ((السَّمُرَةُ)): شَجَرَةٌ. وَ((الْعِضَاهُ)): شَجَرٌ لَهُ شَوْكٌ.

ترجمہ:- حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غزوۂ حنین سے واپس لوٹ رہے تھے، تو دیہات کے رہنے والے بہت سے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لپٹ گئے، آپ کو گھیر لیا اور سوال کرنے لگے (کہ ہم کو دیجئے) یہاں تک کہ (وہ آپ کے پیچھے ایسے پڑے کہ ان سے بچنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے ہٹتے جا رہے تھے، اور مجبوراً) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیکر کے ایک درخت کے پاس پناہ لینی پڑی (تو کیکر کے درخت کی ٹہنیوں اور کانٹوں میں آپ کی چادر اُلجھ گئی اور آپ کے جسم سے اتر گئی، تو) وہ چادر بھی ان دیہاتیوں نے لے لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے اور فرمایا: میری چادر تو مجھے دیدو (اس پر تم نے کیوں قبضہ کر لیا؟) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دیکھو! اس پوری وادی کے اندر جتنے بھی کانٹے دار درخت ہیں ان کے برابر اگر میرے پاس مویشی اور جانور ہوتے تو میں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا اور تم مجھے بخیل، جھوٹا یا بزدل نہ پاتے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ اِس وقت جو نہیں دے رہا ہوں وہ اس لیے کہ میرے پاس ہے ہی نہیں، اگر میرے پاس ہوتا تو میں ذرّہ برابر بخل سے کام نہ لیتا۔

غزوۂ حنین

مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد یہ غزوہ پیش آیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا کہ قبیلۂ ہوازن اور قبیلۂ بنوثقیف اور آس پاس کے دوسرے قبائل کے لوگ جمع ہوئے ہیں اور ان کا ارادہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کا ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا کہ جاؤ معلوم کر کے آؤ کہ جو خبر ہمیں ملی ہے کہ یہ لوگ جمع ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں؛ واقعتاً یہ خبر صحیح ہے؟ چناں چہ وہ جا کر آئے اور اطلاع دی کہ جی ہاں! وہ سب جمع ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابہ کو- جن کو لے کر آپ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ فتح کرنے کے لیے تشریف لائے تھے- حکم دیا کہ چلیں! اس سے پہلے کہ وہ ہم پر چڑھائی کریں، ہم ہی جا کر ان کی خبر لیں۔ چناں چہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضراتِ صحابہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ وادیٔ حنین وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان عرفات سے تھوڑی ہی آگے واقع ہے۔ وہ لوگ تیر اندازی میں بڑے مشہور تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کی وادی میں داخل ہوئے تو شروع میں معمولی سا مقابلہ کر کے وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے پہلے سے ہی یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے تیر اندازوں کو پہاڑوں کے اندر چھپا دیا تھا، اور مقابلہ کے لیے کچھ لوگ ظاہری طور پر آئے، پھر انہوں نے بھی پسپائی اختیار کی۔ صحابہ میں کچھ جلد باز لوگ تھے، وہ یوں سمجھے کہ ہمارا پلڑا بھاری ہو گیا ہے، تو وہ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے، اتنے میں جو لوگ چھپے ہوئے تھے انہوں نے اچانک حملہ کر کے پیچھے سے تیر

برسانے شروع کردیئے، اس سے بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

اس ابتدائی شکست کی اصل وجہ تو یہ ہوئی تھی کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حنین کی طرف جارہے تھے، اس وقت بارہ ہزار کالشکر ساتھ تھا۔ ایک آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعداد کی زیادتی کامیابی کا سبب بن سکتی ہے، حالاں کہ ایک مؤمن کا ایمان تو یہ ہونا چاہیے کہ ساز وسامان یا تعداد کی زیادتی سے کامیابی نہیں ملتی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے کامیابی ملتی ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے بتلایا ﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئاً﴾ یاد کرو حنین والے دن کو؛ جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تم کو عجب وغرور میں مبتلا کردیا تھا، اور وہ کسی کام نہیں آئی، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد اُتاری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو جمے رہے تھے، بالآخر مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا اور کامیابی ہوئی اور بہت سارا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ مالِ غنیمت کے اندر ۴/ہزار اوقیہ چاندی، ۲۴/ہزار اونٹ، ۴۰/ہزار بکریاں ملی تھیں، اور ۶/ہزار قیدی بھی تھے۔ اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالِ غنیمت کا جو خمس یعنی پانچواں حصہ تھا اس میں سے بہت سے لوگوں کو دیا تھا۔

صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا

۵۵۶:-وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلَّا عِزّاً، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ. (رواہ مسلم)

۵۵۷:-وَعَنْ أَبِي كَبْشَةَ عمرِو بْنِ سَعْدٍ الْأَنْمَارِيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ رسولَ

اللہِ ﷺ يَقُوْلُ: ثَلَاثَةٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَأُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا فَاحْفَظُوْهُ: مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ، وَلَا ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلَمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا إِلَّا زَادَهُ اللهُ عِزًّا، وَلَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ - أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا - وَأُحَدِّثُكُمْ حَدِيثاً فَاحْفَظُوهُ. قَالَ: إِنَّمَا الدُّنْيَا لِأَرْبَعَةِ نَفَرٍ، عَبْدٍ رَزَقَهُ اللهُ مَالًا وَّعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِيْ فِيْهِ رَبَّهُ، وَيَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهُ وَيَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيْهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ. وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللهُ عِلْمًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا، فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ، يَقُوْلُ: لَوْ أَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنِيَّتِهِ، فَأَجْرُهُمَا سَوَآءٌ. وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللهُ مَالًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ علمًا، فَهُوَ يَخْبِطُ فِيْ مَالِهِ بغير علمٍ، لَا يَتَّقِيْ فِيْهِ رَبَّهُ، وَلَا يَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهُ وَلَا يَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيْهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَخْبَثِ الْمَنَازِلِ. وَعَبْدٍ لَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا وَلَا عِلْمًا، فهو يقول: لو أَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنِيَّتِهِ. فَوِزْرُهُمَا سَوَآءٌ.

(رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدقہ مال کو کم نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی معافی کے نتیجہ میں اس کی عزت ہی بڑھاتے ہیں، اور جو آدمی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزوں پر میں قسم کھاتا ہوں، پھر میں ایک بات کہوں گا؛ اس کو یاد رکھنا۔

[۱] اللہ کی قسم! کسی بندے کا مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا۔

[۲] جس بندے پر ظلم کیا جاتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتے ہیں۔

[۳] جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: ایک بات کہتا ہوں اس کو یاد رکھو: دنیا میں چار قسم کے آدمی ہیں:-

[۱] ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا، وہ آدمی اپنے اس علم کی وجہ سے مال کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے (اس کو کماتا ہے تو بھی اللہ کے حکم کے مطابق، اور خرچ کرتا ہے تو بھی اللہ ہی کے حکم کے مطابق) اور اس مال کے ذریعہ سے صلہ رحمی کرتا ہے، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جتنے حقوق اس مال کے اندر لگائے ہیں ان کو جانتا اور ادا کرتا ہے؛ یہ آدمی سب سے اونچے درجہ کا ہے۔

[۲] دوسرا بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا ہے؛ لیکن مال نہیں دیا۔ اس کے دل میں نیت سچی ہے، اس لیے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر مجھے مال دیا ہوتا تو (جیسے اس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم دونوں دیا ہے، اور وہ اس مال کے حقوق ادا کرتا ہے) میں بھی اسی طرح مالی حقوق ادا کرتا، صلہ رحمی کرتا اور جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کے لیے کہا ہے، وہاں خرچ کرتا؛ اس کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق ہی معاملہ کیا جائے گا۔ چناں چہ وہ اور پہلے والا دونوں کو برابر ثواب ملے گا۔

[۳] تیسرا وہ بندہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال تو دیا ہے؛ لیکن علم سے محروم ہے۔ وہ اپنے مال میں جہالت کی وجہ سے بہت گڑبڑ کرتا ہے۔ نہ اس مال کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، نہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائے ہوئے دیگر حقوق جانتا اور ادا کرتا ہے؛ یہ سب سے بدتر آدمی ہے۔

[۴] اور چوتھا آدمی وہ جس کے پاس نہ مال ہے، اور نہ علم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے پاس بھی اگر مال ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسے وہ کرتا ہے (یعنی مال کو بے جا خرچ کرتا) یہ اس کی نیت کی بات ہے، اس لیے اس کا اور تیسرے والے کا گناہ برابر ہے۔

افادات:- اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد

فرمائی ہے کہ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہورہا ہے کہ صدقہ دینے سے مال گھٹ رہا ہے؛ لیکن حقیقت میں اس کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی؛ بلکہ زیادتی ہی ہوتی ہے۔

اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی نے ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کیا، پٹائی کردی، بے عزتی اور اِنسلٹ کردی، تو ہمارا نفس چاہتا ہے کہ اس سے انتقام اور بدلہ لیں، لیکن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ معاف کردو۔ جب معاف کرنے کی بات آتی ہے اور دوسرے لوگ بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہاں بھائی! معاف کردو، تو وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ تو میری بے عزتی کی بات ہے، لوگ کہیں گے کہ بہت ڈھیلا آدمی ہے، بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتا، اسی جذبہ کے نتیجہ میں آدمی معاف نہیں کرتا اور انتقام لیتا ہے۔ شریعت کہتی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں معاف کردوں گا تو میری بے عزتی ہوگی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ اگر معاف کردو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری عزت اور بڑھا دے گا۔ جیسا کہ صدقہ کرنے میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مال گھٹ رہا ہے، ایسا ہی یہاں پر بھی ہے۔

”اور جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں“ یعنی کوئی آدمی مانگنے کا سلسلہ شروع کرتا ہے تو بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مانگے گا تو لوگ اس کو دیں گے، اور اس کے نتیجہ میں مال میں اضافہ ہوگا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ آدمی سوال کا دروازہ کھول کر اپنے لیے فقر کا دروازہ کھول رہا ہے، اس سے مال بڑھتا نہیں؛ بلکہ گھٹتا ہے۔

اس روایت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آدمی کو اپنا ارادہ اور نیت ہمیشہ اچھی ہی رکھنی چاہیے، اس لیے کہ بعض آدمی محض اپنے ارادہ اور نیت کی وجہ سے مال اور علم نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا۔

جو خرچ کیا وہ سب باقی ہے

۵۵۸:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا أَنَّهُمْ ذَبَحُوا شَاةً، فَقَالَ النبيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَا بَقِيَ مِنْهَا؟ قالت: مَا بَقِيَ مِنْهَا إِلاَّ كَتِفُهَا. قَالَ: بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرُ كَتِفِهَا.

(رواہ الترمذی وقال: حدیث صحیح)).

ومعناه: تَصَدَّقُوا بِهَا إِلاَّ كَتِفَهَا. فَقَالَ: بَقِيَتْ لَنَا فِي الآخِرَةِ إِلاَّ كَتِفَهَا.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر والوں نے بکری ذبح کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اس میں سے کتنا بچا؟ بتایا گیا کہ سب تقسیم ہوگئی، صرف اس کا بازو بچا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب باقی ہے؛ ہاں! جو بازو بچا ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ تم نے جو تقسیم کردیا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ ہوگیا ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ گویا جتنا دے دیا وہ باقی ہے اور جو ابھی تمہارے پاس باقی ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔

تم روک کر مت رکھو؛ ورنہ......

۵۵۹:- وعن أسماء بنت أبي بكرٍ الصديق رضی اللہ عنہما قالت: قَالَ لِي رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لاَ تُوكِي فَيُوكَى عَلَيْكِ.

وفي رواية: أنفقي أَوِ انْفَحِي، أَوِ انْضَحِي، وَلاَ تُحصي فَيُحْصِيَ اللهُ عَلَيْكِ، وَلاَ تُوعي فَيُوعِيَ اللهُ عَلَيْكِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وَ((انْفَحِي)) بالحاء المهملة، وَهُوَ بمعنى ((أنفقي)) و كذلك ((انْضحي))

ترجمہ:- حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم

روک کر مت رکھو کہ تم پر روکا جائے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ تم بچا کر نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے بچا کر رکھیں گے۔

سخی اور بخیل؛ ایک مثال

۵۶۰:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنّه سمع رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقولُ: مَثَل البَخيل وَالمُنْفِقِ، كَمَثَلِ رَجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا جُنَّتَانِ مِنْ حَدِيدٍ مِنْ ثُدِيِّهِمَا إِلَى تَرَاقِيهِمَا. فَأَمَّا المُنْفِقُ: فَلاَ يُنْفِقُ إِلاَّ سَبَغَتْ- أَوْ وَفَرَتْ- عَلَى جِلْدِهِ حَتَّى تُخْفِيَ بَنَانَهُ، وَتَعْفُو أثَرَهُ. وأَمَّا البَخِيلُ: فَلاَ يُرِيدُ أنْ يُنْفِقَ شَيْئاً إِلاَّ لَزِقَتْ كُلُّ حَلْقَةٍ مَكَانَهَا فَهُوَ يُوسِّعُهَا فَلاَ تَتَّسِعُ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

وَ((الجُنَّةُ)): الدِّرْعُ؛ وَمَعنَاهُ أنَّ المُنْفِقَ كُلَّمَا أنْفَقَ سَبَغَتْ، وَطَالَتْ حَتَّى تَجُرَّ وَرَاءهُ، وَتُخْفِيَ رِجْلَيْهِ وَأثَرَ مَشْيِهِ وَخُطُوَاتِهِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بخیل کی اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہیں جن پر لوہے کی دو زرہیں- جو لڑائی کے موقع پر پہنی جاتی ہیں- ان کے سینے سے ہنسلیوں تک ہوں، پس سخی کی حالت تو یہ ہے کہ اس نے جونہی خرچ کیا تو وہ زرہ بآسانی نیچے اتر گئی، یا اس کی کھال پر مکمل آ گئی یہاں تک کہ اس نے اس کے پوروں کو بھی ڈھانپ لیا، اور وہ کرتہ نیچے زمین کے ساتھ گھسٹ رہا ہے۔ اور بخیل کا حال ایسا ہے کہ جب بھی وہ خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ہر حلقہ اپنی جگہ چپک جاتا ہے، وہ اس کو کشادہ کرتا ہے، لیکن کشادہ نہیں ہوتی۔

افادات:- آدمی جب اپنا کرتہ پہنتا ہے تو جسم کو اس میں داخل کرنے کے لیے پہلے نچلا حصہ اپنے سر کے اوپر ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے نچلا حصہ اوپر آئے گا، پھر آستین داخل کرے گا، اور دھیرے دھیرے وہ کرتہ نیچے اتر کر پورے جسم کو ڈھانپ

لے گا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کرتہ تنگ ہوتا ہے تو اوپر ہی اوپر پھنس جاتا ہے، نیچے اترتا ہی نہیں، آدمی اس کو اتارنے کی محنت کرتا ہے، اس کے ہاتھ بھی اس میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن نیچے اترنے کا نام نہیں لیتا، اگر کرتہ کشادہ ہو تو آسانی کے ساتھ اتر جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہی ہے، جب وہ چاہتا ہے تو اس کا دل اور طبیعت ایسی بنی ہوئی ہے کہ جیسے ہی اس نے خرچ کرنے کا ارادہ کیا، فوراً وہ بڑی آسانی سے خرچ کر لیتا ہے، خرچ کرنے کے معاملہ میں اس کے دل کی طرف سے ذرہ برابر بھی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ گویا اس کا حال ایسا ہے جیسے وہ کرتہ جو اس نے اوپر ڈالا تو بڑی آسانی سے نیچے تک اترتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس نے اس کے پاؤں بھی ڈھانپ لیے، اور وہ کرتہ نیچے زمین کے ساتھ گھسٹ رہا ہے۔

اور بخیل کا حال ایسا ہے کہ وہ خرچ کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کا مزاج اور طبیعت ساتھ نہیں دیتی، وہ ارادہ کرتا ہے تب بھی ہاتھ جیب کے اندر جاتے ہی نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کرتہ پہننے کے لیے اس کو اوپر سے ڈالا اور نیچے اتارنے کی بڑی کوشش کرتا ہے؛ لیکن کرتہ اترتا ہی نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بخل اور سخاوت کو ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مزاج اور طبیعت کی ہیں۔ بعضوں کی طبیعت میں سخاوت ہوتی ہے، جب بھی وہ کسی کارِ خیر میں خرچ کرنا چاہتے ہیں تو بڑی آسانی سے اپنے ارادہ میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور بعضوں کے مزاج میں بخل ہوتا ہے، وہ اگر کارِ خیر میں خرچ کرنے کا ارادہ بھی کریں تب بھی اس کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ تو سخی آدمی کارِ خیر میں خرچ کرنے کے اپنے ارادہ میں کامیاب ہوجاتا ہے، اور بخیل آدمی کارِ خیر میں خرچ کرنے کے اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔

الکرم والجود

اوالانفاق فی وجوہ الخیر

ثقۃ باللہ تعالیٰ

سخاوت اختیار کرنا

اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے

نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

﴿مجلس ۳﴾

۲۹ / ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱/ جولائی ۲۰۰۰ء

سخاوت اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں یہ باب چل رہا تھا بہت ساری روایتیں ذکر کیں، آخری دو روایتیں باقی رہ گئی ہیں۔

......تو بخل کیوں؟

اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں درحقیقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی دل کی تنگیوں کو دور کرنے کا فیصلہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ اے اللہ! تو ہمارے دل کی تنگی کو دور کردے۔ وجہ کیا ہے؟ آدمی جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرما رکھا ہے، اس میں کسی آدمی کی محنت ومشقت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ بات پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اگر محنت ومشقت، یا آدمی کی صلاحیتوں پر، یا سرٹیفکٹ اور پڑھائی پر روزی کی کمی اور زیادتی موقوف ہوتی؛ تو جن کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں وہ روزی سے محروم رہتے۔ ایک مزدور جسمانی طور پر جتنی محنت ومشقت اٹھاتا ہے، دفتر میں بیٹھنے والا سیٹھ اتنی محنت ومشقت نہیں اٹھاتا، اس کے باوجود دونوں کی روزی میں بیّن فرق ہے۔ روزی کے معاملہ میں تو اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دیتا ہے۔ تو جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، آدمی اس کے خرچ کرنے میں آخر بخل اور تنگی سے کیوں کام لے؟

بغیر خرچ کئے سخاوت کا ثواب

آپ پہلے روایت پڑھ چکے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مال ودولت کے استعمال کے اعتبار سے آدمیوں کی چار قسمیں ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کو

اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا، اس علم کی وجہ سے وہ اس مال کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور ناراضگی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سب سے اونچا مقام عطا فرماتے ہیں۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کے پاس مال نہیں ہے، لیکن اس کو علم دیا گیا ہے، پہلے والے کو دیکھ کر یہ سوچتا اور تمنا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھے بھی مال دیتا تو میں بھی مال کو اسی طرح نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو بھی اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا۔ اب دیکھو کہ اس نے کیا خرچ کیا؟ پہلے آدمی نے تو خرچ بھی کیا اور دوسرے نے تو ایک پائی بھی خرچ نہیں کی، صرف دل میں ارادہ و نیت اور پختہ عزم ہے۔ اب اس کا ارادہ سچا ہے یا جھوٹا؛ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اور اجر دینے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ کس کے دل میں کیا ہے۔ دنیا کے کسی آدمی کے سامنے تو ہم اپنی لچھے دار باتوں سے ہوسکتا ہے کہ دھوکہ دیدیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو ایسا نہیں ہے، وہ تو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے کہ کس کی نیت سچی ہے اور کس کی جھوٹی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو نیکی کا ارادہ کرنے پر بھی بہت کچھ دیا جاتا ہے۔

دعا میں بھی سخاوت سے کام لو

دعا کا معاملہ ہی لے لو۔ ہم لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ ہم نے دل اتنا تنگ کرلیا ہے کہ دعا کے لیے جب بیٹھتے ہیں تو اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے تو مانگتے ہیں، لیکن کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ساری امت اور ساری انسانیت کے لیے مانگیں، حالاں کہ ہمیں اپنی جیب سے تو کچھ دینا نہیں ہے، صرف مانگنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہی کرنی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہنا ہے: اے باری تعالیٰ! سب کو نوازیئے۔ اور جس کو کہا جا رہا ہے وہ تو ویسے بھی دینے والا ہے، اس کے خزانے

بھرے ہوئے ہیں۔ جب وہ ہمارے مانگنے پر ہماری ضرورتیں پوری کرے گا، تو ہمارے اسی مانگنے پر ساری دنیا کی ضرورتیں بھی پوری کرے گا، بلکہ وہاں تو وعدہ یہ ہے کہ آدمی اگر تنہا اپنے لیے مانگے، تو ہوسکتا ہے کہ اس پر نہ دیا جائے۔ لیکن اگر وہ کسی اور کے لیے مانگتا ہے، تو فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں اور کہتے ہیں: ''وَلَكَ مِثْلُهُ'' اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اتنا ہی دے۔ تو مانگنے میں بھی ہم اپنے دلوں کی تنگی کو ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ جب مانگنے ہی کے لیے بیٹھے ہیں تو پھر تنگی کیوں کی جائے، ساری دنیا کے لیے مانگو اور خوب مانگو۔ اسی طرح نیکی کے کاموں کا ارادہ کرنے کا بھی حال ہے۔

پچھتّر ہزار مکاتب

حضرت حاجی فاروق صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، چند سال پہلے ہی انتقال ہوا، انہوں نے ایک بات فرمائی کہ ڈھاکہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ حافظ جی حضور کے نام سے مشہور تھے، بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے وہاں کی غریب آبادیوں اور دیہاتوں کے اندر مکاتب قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے بھی بلایا تو میں وہاں گیا، تو انہوں نے کہا: میں نے پچھتّر ہزار (۷۵۰۰۰) مکاتب قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور وہ اس لائن سے کام بھی کر رہے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) مکاتب ہی قائم کر سکے تھے، لیکن دنیا سے گئے تو ثواب تو پچھتّر ہزار (۷۵۰۰۰) مکاتب کا لے کر گئے۔ اتنا آسان مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں تنگی ہے۔

غور وفکر کی بات

جب آدمی دنیا میں آتا ہے تو سوچو کہ کیا لے کر آتا ہے؟ خالی ہاتھ آتا ہے، اور

جب جائے گا تب بھی خالی ہاتھ جائے گا، اپنے ساتھ پیسے لے کر نہیں جائے گا۔ اب شیطان آدمی کو دھوکہ میں ڈالتا ہے ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ﴾ شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے یعنی آدمی کو یہ فکر دلاتا ہے کہ تمہارا سارا مال ختم ہو جائے گا؛ تو تمہارے بچے کیا کھائیں گے؟ اگر تم خرچ کر دو گے تو تمہارے پاس کیا رہے گا؟

دیکھو! دنیا میں جتنے بھی نیکی کے کام ہو رہے ہیں، مسجدیں بن رہی ہیں، مدرسے اور مکاتب قائم ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریبوں، بیواؤں، مسکینوں کی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، بیماروں کے لیے ہسپتال قائم کروا رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ضرورت مندوں کی ضرورتوں کے اور نیکی کے جتنے بھی کام ہو رہے ہیں، سب اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کے ہاتھ سے کروا ہی رہا ہے، کوئی کام رُکا ہوا نہیں ہے۔ اگر کہیں مسجد بن رہی ہے اور مَیں یا آپ پیسہ نہیں دیں گے، تو ایسا نہیں ہے کہ وہ مسجد نہیں بنے گی؛ مسجد تو کھڑی ہو کر رہے گی۔ اگر ہسپتال بن رہا ہے، اور میں یا آپ پیسہ خرچ نہیں کریں گے تو ایسا نہیں ہے کہ ہسپتال نہیں بنے گا؛ ہسپتال تو ضرور بنے گا۔ غریبوں کا علاج معالجہ ہوگا، یتیموں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کی جتنی بھی جگہیں ہیں، وہاں ہمارے نہ دینے سے، یا ہمارے ہاتھ کھینچ لینے سے، یا ہمارے دل کی تنگی سے کوئی کام رکنے والے نہیں ہیں، بلکہ اس طرح کے سب کام ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سب کام کروا رہے ہیں تو اگر ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ لیں کہ: اے اللہ! تیرے یہ سب کام جن کے تو نے فیصلے کیے ہیں اور دنیا میں ہو رہے ہیں، مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں، مدارس قائم ہو رہے ہیں، مکاتب بنائے جا رہے ہیں، ہسپتالیں قائم ہو رہی ہیں، غریبوں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں، بیماروں کے علاج معالجے ہو رہے ہیں، اور رفاہِ عام کے سینکڑوں کام دنیا

میں ہو رہے ہیں اور اے اللہ! تو اپنے خزانوں سے دیتا ہے، اپنی مخلوق ہی میں سے کسی نہ کسی کو تو واسطہ بنا رہا ہے، تو اے اللہ! تیرا احسان اور فضل ہوگا اگر تو مجھے بھی ان کاموں کے لیے واسطہ بنالے۔ اگر ہم یہ دعا کرلیں تو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کیا کمی ہے؟

دل کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے

اصل تو یہ ہے کہ ہمارا ہی دل تنگ ہے، اپنے دل کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ نیکی کے کاموں میں خرچ کر رہے ہیں، ہسپتال قائم کروا رہے ہیں، غریبوں کے علاج ومعالجہ پر ہزاروں لاکھوں خرچ کرنے والے دنیا میں موجود ہیں۔ حاجی ابراہیم صاحب یہاں موجود ہیں، ان سے پوچھ لو! ایسے ایسے لوگ آتے ہیں اور کہہ جاتے ہیں کہ ہماری طرف سے پچاس لاکھ، اور ایک کروڑ لیجیے۔ تو کیا جنہوں نے یہ پیسے دئے ہیں وہ غریب ومحتاج ہو گئے؟ کیا ان کی اولاد نعوذ باللہ لوگوں کے سامنے بھیک مانگ رہی ہیں؟ نہیں۔ بلکہ جتنا انہوں نے دیا، اللہ تعالیٰ نے اس سے زیادہ ان کو دیا۔ آپ پہلے پڑھ ہی چکے ہیں کہ فرشتے دعا کرتے ہیں: ''أَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں جن کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ روزانہ دعا کرتے رہیں: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اچھا بدلہ عطا فرما۔

یہ شانِ کریمی کے خلاف ہے

اور دیکھو! اللہ تعالیٰ تو ایسے کریم ہیں کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کے خلاف ہے کہ بندہ تو نقد دے اور اللہ تعالیٰ صرف ادھار وعدہ کرتا رہے؛ ایسا نہیں ہوسکتا۔ آخرت میں تو اللہ تعالیٰ دے گا ہی؛ دنیا میں نقد بدلہ بھی دیتا ہے۔ جو خرچ کرتے ہیں ان سے جا کر پوچھ لو۔ اس لیے آدمی یوں نہ سمجھے کہ خرچ کرنے سے کمی

آئے گی۔ یہ شیطانی دھوکہ ہے، شیطان آدمی کو ورغلاتا ہے۔ آدمی جتنا خرچ کرے گا وہ اس کے فائدہ کی چیز ہے، اور اس سے کمی آنے والی نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اضافہ ہی کریں گے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے قصے تو آپ حضرات نے سنے ہی ہوں گے۔ وہ لوگ تو ایسے تھے کہ اپنی ذات پر ایک پائی بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے تھے، لیکن اللہ کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ حضرت عثمان، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما اور ان کے بعد دنیا میں جتنے بھی اسخیاء گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کے راستہ میں بے شمار دولت خرچ کی ہے؛ کیا ان کی دولت گھٹ گئی؟ نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا کہ مرتے وقت جو چھوڑا اس کی تقسیم کرنے والوں کے لیے حساب کرنا مشکل ہوگیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ان کی وراثت تقسیم ہوئی تو سونا کلہاڑی سے توڑا گیا (جس کا تفصیلی قصہ جلد: ۳/ ص: ۱۰۳ تا ۱۱۰ پر قابلِ مطالعہ ہے۔ مرتب۔)

بہر حال! یہ چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حلال خرچ کرنے کی برکت

۵۶۱:- وعنه قال قال رسول اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، فَإِنَّ اللهَ يَقْبَلُهَا بِيَمِينِهِ، ثُمَّ يُرَبِّيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ. (متفقٌ علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی نے اللہ کے راستہ میں ایک کھجور کے برابر حلال کمائی میں سے صدقہ کیا، اور چوں کہ اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ (بڑی خوشنودی کے ساتھ) اپنے دائیں ہاتھ سے لیتے ہیں، پھر اس خرچ کئے ہوئے کو دینے والے ہی کے لیے بڑھاتے ہیں جیسے تم میں

سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے کے بچے، یا گائے کے بچھڑے کو پالتا اور اس کی پرورش کرتا ہے۔

افادات:- کھجور کا ایک دانہ کیا حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن یہاں ایک ہی دانہ کا تذکرہ ہے، اور قید ہے کہ حلال کمائی میں سے ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول کرتا ہے، حرام کو قبول نہیں کرتا۔

آج ہمارے اس زمانہ میں ایک اور مصیبت آ گئی ہے کہ بہت سے لوگ یوں سوچتے ہیں کہ غلط طریقہ سے دولت حاصل کرلو، بعد میں اس کا کچھ حصہ نیکی کے کاموں میں خرچ کر دیں گے۔ اس طرح کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ کمائی کی دھلائی ہوگئی اور کفارہ ہوگیا۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث اور فقیہ گزرے ہیں، بڑے بزرگ بھی ہیں، ان کا مقولہ ہے: جو آدمی حرام کمائی میں سے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے ناپاک کپڑے کو پیشاب سے دھوکر پاک کرنے کی کوشش کرے۔ حالاں کہ ناپاک کپڑا پیشاب کے ذریعہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا، اس کو پاک کرنے کے لیے پانی ہی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح حرام کمائی سے جو صدقہ دیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہی نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو پاکیزہ ہی کو قبول کرتا ہے۔ اگر کوئی آدمی غلط چیز لا کر ہمیں دے، اور بعد میں معلوم ہو؛ تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ کیا ہم اس کو منظور رکھیں گے؟ نہیں۔ جب ہماری اور آپ کی غیرت اس بات کو گوارہ نہیں کرتی؛ تو اللہ تعالیٰ کیسے قبول کریں گے؟۔

جب کھجور کا ایک دانہ پہاڑ بن جاتا ہے!

اگر ہم پاکیزہ اور حلال کمائی میں سے ایک کھجور کا دانہ بھی صدقہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بڑی خوشنودی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ سے لیتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کے یہاں دائیں بائیں کا کوئی فرق نہیں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ دائیں ہی ہیں (۱)

(ثُمَّ یُرَبِّیْهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا یُرَبِّیْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ) اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرنے بعد خرچ کرنے والے کے لیے اس کو بڑھاتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے کے بچے، یا گائے کے بچھڑے کو پالتا اور اس کی پرورش کرتا ہے'' یہاں تشبیہ گھوڑے کے بچھڑے کے ساتھ اس لیے دی گئی ہے کہ اس کی نشو ونما بہت تیزی کے ساتھ ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ صدقہ کی ہوئی کھجور کو اتنا جلدی بڑھاتا ہے کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ کہاں کھجور کا صرف ایک دانہ اور کہاں پہاڑ! مطلب یہ ہے کہ ایک معمولی چیز بھی اگر آپ نے اللہ کی راہ میں خرچ کی ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو بڑھا کر بہت زیادہ کر دیا جاتا ہے، اور اس میں نہایت برکت ہوتی ہے۔

ایک تہائی خرچ کرنے کی برکت

۵۶۲:- وعنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي بِفَلَاةٍ مِنَ الْأَرْضِ، فَسَمِعَ صَوْتًا فِي سَحَابَةٍ: اسْقِ حَدِيقَةَ فُلَانٍ، فَتَنَحَّى ذَلِكَ السَّحَابُ فَأَفْرَغَ مَاءَهُ فِي حَرَّةٍ، فَإِذَا شَرْجَةٌ مِنْ تِلْكَ الشِّرَاجِ قَدِ اسْتَوْعَبَتْ ذَلِكَ الْمَاءَ كُلَّهُ، فَتَتَبَّعَ الْمَاءَ، فَإِذَا رَجُلٌ قَائِمٌ فِي حَدِيقَتِهِ يُحَوِّلُ الْمَاءَ بِمِسْحَاتِهِ، فَقَالَ لَهُ: يَا عَبْدَ اللهِ! مَا اسْمُكَ؟ قَالَ: فُلَانٌ للاسم الذي سَمِعَ فِي السَّحَابَةِ. فقال له: يا عبد الله! لِمَ تَسْأَلُنِي عَنِ

اسْقِ؟ فَقَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ صَوتًا فِي السَّحابِ الَّذِي هَذَا مَاؤُهُ، يقولُ: اسْقِ حَدِيقَةَ فُلاَنٍ لاسمِكَ، فَمَا تَصْنَعُ فِيهَا؟ فَقَالَ: أَمَا إِذ قلتَ هَذَا، فَإِنِّي أَنْظُرُ إِلَى مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، فَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهِ، وَآكُلُ أَنَا وَعِيَالِي ثُلُثاً، وَأَرُدُّ فِيهَا ثُلُثَهُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: ایک آدمی ایک ویران صحراء میں سے گزر رہا تھا، اوپر سے ایک بادل گزرا، اس آدمی نے اس بادل میں سے آواز سنی، کوئی اس بادل کو کہہ رہا تھا: فلاں آدمی کے باغ اور کھیتی کو پانی پلا اور سیراب کر۔ یہ آواز اس آدمی نے بھی سنی، اس کے بعد اس نے دیکھا کہ اس بادل میں سے ایک ٹکڑا الگ ہو گیا اور آگے جا کر اس کا پورا پانی ایک پتھریلی زمین پر برسا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی نالیاں اور ایک نہر بنی ہوئی تھی، وہ سارا پانی جمع ہو کر ان نالیوں کے اندر آ گیا اور اس نہر میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ آدمی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تا کہ دیکھے کہ یہ پانی کہاں جاتا ہے۔ آگے جا کر دیکھا تو ایک آدمی اپنے باغ میں پھاوڑا لے کر اپنے باغ میں پانی داخل کر رہا تھا اور پھاوڑے کے ذریعہ سے پانی کا رخ اپنے باغ کی طرف پھیر رہا تھا۔ اس آدمی نے اس باغ اور باڑی والے سے پوچھا: او بھائی! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: میرا نام یہ ہے۔ اس کا وہی نام تھا جو اس نے بادل کے اندر سے سنا تھا۔ اس باغ والے نے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے میرا نام کیوں پوچھ رہا ہے؟ تجھے کیا ضرورت پیش آئی؟ اس نے کہا: اس نالی کے ذریعہ سے جو پانی آ رہا ہے اور تو نے پھاوڑے سے اس کا رخ پھیر کر اپنے باغ کے اندر داخل کیا ہے، یہ پانی جس بادل سے برسا، اس بادل میں سے تیرے نام کے ساتھ یہ آواز آئی تھی۔ (گویا کوئی کہنے والا اس بادل سے کہہ رہا تھا کہ فلاں کے کھیت کو پانی پلا اور تیرا ہی نام لیا تھا۔) اب تو بتا کہ آخر کون سی بات ہے جس کی وجہ سے

تیرے لیے یہ سارے انتظامات ہو رہے ہیں؟ تیرے اندر وہ کون سی ایسی خوبی ہے؟ اس نے کہا: بھائی دیکھ! جب تو نے یہ بات مجھے بتلا ہی دی؛ تو اب میرے لیے بھی ضروری ہو گیا کہ میں کیا کرتا ہوں وہ تجھے بتلا دوں۔ اس کھیتی میں جو کچھ پیداوار ہوتی ہے، مَیں اس کے تین حصے کرتا ہوں۔ ایک تہائی حصہ تو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہوں۔ ایک تہائی مَیں اور میرے بال بچے کھاتے ہیں۔ ایک تہائی حصہ جمع رکھتا ہوں تا کہ آئندہ سال اس کو دوبارہ بونے کے کام میں لاؤں۔

دیکھو! پورا مال صدقہ نہیں کرتا تھا؛ بلکہ تیسرا حصہ خرچ کرتا تھا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے یہ سارے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنی کمائی کے اندر سے کچھ حصہ مقرر کر لے جو اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جاتا ہو۔

ہمارے اسلاف کا عمل

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ: حضرت کے پاس جو کچھ آتا تھا اس کے تین حصے کر لیتے تھے، اس میں سے ایک حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا کرتے تھے۔

خود حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ان کے صاحبزادے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ والد صاحب کا یہی معمول تھا۔ آدمی کے پاس جو پیسے آتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جس میں آدمی کی محنت کو دخل ہوتا ہے، اور دوسرے وہ جو بغیر محنت کے آئیں، مثلاً آپ ملازمت، تجارت، یا محنت مزدوری کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں کچھ پیسے آتے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ کسی نے ہدیہ دیا، کوئی چیز بھیج دی۔ تو محنت کے نتیجہ میں جو آتا، اسی وقت اس کا بیسواں حصہ الگ کر لیتے تھے، مثلاً دس روپے کا نوٹ ہے، اس کا بیسواں حصہ یعنی پچاس پیسے

نکال کر الگ کر لیتے تھے۔ یہ نہیں سوچتے تھے کہ ابھی کھلے نہیں ہیں تو بعد میں الگ کر لیں گے؛ بلکہ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ جس وقت وہ ہاتھ میں آتا تھا اور کھلے پاس ہوتے تو اسی وقت الگ کر دیتے۔ اور اگر کھلے نہیں ہوتے تو بڑے اہتمام کے ساتھ اسی وقت آدمی کو بازار بھیج کر کھلے کرواتے، اور اس میں سے بیسواں حصہ الگ کر دیتے۔ اور جو مال بغیر محنت کے آتا تھا اس کا دسواں حصہ الگ کرتے تھے۔ اور ایک تھیلی الگ ہی رکھی تھی، جو رقم بھی الگ کرتے، اس تھیلی میں ڈالتے رہتے تھے، پھر نیکی کے کاموں میں جہاں کہیں خرچ کرنے کی نوبت آتی؛ اس میں سے خرچ کرتے رہتے اس لیے ہر آدمی کو چاہئے کہ ایسا کوئی انتظام کرلے، پھر اہتمام سے اس پر عمل کرے۔

نفس کا مکر اور اس کی پکڑ

اور نفس پر ذرا بھی اطمینان نہیں ہے۔ بہت سی مرتبہ ہم سوچتے ہیں کہ بعد میں یہ کام کرلیں گے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرے، اس میں دیر نہ کرے، معلوم نہیں کہ کب دل پلٹ جائے۔ اور اگر دل نہ پلٹے تب بھی شیطان اس میں کچھ نہ کچھ کمی تو کرواہی دیتا ہے، مثلاً: پہلے ہزار روپے خرچ کرنے کی نیت کی تھی، لیکن خرچ کرتے وقت شیطان ہزار کے بجائے پانچ سو، یا سو پچاس تو کم کرواہی دے گا۔ بہت سی مرتبہ تو بالکل ہی ختم کروا دیتا ہے۔ دل میں یہ خیال اور وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ کام فرض تو ہے نہیں، نفل ہی ہے نا، ابھی نہیں بلکہ بعد میں خرچ کریں گے۔ مگر دیکھو ایک بات یاد رکھنا! آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل میں جو معاملہ کرتا ہے، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے آدمی لوگوں کو تو دھوکہ دیتا ہی ہے، اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں بھی یہی چالاکی کرنے کی

سوچتا ہے۔ مثلاً: دل میں نیت کرتا ہے کہ میرے اس سودے میں نفع ہو گیا تو میں اس کا دس فیصد (۱۰٪) فلاں نیکی کے کام میں خرچ کروں گا۔ اب جتنا سوچا تھا اسی کے مطابق نفع ہو گیا، جب نفع ہاتھ میں آیا تو اب سوچتا ہے کہ نفع ایک لاکھ ہوا، تو دس فیصد تو دس ہزار ہو جاتے ہیں۔ پہلے جب دس فیصد بول رہا تھا، اس وقت نہیں سوچا تھا، اب سوچ رہا ہے کہ دس ہزار نکالنا تو مشکل ہے۔ لہٰذا دل ہی دل میں اِدھر اُدھر کی تاویل کرنا شروع کرتا ہے، اور کسی نہ کسی طرح دس ہزار میں کمی کر ہی ڈالتا ہے۔ بعض تو ایسے ہیں کہ کہہ دیتے ہیں کہ بعد میں دیں گے۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ دس ہزار کے پانچ ہزار کر ڈالتے ہیں۔ لیکن دیکھو بھائی! اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کون سی کمی ہے؟ اگر نہیں دینا ہے تو پانچ ہزار بھی کیوں خرچ کرتے ہو؟ یہ دے کر کیا اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان کر رہے ہو؟ نعوذ باللہ! کیا اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی ہے، اس لیے پانچ ہزار بھی دے رہے ہو؟

نیت کا اثر...... سبق آموز قصہ

ایک قصہ یاد آیا، حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (جو ہمارے تمام بزرگوں کے شیخ ہیں اور ہمارے اکثر سلسلے وہیں ملتے ہیں، ان) کے شیخ تھے۔ جس زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون میں خانقاہ کی مسجد میں آ کر قیام پذیر ہوئے، اس وقت مسجد کو درست کرنے اور اس میں کمرہ وغیرہ بنانے کی ضرورت تھی۔ ایک آدمی حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دعا کے لیے آیا، اس کی جائیداد پر کوئی دوسرا قابض ہو گیا تھا اور اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے آ کر حافظ نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے دعا کی درخواست کی کہ: حضرت! دعا فرما دیجئے کہ جائیداد پر دوسرا آدمی قابض ہو گیا ہے، مقدمہ چل رہا ہے، اللہ

تعالیٰ اس کے ہاتھ سے چھڑا دے، اور مجھے کامیابی دے۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بھائی دیکھو! ہمارے حاجی صاحب کی مسجد میں کمرہ نہیں ہے، ان کو فلاں فلاں ضرورت ہے (جو جو ضرورت تھی وہ ساری بتائی) وہ کام تم کرا دو، ہم تمہارے لیے دعا کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس نے کہا: حضرت! ضرور کرا دوں گا۔ حضرت نے دعا کر دی اور وہ مقدمہ میں کامیاب ہو گیا، واپس آ کر اطلاع بھی دی۔ اب اس کے دل میں چور آیا، اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ بہت سارا کام ہے، چلو! ایسا کرتا ہوں کہ آدھا بنا دوں۔ ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ کورٹ سے آدھی جائیداد چھوڑنے کا آرڈر آ گیا۔ اس نے آ کر حافظ صاحبؒ سے کہا: حضرت! جائیداد تو آدھی ہی چھوٹی۔ حضرت نے فرمایا: کیا کریں! یہ تو تمہارے اختیار میں تھا۔ ہم نے تو دعا پوری کے لیے کی تھی، تم نے اپنے ہی ہاتھ سے اس کو آدھا کروا دیا۔ تم نے اپنی نیت بدل دی، تو وہاں سے فیصلہ بھی ایسا ہی ہو گیا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی سوچتا ہے کہ ابھی نہیں دیتے، بعد میں دیں گے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ابھی دوسرا سودا بھی تو آنے والا ہے۔ اس لیے آدمی کو شیطان کے دھوکہ میں نہیں آنا چاہیے۔ شیطان آدمی کو فقر سے ڈراتا ہے، کہتا ہے کہ تم اتنا سب خرچ کرو گے تو مال کم ہو جائے گا، ابھی فلاں ضرورت باقی ہے، پہلے وہ پوری کر لو بعد میں دوسرا مال بھی تو آنے والا ہے، اس وقت نکال لیں گے۔ اور شیطان تم کو برائی کا (یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرنے کا) حکم کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو شیطان کی باتوں پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلنَّھْیُ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ

بخل اور لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت

۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱ر جولائی ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

بخل وشح کا معنیٰ

نیا باب قائم کیا ہے: ''النَّھۡیُ عَنِ الۡبُخۡلِ وَالشُّحِّ'' ''بخل'' سخاوت کی ضد ہے، یہ بھی نفس کی ایک بیماری ہے کہ آدمی کی طبیعت میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا مزاج نہ ہو۔ دوسری چیز ''شُح'' ہے جو بخل ہی کی ایک قسم ہے لیکن اور زیادہ خطرناک ہے کہ مزاج میں بخل بھی ہو اور ساتھ میں حرص اور لالچ بھی ہو، جیسے بعض لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج کے اندر خرچ کرنے کا مادہ تو نہیں ہوتا، لیکن ساتھ میں حرص بھی ہوتی ہے۔ تو ایسا بخل جو حرص کے ساتھ ملا ہوا ہو؛ اسی کو ''شح'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جہنم کا راستہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَمَّا مَنۡ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰی وَکَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی﴾ جس نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے بخل کیا اور آخرت کی طلب سے بے پرواہی برتی۔ خرچ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں جو بدلہ ملنے والا ہے اس کو جھٹلایا، یعنی اس پر یقین نہیں کیا؛ تو ہم اس کے لیے جہنم کا راستہ آسان کر دیں گے ﴿وَمَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُ مَالُہٗ إِذَا تَرَدّٰی﴾ جب اس کی ہلاکت کا وقت آئے گا تو اس کا مال

کچھ بھی کام نہ دے گا۔ آدمی اس امید پر مال جمع کرتا ہے کہ وقت پر کام آئے گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہونے لگتی ہے تو پھر وہ کام نہیں دیتا۔

نعمتیں صحیح جگہ استعمال نہ کرنے کی نحوست

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں میں خرچ کرنے کا وقت آتا ہے (اور اس کے سامنے مطالبہ بھی رکھا گیا) پھر باوجود خرچ کرنے کی استطاعت کے خرچ نہیں کرتا؛ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور گناہ کے کاموں میں خرچ کرنے کی نوبت آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو ترغیب دی جاتی ہے، ان کے پاس پیسے بھی موجود ہوتے ہیں، خرچ بھی کر سکتے ہیں، لیکن نہیں کرتے؛ ایسے لوگوں کے پیسے پھر مقدمہ بازی اور ڈاکٹروں کے یہاں، وکیلوں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں۔ یا ان کی اولاد ایسی ناہنجار نکلتی ہے کہ وہ اس مال کو جوّے سٹے اور گانے بجانے میں استعمال کر دیتی ہے۔ مال جب نیکی کے کام میں خرچ نہیں ہوگا تو گناہ کے کام میں خرچ کرنے کی نوبت آئے گی۔

اسی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، آپ نے فضائلِ حج میں سنا ہوگا کہ جب کسی آدمی پر حج فرض ہو جاتا ہے، پھر وہ کسی دنیاوی کام کی وجہ سے حج کے لیے نہیں جاتا، یہ سوچتا ہے کہ آئندہ سال جائیں گے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: لوگ حج کر کے آ جائیں گے اور اس کا دنیاوی کام ابھی تک نہیں ہوا ہوگا۔ جس کام کے لیے حج کو ٹالا تھا، وہ کام بھی نہیں ہوا اور حج بھی رہ گیا۔ اور جو آدمی اپنے پاؤں کو اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرنے کے لیے مشقت نہیں دیتا، تو پھر اس کے پاؤں گناہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اب ہمارے اختیار کی بات ہے کہ ہم اپنے لیے کون سی راہ چنتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور جو آدمی اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا؛ وہی کامیاب ہے۔

ظلم و شح سے بچو

۵۶۳:- وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: اِتَّقُوا الظُّلْمَ، فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَاِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلٰى أَنْ سَفَكُوْا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ظلم وزیادتی سے، اور کسی کا حق مارنے سے بچو؛ کیوں کہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل اختیار کرے گا۔ اور وہ بخل جو حرص ولالچ کے ساتھ ملا ہوا ہو، اس سے بھی بچو؛ اس لیے کہ اسی بخل نے جو لالچ کے ساتھ ہوتا ہے، تم سے اگلوں کو ہلاک کیا کہ انہوں نے اسی کے نتیجہ میں خون بہائے، آپس میں قتل وقتال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت آئی۔ اور اسی بخل وحرص کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرلیا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ایسا بخل جو لالچ کے ساتھ ہو، یہ ایک ایسی برائی اور ایسا رذیلہ اور دل کی ایسی بری صفت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی بہت سے گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ جب آدمی بخل کی وجہ سے کسی کا حق ادا نہیں کرے گا، کسی کا مطالبہ پورا نہیں کرے گا، مثلاً: بھائی کا یا پارٹنر کا حق دبا کر بیٹھا ہے وہ نہیں دیتا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لڑائی ہوگی، خون خرابہ ہوگا، آپس میں جھگڑے کی نوبت آئے گی۔ اس کے بالمقابل طبیعت اور مزاج میں انفاق اور سخاوت کا مادہ ہے، تو پھر ان ساری برائیوں کی نوبت نہیں آئے گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان ساری چیزوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بَابُ الْإِيْثَارِ وَالْمُوَاسَاةِ

ایثار اور غم خواری

بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا كَثِيۡرًا۔ أما بعد:-

﴿وَيُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۹) ﴿وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّأَسِيۡرًا﴾ (الدھر:۸)

ایثار اور مواسات کا مطلب

باب کا عنوان قائم کیا ہے: باب الإيثار والمواسات ''ایثار'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دے، مثلاً: کھانا موجود ہے، خود بھی بھوک لگ رہی ہے، طبیعت میں کھانے کا تقاضہ ہے، اس کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہوئے ان کو کھلا دے؛ اس کو ''ایثار'' کہتے ہیں۔ گجراتی میں اسی کو ''تیاگ بھاؤنا'' (ત્યાગ ભાવના) کہتے ہیں کہ وہ چیز خود استعمال کرنے کے بجائے دوسروں کے لیے چھوڑ دے، دوسروں کو اپنے مقابلہ میں ترجیح دے۔

''مواسات'' یعنی غم خواری۔ کسی مصیبت زدہ کی مصیبت میں آپ بھی شریک ہوجائیں؛ اسی کو ''مواسات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿يُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ﴾ وہ خود فاقہ سے اور ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اِس آیت کا شانِ نزول آگے

جو روایت آ رہی ہے اس میں بتلایا ہے۔ اس میں حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر انصار کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ ان حضرات کی شان یہ ہے کہ خود محتاج اور ضرورتمند ہوتے ہیں اس کے باوجود اپنے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَّ يَتِيْمًا وَّ أَسِيْرًا﴾ خود کھانے کی چاہت ہے، کھانے کی طرف میلان ہے، طبیعت میں تقاضہ موجود ہے، اس کے باوجود مسکین، یتیم کو اور قیدی کو کھلاتے ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے کرتے ہیں۔

بعضوں نے ''حُبِّهٖ'' میں ضمیر کو باری تعالیٰ کی طرف لوٹا کر کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بنیاد پر ان لوگوں کو کھلاتے ہیں۔

ایثار کرنے پر اللہ تعالیٰ خوش ہو گئے

ایثار کا وصف حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کیسا موجود تھا اس کو اس روایت میں بتلاتے ہیں۔

۵۶۴:- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبيِّ صلى الله عليه وآله وسلم فَقَالَ: إِنِّي مَجْهُودٌ، فَأَرسَلَ إِلَى بَعْضِ نِسَائِهِ، فقالت: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا عِنْدِي إِلاَّ مَاءٌ، ثُمَّ أَرْسَلَ إِلَى أُخْرَى، فَقَالَتْ مِثْلَ ذَلِكَ، حَتَّى قُلْنَ كُلُّهُنَّ مِثْلَ ذَلِكَ: لاَ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا عِنْدِي إِلاَّ مَاءٌ. فَقَالَ النبي صلى الله عليه وآله وسلم: مَنْ يُضِيفُ هَذَا اللَّيْلَةَ؟ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الأَنْصَارِ: أَنَا يَا رسولَ الله. فَانْطَلَقَ بِهِ إِلَى رَحْلِهِ، فقَالَ لاِمْرَأَتِهِ: أَكْرِمِي ضَيْفَ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم.

وفي روايةٍ قَالَ لاِمْرَأَتِهِ: هَلْ عِنْدَكِ شَيءٌ؟ فَقَالَتْ: لاَ! إِلاَّ قُوتَ

صِبيَانِي. قَالَ: فَعَلِّلِيهِمْ بِشَيْءٍ، وَإِذَا أَرَادُوا الْعَشَاءَ فَنَوِّمِيهِمْ، وَإِذَا دَخَلَ ضَيْفُنَا فَأَطْفِئِي السِّرَاجَ، وَأَرِيهِ أَنَّا نَأْكُلُ. فَقَعَدُوا وَأَكَلَ الضَّيْفُ، وَبَاتَا طَاوِيَيْنِ. فَلَمَّا أَصْبَحَ غَدَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: لَقَدْ عَجِبَ اللهُ مِنْ صَنِيعِكُمَا بِضَيْفِكُمَا اللَّيْلَةَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں مصیبت زدہ ہوں، مجھے فاقہ اور مصیبت لاحق ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (اس کی ضرورت کو اپنی طرف سے پورا کرنے کی خاطر) ایک آدمی کو اپنی ازواج میں سے ایک کے یہاں بھیجا (کہ اگر کچھ کھانے کی چیز ہو تو بھیج دو) انہوں نے جواب دیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے، میرے پاس سوائے پانی کے اور کچھ بھی نہیں ہے (وہ آدمی یہ جواب لے کر آیا) پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی دوسری زوجۂ مطہرہ کے یہاں آدمی بھیجا، انہوں نے بھی وہی جواب دیا، یہاں تک کہ تمام ازواجِ مطہرات نے یہی جواب دیا۔ (اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اور ازواجِ مطہرات کا گزر بسر کیسے ہوتا تھا) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کو آج کی رات مہمان بنا کر اپنے یہاں کون لے جاتا ہے؟ ایک انصاری نے کہا: اللہ کے رسول! میں اس کی میزبانی کا فریضہ انجام دوں گا۔ (روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے ہیں انہوں نے یہ پیشکش کی تھی) چناں چہ (وہ اس مصیبت زدہ صحابی کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گئے اور) اپنی بیوی سے کہا (کہ دیکھو! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مہمان ہیں) ان کا اکرام کرو (مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مہمان کے ساتھ ان کی خدمت گزاری، ان کے اکرام اور عزت واحترام کا جو معاملہ کرنا چاہیے، وہ پورے طور پر ملحوظ رہے) دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی

بیوی سے پوچھا: کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟ (یعنی گھر میں کوئی چیز ہے جو کسی کے سامنے پیش کی جا سکے؟) اس نے بتایا کہ سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہیں ہے (یعنی صرف بچوں کے کھانے کے لیے کچھ رکھا ہے) تو انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: بچوں کو جب کسی چیز کی ضرورت ہو، اور جب شام کا کھانا مانگیں تو ان کو بہلا پھسلا کر سلا دینا، اور رات کے وقت جب میں مہمان کو لے کر آؤں (اور ہم کھانے کے لیے بیٹھیں) اس وقت چراغ بجھا دینا (ہم مہمان کو ایسا تاثر دیں گے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں۔ چناں چہ جب مہمان آئے، سب کھانے کے لیے بیٹھے تو ان کی اہلیہ نے چراغ بجھا دیا) مہمان نے کھانا کھایا (اور یہ دونوں کھانے کا محض دکھلاوا کرتے رہے، جیسے ہاتھ میں لقمہ بنا کر منھ تک لے جاتے اور منھ ہلاتے رہتے) اس طرح خود بھوکے رہ کر رات گزاری۔ صبح کے وقت جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں وہ صحابی حاضر ہوئے تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات کو تم دونوں (میاں بیوی) نے اپنے مہمان کے ساتھ جو معاملہ اور سلوک کیا (جس ایثار سے کام لیا کہ تم خود بھی بھوکے اور ضرورت مند تھے اس کے باوجود خود کھانا کھانے کے بجائے مہمان کے لیے وہ کھانا پیش کر دیا، اور اپنے مقابلہ میں مہمان کو ترجیح دی) اس پر اللہ تعالیٰ بہت خوش اور راضی ہوئے

دو کا کھانا تین کو کافی ہے

۵۶۵:- وعنہ قَالَ: قَالَ رسول اللہ ﷺ: طَعَامُ الاثْنَيْنِ كَافِي الثَّلاَثَةِ، وَطَعَامُ الثَّلاَثَةِ كَافِي الأَرْبَعَةِ. (متفقٌ عَلَيْہِ)

وفی روایۃ لمسلمٍ: عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی ﷺ قَالَ: طَعَامُ الوَاحِدِ يَكْفِي الاثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الأَرْبَعَةَ، وَطَعَامُ الأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی ہوجاتا ہے، اور تین کا چار کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ ہے کہ ایک کا کھانا دو کو کافی ہوجاتا ہے اور دو کا چار کو اور چار کا آٹھ کو کافی ہوجاتا ہے۔

افادات:- اگر کھانا اتنا ہی ہو کہ دو آدمی شکم سیر ہو کر کھا سکیں، پھر اس کے اندر تیسرے کو بھی شریک کرلیا جائے، تو اگر چہ تینوں کا پیٹ گلے تک نہیں بھرے گا؛ لیکن اس کھانے میں سے تینوں اتنا کھالیں گے جس سے تینوں کی بھوک مٹ جائے گی اور ضرورت پوری ہوجائے گی۔

دراصل یہ ارشاد فرما کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غم خواری کی تعلیم دے رہے ہیں کہ دو آدمی اگر کھانا لے کر بیٹھے ہوں اور ان کو خیال ہو کہ ہم یہ کھانا شکم سیر ہو کر کھائیں گے تو ان کو چاہیے کہ تیسرا آدمی جو بھوکا اور ضرورت مند ہے، اس کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیں۔ گویا دوسرے کے غم اور تکلیف کو بانٹ لو، اس کے غم میں شریک ہوجاؤ، تھوڑی سی تکلیف اپنے اوپر لے لو۔ کسی کے ساتھ اس کے غم و مصیبت میں شریک ہوجانا؛ اسی کو مواسات اور غم خواری سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب دو آدمی اپنے کھانے میں تیسرے کو شریک کرلیں گے، یا تین آدمی چوتھے کو شریک کرلیں گے؛ تو یہ صفت اپنے اندر پیدا ہوجائے گی اور اسی کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترغیب دی ہے۔

ضرورت سے زائد کو خرچ کردو

۵۶۶:- وعن أبی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ فِي سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِذْ جَاءَ رَجُلٌ عَلَى رَاحِلَةٍ لَهُ، فَجَعَلَ يَصْرِفُ بَصَرَهُ يَمِيناً وَشِمَالاً، فَقَالَ رسول اللہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهْرَ لَهُ، وَمَنْ كَانَ لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ. فَذَكَرَ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ مَا

ذکر ،حَتّٰى رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں جارہے تھے، ایک آدمی اپنی سواری پر سوار ہو کر آیا، اور اپنی نگاہیں دائیں بائیں دوڑانے لگا (جیسے ضرورت مند آدمی اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو میری ضرورت کو پورا کر سکے؟) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جس کسی کے پاس زائد سواری ہو، وہ سواری کسی ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد توشہ (کھانے پینے کا سامان) ہو، وہ ایسے آدمی کو دے دے جس کے پاس کھانے پینے کا سامان موجود نہ ہو (حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر مال کی اور بھی انواع واصناف کو بیان کیا (جیسے اگر کسی کے پاس زائد بستر ہو تو ایسے آدمی کو دے دے جس کے پاس بستر نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس زائد کپڑے ہیں تو ایسے آدمی کو دے دے جس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال کی مختلف قسمیں بیان فرما کر یہی تاکید فرمائی کہ زائد مال ایسے آدمی کو دیدے جو اس کا ضرورت مند ہو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سن کر ہمیں یہ خیال ہونے لگا کہ آدمی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کسی بھی چیز (سواری، کھانا، کپڑا، بستر وغیرہ) میں خود اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

افادات:- اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس کے ذریعہ سے دوسرے ضرورت مند لوگوں کی حاجتوں کو پورا کریں۔ ویسے قرآنِ پاک میں بھی باری تعالیٰ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ باری تعالیٰ نے فرمایا: جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ سب خرچ کردو۔ ظاہر ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد جو زائد ہے اس کو پڑا رہنے دیں گے، تو اس سے آپ کی ضرورت تو پوری ہو نہیں رہی ہے، آپ کی

ضرورت کا جو تھا وہ آپ کے پاس موجود ہے، یہ تو زائد ہے، آپ اس کو دوسرے کے حوالہ نہیں کریں گے، اور نیکی کے راستہ میں خرچ نہیں کریں گے، تو وہ کسی کام کا نہیں ہے، اسی لیے اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

ایثار کا عملی سبق

۵۶۷:- وعن سهل بن سعد رضی اللہ تعالٰی عنہ أَنَّ أَمْرَأَةً جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِبُرْدَةٍ مَنْسُوجَةٍ، فَقَالَتْ: نَسَجْتُهَا بِيَدَيَّ لِأَكْسُوكَهَا، فَأَخَذَهَا النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُحْتَاجاً إِلَيْهَا، فَخَرَجَ إِلَيْنَا وَإِنَّهَا إِزَارُهُ. فَقَالَ فُلَانٌ: اكْسُنِيهَا مَا أَحْسَنَهَا! فَقَالَ: نَعَمْ. فَجَلَسَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِي الْمَجْلِسِ، ثُمَّ رَجَعَ فَطَوَاهَا، ثُمَّ أَرْسَلَ بِهَا إِلَيْهِ. فَقَالَ لَهُ الْقَوْمُ: مَا أَحْسَنْتَ! لَبِسَهَا النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُحْتَاجاً إِلَيْهَا، ثُمَّ سَأَلْتَهُ، وَعَلِمْتَ أَنَّهُ لَا يَرُدُّ سَائِلاً؟ فَقَالَ: إِنِّي وَاللهِ مَا سَأَلْتُهُ لِأَلْبَسَهَا، إِنَّمَا سَأَلْتُهُ لِتَكُونَ كَفَنِي. قَالَ سَهْلٌ: فَكَانَتْ كَفَنَهُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بُنی ہوئی ایک چادر لے کر حاضر ہوئی (جو اس نے خود تیار کی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ ایسی چادر تھی جس کے کناروں کو ذرا لچھے دار بنایا گیا تھا) اس نے وہ چادر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ چادر میں نے خود اپنے ہاتھ سے بُن کر تیار کی ہے؛ تاکہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی چادر بطورِ ہدیہ قبول فرمالی ایسی حالت میں کہ آپ کو خود اس کی ضرورت بھی تھی، پھر (دوسری مجلس میں جب) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپ اسی چادر کو لنگی کے طور پر زیب تن کیے ہوئے تھے (اس سے پتہ چلا کہ آپ کو ضرورت تھی۔ حضرت سہل رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مجلس میں تشریف لانے کے بعد)

ایک صحابی (بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے) نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ چادر تو بہت عمدہ ہے، آپ مجھے عنایت فرمادیجئے (بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چھوکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو بہت عمدہ ہے، مجھے عنایت فرمادیجئے) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہا: ٹھیک ہے (اسی وقت تو دے نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ آپ اس کو پہنے ہوئے تھے، اس لیے وعدہ فرمالیا) چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس مجلس میں جتنی دیر بیٹھنا تھا اتنی دیر تشریف فرما رہے، پھر آپ اٹھ کر (مکان میں) تشریف لے گئے اور وہ چادر (جو لنگی کے طور پر آپ زیبِ تن کیے ہوئے تھے اس کو نکال کر) لپیٹ کر ان صحابی کے پاس بھجوادی (جن سے آپ نے وعدہ کیا تھا۔ بعض روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی میں تو درخواست کرنے والے صحابی سے کسی نے کچھ نہیں کہا؛ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس مجلس سے اٹھ کر اپنے مکان میں تشریف لے گئے) تو لوگوں نے کہا: تم نے (حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس چادر کا جو مطالبہ کیا، یہ) ٹھیک نہیں کیا (تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں جب یہ چادر پیش کی گئی تو) آپ کو خود ہی چادر کی ضرورت تھی (شاید اسی وجہ سے آپ نے اس کو فوراً زیبِ تن کیا اور یہ جانتے ہوئے بھی تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مانگ لی) پھر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مانگتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کی بات کو رَد نہیں فرماتے (اگر وہ چیز موجود ہوتی ہے تو فوراً عنایت فرمادیتے ہیں، اور اگر نہیں ہوتی ہے تو وعدہ فرمالیتے ہیں۔ گویا تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس چادر کی درخواست کر کے حضور کو زحمت ومشقت میں ڈالا۔ اگر آپ کی ضرورت سے زائد چیز ہوتی تو کوئی بات بھی نہ تھی، لیکن یہ تو آپ کی ضرورت کی چیز تم نے لے لی۔ جب دوسرے صحابہ نے ان کو اپنی درخواست اور مطالبہ پر تنبیہ کی) تو

انہوں نے کہا (بھائیو دیکھو!) اللہ کی قسم! میں نے وہ چادر اپنے استعمال اور پہننے کے لیے نہیں مانگی ہے، بلکہ اس لیے مانگی تا کہ (آئندہ چل کر جب میری موت آئے تو یہ چادر) میرے کفن کے طور پر استعمال ہو۔ چناں چہ اس واقعہ کو نقل کرنے والے صحابی حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں (اس چادر کو انہوں نے محفوظ رکھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو) وہ چادر ان کے کفن کے طور پر استعمال ہوئی۔

افادات:- یہاں اس روایت کو پیش کر کے یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ دیکھو! خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس چادر کی ضرورت تھی، آپ کے پاس لنگی کے طور پر پہننے کے لیے اس وقت دوسری چادر نہیں تھی، اس کے باوجود آپ نے اپنے مقابلہ میں ان مطالبہ کرنے والے صحابی کو ترجیح دیتے ہوئے وہ چادر عنایت فرما دی۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو ایثار کا عملی سبق دیا۔

ایثار کرنے والوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اظہارِ تعلق

۵۶۸:- وعن أَبِي موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّ الأَشْعَرِيِّينَ إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغَزْوِ، أَوْ قَلَّ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ، جَمَعُوا مَا كَانَ عِنْدَهُمْ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ اقْتَسَمُوهُ بَيْنَهُمْ فِي إِنَاءٍ وَاحِدٍ بِالسَّوِيَّةِ، فَهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((أَرْمَلُوا)): فَرَغَ زَادُهُمْ أَوْ قَارَبَ الفَرَاغَ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اشعریین (قبیلۂ بنو اشعر کے لوگ) جب سفر میں جاتے ہیں اور ان کا توشہ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے، یا مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے (حالتِ حضر میں) جب ان کے یہاں کھانا کم ہو جاتا ہے تو جس کے پاس جو ہوتا ہے اس کو ایک کپڑے یا برتن میں جمع کر لیتے ہیں، پھر آپس میں

برابر تقسیم کر لیتے ہیں (ان کے اس وصف کو بیان فرمانے کے بعد حضور اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ) میں ان سے ہوں اور وہ مجھ سے ہیں۔

افادات:- ''اُشعر'' یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اُشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کے بھائی اور ان کے قبیلہ کے باون ترپن حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لیے یمن سے روانہ ہوئے، انہوں نے سمندری راستہ اختیار کیا، کشتی میں سوار ہوئے، بادبانی کشتی تھی، اتفاق کی بات کہ ہوا کا رخ بدل جانے کی وجہ سے مدینہ منورہ پہنچنے کے بجائے وہ حبشہ پہنچ گئے، وہاں پہلے سے کچھ مسلمان قیام پذیر تھے جو ہجرت کر کے وہاں پہنچے ہوئے تھے، ان سب کے امیر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، وہ لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ ۷ھ میں جب خیبر فتح ہوا اس وقت حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان تمام مسلمانوں کو- جو ہجرت کر کے حبشہ پہنچے ہوئے تھے- اپنے ساتھ لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے، اس وقت حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے، وہ سب خیبر حاضر ہوئے، وہاں حضور اکرم ﷺ سے ملاقات کی۔

اس روایت میں حضور اکرم ﷺ نے ان اشعری قبیلہ والوں کی ایک خوبی ذکر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی جماعت ایسی ہو کہ جس کے اندر کوئی ایسا وصف پایا جاتا ہو جو ان کے لیے خوبی اور کمال کا ہو، اور اس کے ذریعہ دوسروں کو امر خیر کے واسطے ترغیب بھی دی جا سکتی ہو، تو دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے کہ فلاں لوگ ایسا کرتے ہیں۔

دیکھو! کسی کے دکھ درد کو بانٹ لینا مواسات اور غم خواری کا وصف ہے۔ اور ظاہر ہے جب کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو، یا کسی کے پاس زیادہ ہو اور کسی کے پاس کم ہو، اور سب مل کر ساتھ دیں، تو تمام کی ضرورتیں آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں۔

اَلتَّنَافُسُ فِی أُمُوْرِ الآخرۃِ وَالإِسْتِکْثَارُ مِمَّا یُتَبَرَّکُ بِہٖ

آخرت کے کاموں میں سبقت لے جانے اور برکت والی چیز کو زیادہ حاصل کرنے کا اہتمام کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

باب کا عنوان

آخرت اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا، سبقت لے جانا۔ اور ایسی چیز جس سے برکت حاصل کی جاسکتی ہو اس کو زیادہ حاصل کرنے کی اگر کوئی آدمی کوشش کرے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی امور ایسے نہیں ہیں کہ ان میں لوگ ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً: فلاں کے پاس اتنی دولت ہے تو میں اس سے زیادہ دولت سمیٹ لوں۔ فلاں نے اتنا بڑا بنگلہ بنایا تو میں اس سے بڑا بنگلہ بنالوں۔ فلاں نے ایسے کپڑے پہنے ہیں تو میں اس سے بھی اچھے کپڑے پہن لوں۔ دنیا کی کسی بھی چیز میں مقابلہ آرائی کی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور آگے بڑھنے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے۔ ہاں! نیکی کے کاموں میں البتہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، آخرت کے کام ایسے ہیں کہ آپس میں سبقت کرنے والے، مقابلہ اور ریس کرنے والے اس میں ریس کرسکتے ہیں ﴿وَفِیۡ ذَالِکَ فَلۡیَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ﴾

برکت حاصل کرنے کا اہتمام

۵۶۹:- وعن سَھۡلِ بن سَعۡدٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: أَنَّ رسول اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أُتِيَ بِشَرابٍ،

فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلَامٌ، وَعَنْ يَسَارِهِ الأَشْيَاخ. فَقَالَ لِلْغُلَامِ: أَتَأْذَنُ لِيْ أَنْ أُعْطِيَ هؤُلَاءِ؟ فَقَالَ الغُلَامُ: لَا وَاللهِ يَارَسُولَ الله! لَا أُوثِرُ بِنَصِيبِي مِنْكَ أَحَداً. فَتَلَّهُ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِيْ يَدِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((تَلَّهُ)) بالتاءِ المثناة فوق: أَيْ وَضَعَهُ. وهذَا الغُلَامُ هُوَ ابنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مشروب لایا گیا، آپ نے اس میں سے نوش فرمایا اور (جو بچا اس کو دینے کے لیے پاس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے) اپنی داہنی جانب دیکھا تو ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہوا تھا اور آپ کی بائیں طرف معمر لوگ، عمر رسیدہ شیوخ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نوعمر لڑکے سے کہا: کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں میرا بچا ہوا ان کو دوں؟ اس پر اس نوعمر لڑکے نے کہا: (یہ آپ کا بچا ہوا بڑا متبرک ہے، یہ میرا حصہ ہے) اللہ کی قسم! اس کے بارے میں میں کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دوں گا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

افادات:- چوں کہ دائیں طرف ہونے کی وجہ سے اصولی طور پر اسی کو دینا چاہیے، جیسا کہ بعض روایتوں میں یہ ادب بتلایا ہے۔ دائیں طرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالٰی عنہ تھے اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں معمر تھے۔ اور یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے یہاں پیش آیا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ان دونوں حضرات - حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما - کی خالہ ہوتی ہیں۔ وہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے، پینے کی کوئی چیز آئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوش فرمایا اور بچے ہوئے کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ بچا ہوا ہے اور چوں کہ تم میری دائیں طرف ہو؛ اس لیے اس کے زیادہ مستحق تم ہی ہو اور حق

بھی تمہارا ہے، لیکن اگر اجازت دو تو مَیں ان کو دوں۔ اس پر انہوں نے کہا: آپ کا بچا ہوا بڑا متبرک ہے اور میرا حصہ ہے، اس کو میں کسی اور کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گلاس ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"فَتَلَّهٗ"، "تَلَّ" کا مطلب یہ ہے کہ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے قوت کے ساتھ کسی کے ہاتھ میں دینا، جس کو ہم "تھما دینا" کہتے ہیں۔

حالاں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا جس سے حضور کی منشاء معلوم ہوسکتی تھی کہ آپ کی بھی خواہش یہ تھی کہ ان کو دیا جائے، لیکن منشاء معلوم ہو جانے کے بعد بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں! میں خود ہی لینا چاہتا ہوں، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

برکت سے کوئی مستغنی نہیں

۵۷۰:-وعن أَبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: بَيْنَا أَيُّوبُ علیہ السلام يَغْتَسِلُ عُرْيَاناً، فَخَرَّ عَلَيْهِ جَرَادٌ مِنْ ذَهَبٍ، فَجَعَلَ أَيُّوبُ يَحْثِي فِي ثَوْبِهِ، فَنَادَاهُ رَبُّه -عز و جل-: يَا أَيُّوبُ! أَلَمْ أَكُنْ أَغْنَيْتُكَ عَمَّا تَرَى؟ قَالَ: بَلَى وَعِزَّتِكَ! وَلَكِنْ لاَ غِنى بِي عَنْ بَرَكَتِكَ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ حضرت ایوب علیہ السلام غسل خانے میں کپڑے نکال کر غسل فرما رہے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے اوپر سونے کی ٹڈیاں گریں، حضرت ایوب علیہ السلام ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑوں میں سمیٹنے لگے، باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو خطاب ہوا: اے ایوب! تم جو ٹڈیاں دیکھ رہے ہو، اس سے ہم نے تم کو مستغنی نہیں کر رکھا ہے؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا: اے باری تعالیٰ! تیری عزت کی قسم!

(آپ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آسمان سے آئی ہوئی یہ چیز بھی تو آپ کی نعمت اور برکت کی ہے؛ اور) میں آپ کی برکت کی اس چیز سے کیسے مستغنی ہوسکتا ہوں۔

افادات:- اگر غسل کرنے والا ایسی جگہ غسل کر رہا ہے جو تنہائی کی ہے جیسے: غسل خانہ؛ تو کپڑے اتار کر بھی غسل کر سکتے ہیں۔ ہاں! اگر لوگوں کے سامنے ہو تو پھر ستر ڈھانپا ہوا ہونا ضروری ہے۔

سونے کی ٹڈیاں جو گریں وہ یا تو باقاعدہ جاندار تھیں اور ان کا جسم اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے سونے کا بنادیا تھا۔ یا یہ کہ وہ زندہ نہیں تھیں بلکہ ان کی شکل و صورت ٹڈیوں کی طرح بنی ہوئی تھی۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑوں میں سمیٹنے لگے، تو یہ عمل بظاہر لالچ معلوم ہوتا ہے، اس لیے باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو خطاب ہوا: اے ایوب! تم جو ٹڈیاں دیکھ رہے ہو، اس سے ہم نے آپ کو مستغنی نہیں کر رکھا ہے؟ یعنی ہم نے آپ کو پہلے سے بہت کچھ دے نہیں رکھا ہے، اس کے ہوتے ہوئے ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑے میں سمیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری اتنی نعمتیں تمہارے پاس موجود ہیں، پھر کیوں اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا: باری تعالیٰ! آپ کی عزت کی قسم! آپ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آسمان سے آئی ہوئی یہ چیز بھی تو آپ کی نعمت اور برکت کی ہے۔ میں آپ کی برکت سے کیسے مستغنی ہوسکتا ہوں؟ پہلے جو آپ نے دے رکھا ہے اس کا بھی محتاج ہوں اور یہ نئی نعمت آئی اس کا بھی محتاج ہوں؛ اس لیے میں اپنے آپ کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔

فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ

شکر گزار مالدار کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:- ’’اِنۡ تُبۡدُوۡا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا ھِیَ الخ:

شکر گزار مالدار

ایک نیا عنوان قائم کررہے ہیں: وہ مالدار جو شکر گزار ہو اس کی کیا فضیلت ہے؟ آگے خود ہی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شکر گزار مالدار کسے کہتے ہیں: ’’وَھُوَ مَنۡ اَخَذَ الۡمَالَ مِنۡ وَجۡھِہٖ‘‘ وہ آدمی جو شریعت کے بتائے طریقہ کے مطابق مال حاصل کرے ’’وَصَرَفَہٗ فِیۡ وُجُوۡھِہِ الۡمَامُوۡرِ بِھَا‘‘ اور جہاں اس کو خرچ کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے وہیں خرچ کرے؛ ایسے صاحبِ مال کو شکر گزار مالدار کہا جاتا ہے۔

شکر کی حقیقت

شکر کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے، اگر وہ غیر اختیاری ہے، یعنی اس کے حاصل کرنے میں ہماری کسی کوشش ومحنت کو دخل نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ہماری کسی کمائی، محنت اور کوشش کے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، جیسے زندگی، جسم اور اس کے اندر لگے ہوئے سارے اعضاء، اور بھی بہت ساری نعمتیں ہیں جو انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر محنت وکوششِ حصول مل جاتی ہیں، ان کے اوپر شکر کا تقاضہ یہ ہے کہ ان نعمتوں کی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے جو حقوق لازم کئے ہیں،

جو ذمہ داریاں اس صاحبِ نعمت کے اوپر ڈالی ہیں، اور ان نعمتوں کی نسبت سے جو احکام دیئے ہیں ان کو پورے طور پر ادا کرے؛ یہی اس نعمت کا شکر ہے، ورنہ ان نعمتوں کو جہاں استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے وہاں استعمال کرنا؛ اس نعمت کی ناشکری ہے۔ یہ تو غیر اختیاری نعمتیں ہوئیں۔

اور جو اختیاری نعمتیں ہیں یعنی جن کو کوشش اور محنت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے ان میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ نہ دینا چاہیں؛ تو آدمی لاکھ کوشش کرے وہ نعمت حاصل ہی نہیں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ان نعمتوں کے حصول میں اور ان نعمتوں کے انسان تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ اس کی محنت و کوشش کو بھی دخل ہوتا ہے، تو اس سلسلہ میں شکر یہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی کو عمل میں لاکر حاصل کرے، اور اس کے نتیجہ میں جو بھی مل جائے، اس کو وہیں استعمال کرے جہاں شریعت کے اجازت دی ہے، اور اس سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو حقوق لازم کئے ہیں ان کو ادا کرے۔ اس میں کچھ حقوقِ واجبہ ہیں، کچھ حقوق مستحبات کے قبیل سے ہیں، تو جو بھی حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے، اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرنے سے بچے؛ یہی اس کا شکر ہے۔

شکر کا پہلا درجہ

اب جو غیر اختیاری نعمتیں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی، جسم عطا فرمایا اور جسم میں بے شمار اعضاء- آنکھیں، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، دل و دماغ وغیرہ- عطا فرمائے؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں ہیں جن میں ہمارے کسی اختیار کو دخل ہی نہیں، یہ سب نعمتیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے بغیر محنت کے عطا فرما رکھی ہیں، تو ان کے حاصل کرنے کے لیے تو ظاہر ہے کہ کوئی غلط طریقہ اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ اور جب یہ حاصل ہوچکی ہیں تو اب ان کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے، اور ان سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے؟

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی ان تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال ہونے سے بچائے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں تو ان کو جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، جیسے کہا گیا ہے کہ نامحرم کو مت دیکھو، بے ریش لڑکوں کو مت دیکھو، ناجائز تصویروں کو مت دیکھو؛ تو ان جگہوں پر استعمال نہ کرنا۔

اسی طرح زبان ہے؛ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے بولنے کی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے، تو اب اس زبان سے جتنی بھی نافرمانی کے کام ہوسکتے ہیں ان تمام کاموں سے آدمی اپنے آپ کو لازماً بچائے۔ یہی حال کانوں کا ہے؛ کانوں کی نعمت کے ذریعہ سے سننے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، تو ہم کانوں کو ایسی تمام چیزوں کے سننے سے روکیں جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے۔

نیکی یا گناہ کے مراحل پر بھی اجر وزجر

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نامحرم کو دیکھنا ہے۔ کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا نامحرم کی بات سننا ہے۔ زبان گناہ کرتی ہے اس کا زنا کسی نامحرم کے ساتھ بات کرنا ہے۔ شرمگاہ تو اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے (صحیح مسلم۔ باب قُدِّرَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظُّهُ مِنَ الزِّنَى وَغَيْرِهِ) یہ صرف ایک مثال دی گئی ہے کہ زنا ایک حرام کام ہے، اور اس کو تو آدمی اصالۃً اپنی شرمگاہ کے ذریعہ انجام دیتا ہے جو اس کا آخری درجہ ہے جہاں پہنچ کر یہ کام وجود میں آتا ہے، یہ تو زنا کا آخری درجہ ہے، یہاں جا کر تو زنا کا فائنل اور آخری نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادات کے ذریعہ سے ہماری رہنمائی فرمائی کہ آپ زنا کو صرف شرمگاہ تک محدود نہ سمجھئے، شرمگاہ تو اس کا آخری مرحلہ طے کراتی ہے، لیکن پہلے کے مراحل جو طے ہوتے ہیں اور ان کے لیے جن اعضاء کو استعمال کیا جاتا ہے، ان کو بھی زنا ہی کہا جائے گا، اسی لیے آنکھ کا زنا، کان کا زنا، زبان کا زنا، ہاتھ کا زنا؛ یہ الفاظ استعمال کئے گئے اور ان کو بھی اعضاء کا زنا بتلایا ہے۔

یہی طریقہ ہر چیز میں ہے، جیسے آدمی نماز کے لیے مسجد میں چل کر آئے گا، تو اس کے واسطے پاؤں کو استعمال کرے گا۔ تو چل کر آنا کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں ضائع جائے گا؟ اور ثواب صرف مسجد میں آکر نماز ادا کرنے پر ملے گا؟ حالاں کہ نماز تو مسجد میں آنے کے بعد ادا کی جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ نمازی جب غیر نماز والے ان کام کو انجام دے گا تب ہی تو نماز کو ادا کر پائے گا۔ ہم نے نماز کی ادائیگی کے لیے نماز سے پہلے جتنے بھی مراحل طے کئے، مثلاً غسل کیا، وضو کیا، کپڑے پہنے، گھر سے نکلے، چل کر مسجد میں آئے؛ یہ سب کام نماز کو ادا کرنے کے لیے ہی کئے، اور یہاں آکر دیکھا کہ ابھی تو جماعت میں دیر ہے پھر نماز کے انتظار میں بیٹھے، حالاں کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا ہمارے لیے بہت دشوار ہوتا ہے، اسی لیے تو شریعت نے انتظار کی فضیلت بتائی ہے کہ جب تک آدمی نماز کے انتظار میں رہتا ہے گویا نماز ہی میں رہتا ہے۔ حدیثِ پاک میں نماز کے انتظار کی اتنی بڑی فضیلت اسی لیے بتلائی کہ انتظار کوئی معمولی کام نہیں ہے، بڑی مشقت کا کام ہے، اور انتظار میں اپنی طبیعت کو لگانے کی وجہ سے جو مشقت ہوتی ہے اس کو برداشت کرنا بھی مجاہدہ کا کام ہے، تو اس مجاہدہ پر بھی اجر ملتا ہے، حالاں کہ ابھی باقاعدہ نماز میں لگا نہیں ہے؛ لیکن نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کو نماز کا ثواب ملے گا، اس لیے کہ یہ کام عبادت کے لیے انجام دیا گیا ہے۔

تو شریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ عبادت کے لیے شروع میں آپ نے جو مراحل طے کئے اور تمہیدی طور پر جو کچھ بھی کیا، اس پر یوں نہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اجر نہیں ملے گا، آپ کا یہ عمل بے کار نہیں ہے، بلکہ اس پر بھی مستقل اجر ملتا ہے۔ نماز کا اجر وثواب تو الگ ہے، اس سے پہلے آپ نے جو کچھ کیا اس کا مستقل ثواب اللہ تعالیٰ کے یہاں ملے گا۔ یہی قاعدہ ہر کام میں چلے گا۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں، تو اس کے لیے سحری کھاتے ہیں، حالاں کہ کھانا ایک طبعی عمل ہے لیکن سحری پر بھی حدیثِ پاک میں فضیلت موجود ہے، اس کو بابرکت کھانا کہا گیا ہے، حضورِ اکرم ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے، اس کھانے پر باقاعدہ ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے کہ یہ کھانا عبادت کا ذریعہ بن رہا ہے۔

یہ طرزِ عمل؛ شرافت کا جنازہ

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو ہمیں اپنی کسی کوشش اور محنت کے بغیر ملیں، ان کے سلسلہ میں نمبر اول پر یہ ذمہ داری اور فریضہ ہم پر عائد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک نعمت کو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کریں، ورنہ اس سے بڑی ناشکری اور کیا ہوگی؟ جیسے: آپ نے کسی کو کوئی چیز دی، وہ آدمی اس چیز کو آپ ہی کو ناراض کرنے میں استعمال کرتا ہے، اس کے ذریعہ سے آپ کو ہی تکلیف پہنچا رہا ہے، تو آپ ہی بتلائیے کہ اس سے بڑا خطرناک کام اور کیا ہوسکتا ہے؟ مثلاً: آپ نے سفارش کر کے کسی کو کوئی عہدہ دلوایا، وہ آدمی اس سے غلط فائدہ اٹھا کر آپ کو ہی نقصان پہنچا رہا ہے؛ تو دنیا کیا کہے گی؟ حالاں کہ ہماری نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ ہمیں تو بتلا دیا گیا کہ ساری دنیا مل کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر تل

جائے اور دنیا میں جو سب سے زیادہ نافرمان اور سرکش آدمی ہے، سب لوگ ایسے بن جائیں، تب بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے؛ لیکن ہماری شرافت اور مروت کا تو جنازہ نکل ہی گیا۔ ہمارا یہ طرزِ عمل شرافت کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لیے تو علماء لکھتے ہیں کہ نافرمانیاں اور گناہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہی نہیں ہیں، بلکہ شرافت اور مروت کے بھی خلاف ہیں۔ اس لیے تمام نعمتیں چاہے اختیاری ہوں یا غیر اختیاری؛ ان کے سلسلہ میں سب سے پہلا فریضہ ہم پر یہی عائد ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے دن، ہفتے، مہینے، ساعتیں اور گھڑیاں ہمیں عطا فرمائیں، تو اب زندگی کے ان اوقات کو ہم گناہوں میں استعمال نہ کریں۔ اگر ایک گھڑی کو بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کریں گے؛ تو یہ ناشکری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جوانی عطا فرمائی، تو جوانی کی صلاحیتوں کو کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے، اپنی شہوت پوری کرتا ہے، جوانی کی قوت کو ظلم اور زیادتی میں استعمال کرتا ہے؛ تو یہ جوانی کی نعمت کی ناشکری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مال دیا، تو اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے۔ ساری نعمتوں میں آدمی اول درجہ پر یہی سوچے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو؛ چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری؛ ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کروں گا۔ ورنہ یہ سب سے پہلی ناشکری ہوگی۔

شکر کا دوسرا درجہ

نمبر دو پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے سلسلہ میں جو ذمہ داری وجوبی حیثیت سے ضروری قرار دی ہے اس کو انجام دے۔ مثلاً جسم عطا فرمایا، اسی کے ذریعہ سے نماز،

روزہ وغیرہ تمام جسمانی عبادتیں ادا کی جاتی ہیں، جسم سے متعلق یہ سب اہم فریضے ہیں۔ اسی طرح دیگر تمام نعمتوں سے متعلق جتنے بھی فرائض ہیں ان کو انجام دینا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا، یہ نعمت البتہ ایسی ہے کہ اس میں آدمی کے اختیار کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے، اور بعض دفعہ غیر اختیاری بھی ملتا ہے، جیسے: باپ یا کسی رشتہ دار کا انتقال ہوا اور بیٹے یا وارث کو لاکھوں کروڑوں روپے مل گئے؛ یہ بغیر محنت کے ملے ہیں۔ یا کسی نے ہدیہ دیا تو یہ بھی بغیر محنت کے ملا۔ اور کبھی محنت کر کے کاروبار کے ذریعہ سے کماتا ہے۔ تو مال سے متعلق جو فرائض ہیں، ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ مال کا فریضہ کیا ہے؟ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، قربانی وغیرہ۔ یا صاحبِ مال ہونے کی حیثیت سے آپ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد، بیوی، ماں باپ، بھائی بہن وغیرہ کا نفقہ واجب کیا، یا کبھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا وجوب کا درجہ حاصل کر لیتا ہے؛ تو یہ سب مال سے تعلق رکھنے والے واجبات ہیں، ان سارے فرائض کو ادا کرے۔ پھر اس کے بعد اس نعمت سے تعلق رکھنے والے مستحبات کو بھی ادا کرنے کا اہتمام کرے، یعنی اللہ تعالیٰ جس کام سے راضی ہوتا ہے اس کا اہتمام کرے۔ چاہے کوئی بھی نعمت ہو، اس کی قدر دانی کا حق یہی ہے کہ وہ نعمت جس کام کے لیے دی گئی ہے، اور اس سے لوگوں کو جتنا زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہو، اس کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا ہی اس نعمت کا سب سے بڑا شکر ہے۔

اور اگر اس نعمت کو حاصل کرنے میں ہماری کسی محنت و کوشش کو دخل ہے، تو پھر یہ بھی خیال رکھا جائے کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کے اندر کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہو۔ جیسے مال، مکان و جائیداد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی آدمی لوگوں کی جیب کاٹتا ہو، مال لوٹتا ہو، چوری کرتا ہو، ظلم و زیادتی کرتا ہو لوگوں کے حقوق مارتا ہو؛ تو یہ سب جائز نہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے

جو طریقہ بتلایا ہے اسی کو اختیار کرے یعنی مزدوری کرے، کاروبار کرے۔ پھر اس کو اختیار کرنے کے ساتھ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسرا کوئی فرض چھوٹ جائے، جیسے: دکان پر بیٹھا تو کاروبار میں ایسا مشغول ہو گیا کہ فرض نمازیں چھوڑ دیں، ایسا کرنے کی وجہ سے کمائی کے حلال ہونے کے باوجود یہ دکانداری نماز چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بنی، اگرچہ اس کمائی کو بہ حیثیت کمائی کے حرام نہیں کہیں گے، لیکن سائڈ افیکٹ تو ہو رہی ہے، اور ہم ہر کام میں سائڈ اِفیکٹ کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی اپنی کمائی کو اس سے بچانے کا اہتمام کیجیے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہوا کہ ان ساری چیزوں کو اگر ملحوظ رکھیں گے تو کہا جائے گا کہ اس نعمت کا حق ادا کیا۔ اسی لیے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے: فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ" ایسا مالدار جو شکر گزار ہو اس کی فضیلت کا بیان۔ اور شکر گزار آدمی کی خود ہی وضاحت کر دی کہ جس طریقہ سے مال حاصل کرنا چاہیے، اسی طریقہ سے حاصل کرے، یعنی مال حاصل کرنے کا جو جائز طریقہ ہے اسی کو اختیار کرے، اور جہاں اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کرے۔ یہاں ''مامور بہا'' کی قید لگا کر ایک اور بات بتائی جا رہی ہے کہ جائز کام میں خرچ کرنے پر بھی فضیلت اسی وقت ملے گی جب کہ اسی جگہ خرچ کرے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جائز کام میں خرچ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ یہ الگ چیز ہے کہ فقہاء کرام کے یہاں جائز اور مباح کو بھی ''مامور بہا'' بتلایا گیا ہے، اور ''مامور بہا'' واجب کو بھی کہتے ہیں۔

خرچ کرنے میں یہ بھی بہتر اور وہ بھی!

اب اس سلسلہ میں آیتیں پیش کرتے ہیں۔ ایک آیت تو پہلے (بَاب النَّهِيِ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ میں) آچکی ہے۔ دوسری آیت ہے: ﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ﴾ اللہ کے راستہ میں جو خرچ کرتے ہو اس کو تم ظاہر کرو، یعنی کھل کر خرچ کرو کہ لوگوں کو پتہ چلے؛ تو یہ بہت اچھی بات ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ مستقل مسئلہ ہے کہ خرچ کرنے میں اخفاء یعنی چھپانا اچھا ہے یا ظاہر کرنا؟ علماء نے لکھا ہے کہ جو فرائض کے قبیل سے ہو، اس کو تو ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاکہ دوسروں کو بھی ان فرائض کی ادائیگی کی ترغیب ہو، جیسے فرض نماز: کہ اس کو مسجد میں آکر ہی ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح سے زکوٰۃ کو ادا کرنے میں بھی اظہار کرے تو کوئی حرج کی بات نہیں یعنی اس طرح زکوٰۃ دے کہ لوگوں کو پتہ چلے؛ تاکہ دوسروں کو بھی اس فریضہ کی ادائیگی کا اہتمام ہو۔ البتہ نوافل میں جیسا موقع ہو، اگر موقع کے مناسب اخفاء ہو تو اس کی فضیلت زیادہ ہوگی، اور اگر کوئی موقع ایسا ہے کہ لوگوں کو ترغیب کی ضرورت ہے تو اظہار میں بھی کوئی حرج نہیں۔

﴿وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ اگر اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز کو چھپا کر فقراء کو دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہاری سیئات کو درگزر کرے گا اور جو تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ واقف اور باخبر ہے۔ اس آیت میں صدقات کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے، اور جیسا کہ بتایا کہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا بھی شکر کا ایک حصہ ہے۔

نیکی کا اعلیٰ درجہ

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾ تم نیکی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک پا نہیں سکتے، جب تک کہ تم ان چیزوں کو خرچ کرو جو تمہارے نزدیک محبوب ہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے معاملہ میں ہمارے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں سے وہی نکالا جاتا ہے جو ردّی ہو چکا ہو۔ جیسے: کپڑے پہنتے پہنتے پرانے ہو گئے، اور نئے آئے تو سوچتے ہیں کہ پرانے کپڑے اللہ کے راستہ میں کسی غریب کو دیدو۔ کھانا کھا چکے اور بچ گیا، گھر میں کوئی کھانے والا باقی نہیں ہے، تو فقیر کو دے دو۔ زندگی گزر گئی، بڑھاپا آ گیا، اب گھر والے بھی دھکا دے کر گھر سے باہر نکال رہے ہیں ''نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت'' والا معاملہ ہو گیا، تو اب مسجد میں جا کر تسبیح پڑھو۔ اگر چہ ایسے کاموں پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب ملتا ہے، لیکن نیکی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی ایسی چیز خرچ کرے جو اس کے نزدیک بھی قیمتی اور محبوب ہو، جس کی وجہ سے دینے کو بھی جی آمادہ نہ ہوتا ہو، لیکن مجاہدہ کر کے اور اپنے نفس کے تقاضوں کو روک کر اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دے۔ جیسے جوانی کے زمانہ کو اللہ کی عبادت میں لگائے تو یہ اعلیٰ درجہ ہے اور اس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ جو چیز آپ کو مرغوب اور محبوب ہو اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کیجئے ﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ﴾ اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔ کیسے حالات میں خرچ کرتے ہو اور دل میں کیا ارادہ ہے؛ اس سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیے جاتے تھے ان پر عمل کرنے کا حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو فوراً حضرت

ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا، اور میرا باغ ''بیر حآء'' مجھے سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے، وہ آپ کی خدمت میں پیش ہے، اس کو آپ جہاں چاہیں خرچ کریں۔ ان کا یہ باغ جو مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا اور اس میں پانی بھی بڑا عمدہ تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شیریں پانی کو نوش فرمانے کے لیے اس باغ میں تشریف بھی لے جاتے تھے۔ یہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حال تھا۔

دو قابلِ رشک شخصیتیں

۵۷۱:- وعن عبدِ اللہ بنِ مسعودٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لاَ حَسَدَ إلاَّ فی اثْنَتَیْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللہُ مَالاً، فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الحَقِّ. وَرَجُلٌ آتَاهُ اللہُ حِكْمَةً، فَهُوَ يَقضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ) وتقدم شرحه قريباً

۵۷۲:- عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لاَ حَسَدَ إلاَّ فی اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللہُ القُرْآنَ، فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ. وَرَجُلٌ آتَاهُ مَالاً، فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں پر حسد کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور پھر اس مال کو حق (نیکی) کے کاموں میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط کیا ہو۔ اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، وہ اس علم کے ذریعہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو بھی وہ علم سکھلاتا ہے۔

افادات:- (اس روایت کی تفصیل باب الکرم والجود میں قریب ہی گزر چکی ہے)

حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملی ہو، اس نعمت کے متعلق دوسرا آدمی یہ سوچے کہ مجھے مل جائے اور اس سے یہ نعمت چھن جاوے۔

اس روایت میں حسد بول کر غبطہ مراد لیا ہے، جس کو اردو میں رشک کہتے ہیں، یعنی سامنے والے کے پاس نعمت باقی رہتے ہوئے اپنے لیے اس نعمت کی تمنا کرنا۔ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ دو ہی آدمی اس لائق ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ملی ہے اس کو دیکھ کر دوسرا آدمی تمنا کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی نعمت عطا فرمائے۔

پہلی شخصیت

ایک تو وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس مال پر مسلط کیا ہو یعنی اس کو اتنی قوت اور ہمت دی ہو کہ اس مال کو اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم فرمایا، وہاں برابر خرچ کرتا رہتا ہو۔ گویا اس کو اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے لیے مسلط کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ رات دن اس کو نیکی کے کاموں میں برابر خرچ کرتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کے پاس مال ہو اور نیکی کے کاموں میں اس کو خرچ کرتا ہو، وہ اس قابل ہے کہ اس پر رشک کیا جائے۔ اسی کو ”غنی شاکر“ سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شخصیت

دوسرا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا، جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اس علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ علم کی نعمت اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا فرمائی ہو تو اس کا حق یہی ہے کہ وہ اس سے لوگوں کو

فائدہ پہنچائے۔ اگر اس کے پاس علم ہے اور شریعت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے، تو اس کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو علم سکھائے اور حق کے مطابق فیصلے کرے۔ بلکہ ایسی کوئی چیز اس کو معلوم ہے اور جس کا جاننا دوسرے کے لیے بھی ضروری ہے، تو اس کا بتانا اس پر فرض ہے، اگر چھپائے گا اور نہیں بتائے گا؛ تو اس پر بڑی سخت وعید ہے۔ کسی آدمی سے کوئی بات پوچھی گئی اور وہ اس کو جانتا ہے، لیکن اس نے اس کو چھپایا تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اس کو جہنم کی آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ (ابن ماجہ. بَابُ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ)

ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا

اس حدیث کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ اس میں صراحت ہے کہ اس سے ایسی چیز پوچھی گئی ہو جس کا جاننا ضروری تھا اور اس نے چھپایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لایعنی اور بے کار سوال کا جواب اگر نہ دے تو اس پر یہ وعید نہیں ہے۔ ہم دارالافتاء میں بیٹھتے ہیں تو لوگ بے کار اور لایعنی چیزیں بھی بہت پوچھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا، اس لیے کہ ایسی چیزوں کا بتانا ضروری نہیں ہے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ اس کا جواب دیا ہی نہ جائے۔ یہاں تو وہ علم مراد ہے کہ جو لوگوں کے لیے سیکھنا ضروری ہے، جیسے ایک آدمی کو نماز کا طریقہ معلوم نہیں ہے، نماز کے فرائض اور واجبات معلوم نہیں ہیں، وہ آپ کے پاس آیا اور درخواست کرتا ہے کہ مجھے نماز کا طریقہ بتا دیجیے، لیکن آپ منع کرتے ہیں اور نہیں سکھاتے؛ تو یہ اس وعید میں داخل ہے۔ آپ کو زکوٰۃ کا مسئلہ معلوم ہے، ایک آدمی صاحبِ نصاب ہے، وہ آپ کے پاس مسئلہ معلوم کرنے کے لیے آیا اور آپ سے پوچھا اور جاننے کے باوجود آپ

نے نہیں بتایا تو اس وعید میں داخل ہو جائیں گے۔ تو ہر وہ چیز جس کا جاننا شرعی طور پر ضروری ہے اور آپ کو وہ معلوم بھی ہے؛ تو اس کا بتانا ضروری ہے۔

دو باتیں

دیکھو! یہاں دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ مال تھا تو جیسے مال میں سے خرچ کرنا واجب ہے، اصحابِ حقوق کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے۔ اولاد کا ماں باپ کے اوپر حق ہے، اور ماں باپ کا اولاد پر حق ہے، اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا حق ادا نہیں کرے گا؛ تو گنہگار ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے تو جو لوگ جاہل ہیں ان کا حق ادا کرو، اگر وہ آپ سے پوچھتے ہیں اور آپ جانتے ہوئے بھی ان کو نہیں بتاتے، تو آپ کے لیے یہی وعید ہے۔ علم والی نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اس کا شکر یہی ہے کہ لوگوں کو سکھاؤ، خود تو عمل کرنا ہی ہے، لیکن اوروں کو بھی سکھایا جائے۔

حفظِ قرآن کا حق

دوسری روایت میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے: ''رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ اٰنَآءَ اللَّيْلِ وَاٰنَآءَ النَّهَارِ'' اوپر تو مطلق علم کے بارے میں بتلایا تھا، یہاں بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو قرآنِ کریم کی نعمت عطا فرمائی یعنی حفظِ قرآن کی دولت سے مالا مال کیا، وہ اس کو لے کر رات دن کے مختلف اوقات میں نماز میں کھڑا رہ کر پڑھتا رہتا ہے۔ گویا اس کا حق ادا کر رہا ہے؛ تو یہ اس کا شکر ہے۔ اگر کسی کو قرآنِ کریم کی دولت دی گئی، اس کا شکر یہی ہے کہ رات اور دن میں اس کو نمازوں کے اندر پڑھے، اگر نہیں پڑھتا ہے اور سویا رہتا ہے تو اس پر حدیث میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔

فقراءِ مہاجرین کی کڑھن

۵۷۳:- وعن أَبِي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ: أَنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِينَ أَتَوْا رسولَ الله ﷺ فَقَالُوْا: ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلَى، وَالنَّعِيمِ الْمُقِيمِ. فَقَالَ: وَمَا ذَاكَ؟ فَقَالوا: يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ وَلاَ نَتَصَدَّقُ وَيَعْتِقُونَ وَلاَ نَعْتِقُ. فَقَالَ رسول الله ﷺ: أَفَلاَ أُعَلِّمُكُمْ شَيْئاً تُدْرِكُونَ بِهِ مَنْ سَبَقَكُمْ، وَتَسْبِقُونَ بِهِ مَنْ بَعْدَكُمْ، وَلاَ يَكُونُ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ إِلاَّ مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ؟ قَالُوْا: بَلَى يَا رسولَ الله. قَالَ: تُسَبِّحُونَ وَتُكَبِّرُونَ وَتَحْمَدُونَ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ ثَلاثاً وَثَلاثِينَ مَرَّةً. فَرَجَعَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ إِلَى رسولِ الله ﷺ، فقالوا: سَمِعَ إِخْوَانُنَا أَهْلُ الْأَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا، فَفَعَلُوا مِثْلَهُ؟ فَقَالَ رسولُ الله ﷺ: ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ. (متفقٌ عَلَيْهِ. وَهٰذا لفظ رواية مسلم)

((الدُّثُور)): الأَمْوَالُ الكَثِيرَةُ، واللهُ أعلم.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: غریب مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مال دار لوگ جنت کے اونچے درجات اور جنت کی ہمیشہ کی نعمتوں کو لے اڑے (سارے درجات انہوں نے حاصل کر لیے) آپ ﷺ نے سوال کیا: وہ کیسے؟ فقراءِ مہاجرین نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں؛ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، ہم روزہ رکھتے ہیں؛ وہ بھی روزہ رکھتے ہیں، لیکن ان کے پاس مال ہے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں، اور ہم خرچ نہیں کر سکتے۔ وہ غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے ہیں اور ہم آزاد نہیں کر سکتے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم کو ایسی چیز نہ سکھاؤں کہ اس کے ذریعہ تم ان لوگوں کو پالو جو تم سے آگے بڑھ گئے ہیں، اور جو لوگ بعد میں آئیں ان سے بھی آگے بڑھ جاؤ، اور تم سے افضل اور بہتر کوئی نہیں ہو سکتا مگر وہی جو اسی عمل کو کرے جس کو تم

کرتے ہو۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳؍ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳؍ مرتبہ الحمد للہ، اور ۳۳؍ مرتبہ اللہ اکبر کہا کرو (مالدار حضرات نے سنا تو انہوں نے بھی وہ عمل شروع کر دیا) وہی فقراء پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: ہم نے جو عمل شروع کیا، ہمارے مالدار بھائیوں نے سنا تو انہوں نے بھی شروع کر دیا (وہ تو پھر برابر ہو گئے) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ'' یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔

افادات: دیکھو! ان کو یہ فکر لاحق تھی، اور ہم کو تو یہ فکر لاحق ہے کہ اس نے بنگلہ بنایا اور ہم بنگلہ بنانے میں اس سے پیچھے رہ گئے۔ اس نے دو بلڈنگ تعمیر کر لیں اور ہماری ایک ہی ہے۔ اس نے دو فیکٹریاں بنالیں، ہماری نہیں ہے۔ ان چیزوں میں تو ہم بہت چوکنے رہتے ہیں، لیکن آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے میں کبھی ہمارا ذہن جاتا ہی نہیں کہ فلاں آگے بڑھ رہا ہے، تو میں بھی آگے بڑھوں۔ ہم میں ان چیزوں کا اہتمام نہیں رہا۔ حضراتِ صحابہ کرام کے متعلق کسی بھی روایت میں یہ بات آئی ہو تو مجھے بتاؤ کہ فلاں صحابی یہ شکایت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں گئے ہوں کہ اے اللہ کے رسول! فلاں صاحب تجارت میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں، آپ دعا کیجئے کہ میری تجارت میں بھی کچھ برکت ہو جائے، بلکہ صرف دعا کی درخواست ہی لے کر آئے ہوں ایسا بھی کسی روایت میں آیا ہو تو بتاؤ۔ خیر! ان لوگوں نے اس نسخہ پر عمل شروع کر دیا، پھر مالداروں کو بھی پتہ چل گیا کہ ایک نیا نسخہ حاصل ہو گیا ہے۔ وہ حضرات ہمارے زمانہ کی طرح نیکیوں سے بے رغبت نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے، آج تو کسی کو نیکی کے کام کی اگر رغبت دی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ جاؤ! دوسروں سے کہو، ہم نے تو بہت نیکیاں کمالی ہیں۔ ایسے جملے زبان سے نکالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الأَمَلِ

موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

﴿ مجلس ۱ ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا ۔ أما بعد:-

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (آل عمران: ۱۸۵)

وقال تعالیٰ: وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ. (لقمان: ۳۴)

قال تعالیٰ: فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (النحل: ۶۱)

قال تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ. (المنافقون: ۱۱-۱۰-۹)

وقال تعالیٰ: حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ إِلَى قَوْلِهِ تَعَالَى: كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ

سِنِينَ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْماً أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْئَلِ الْعَادِّينَ قَالَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلاَّ قَلِيلاً لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لاَ تُرْجَعُونَ. (المؤمنون:۹۹تا ۱۱۵)

وقال تعالیٰ: أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلاَ يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ. (الحدید:۱۶)

وَالآيات في الباب كثيرةٌ معلومة.

گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ

نیا عنوان قائم کیا ہے: موت کو یاد کرنے، اور تمناؤں امیدوں کو مختصر کرنے کا بیان۔ یہ بہت اہم اور ضروری چیز ہے۔ عام طور پر آدمی گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے اور نافرمانیوں کی نوبت آتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ موت کی طرف سے غفلت رہتی ہے۔ اگر آدمی کو موت پیشِ نظر رہے، اور ہر وقت اس کا احساس اور اس کی یاد رہے تو گناہوں اور اللہ کے احکام کو توڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں کئی جگہوں پر موت کو یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ فرمایا: ''أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يعني الْمَوْتَ. (سنن ترمذی)'' لذتوں کو کاٹنے اور ختم کرنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

نا قابلِ انکار حقیقت

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں بے شمار

چیزیں اور حقائق ایسے ہیں کہ ان کو تسلیم کرنے سے لوگوں نے انکار کیا، یا اس میں شک و شبہ کا اظہار کیا۔ خود اللہ تعالیٰ کے وجود کا بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں، اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ قیامت کو نہیں مانتے۔ لیکن صرف موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرتا، چاہے مسلمان ہو، کافر و دہریہ ہو؛ سب کو یہ حقیقت تسلیم ہے کہ موت آنے والی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موت کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ابھی آ جائے، پانچ منٹ کے بعد آ جائے، ایک گھنٹہ کے بعد آ جائے، ایک دن کے بعد آ جائے، ہفتہ کے بعد، مہینہ کے بعد، سال بھر کے بعد آ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات طے ہے کہ آنے والی ہے لیکن کب آئے گی اس کا وقت معلوم نہیں۔ جب اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تو پھر ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور اس کی تیاری بھی کرتے رہنا چاہیے، اس کی طرف سے اگر غفلت برتی جائے گی تو یہ آدمی کے لیے بہت زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے۔ شیطان آدمی کو یہ سمجھاتا اور بہکاتا ہے کہ ابھی تو جوانی ہے، اللہ تعالیٰ نے قوت دی ہے، پیسہ اور سارے اسباب ہیں؛ جو کرنا ہے ابھی کر لو، بعد میں توبہ کر لیں گے؛ حالاں کہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ بعد میں توبہ کا موقع بھی ملے گا یا نہیں عام طور پر جو نافرمانیاں ہوتی ہیں وہ اسی دھوکہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آدمی یہ سوچ لے کہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے، اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے، اور اس کی تیاری بھی کرتے رہنا چاہیے؛ تو پھر ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے باز رکھ سکے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کی کوشش کرے۔

مختصر سفر کی تیاری اور لمبے سفر سے غفلت!

دنیا کے اندر آدمی کا چھوٹا موٹا سفر ہوتا ہے، تو اس کے لیے کتنی تیاریاں کی جاتی

ہیں، مثلاً دو روز کے لیے دہلی جانا ہے؛ لیکن اس کے لیے پہلے سے ٹکٹ بک کراتے ہیں، ریزرویشن کراتے ہیں، دہلی میں بھی فون کر دیتے ہیں کہ فلاں ہوٹل میں جگہ بک کرالو، وہاں جو دوست احباب ہیں ان کو اطلاع کی جاتی ہے کہ فلاں اسٹیشن پر اترنے والا ہوں، وہاں میرے استقبال کے لیے موجود رہیں۔ صرف دو دن کا معاملہ ہوتا ہے اس کے باوجود یہ ساری تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اور آخرت کا اتنا لمبا سفر ہے، جہاں سے دوبارہ واپس بھی نہیں آنا ہے، اس کے باوجود اس کی تیاری کے معاملہ میں ہم غفلت برتتے ہیں۔

آپ سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کا ہارون الرشید کے یہاں آنا جانا تھا۔ بادشاہ بھی ان کے ساتھ دل لگی کیا کرتے تھے۔ اپنے دربانوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ جب بھی آئیں؛ روکا نہ جائے۔ وہ آتے تھے اور یہ دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آئے تو ہارون الرشید نے ان کو ایک چھڑی دی اور کہا کہ: یہ میں آپ کو بطورِ امانت دیتا ہوں، جب آپ کو اپنے سے زیادہ بیوقوف شخص دنیا میں نظر آئے، اس کو دے دینا۔ انھوں نے برا نہیں مانا، چھڑی لے لی اور اپنے پاس حفاظت سے رکھ لی۔ ایک مدت کے بعد ایک مرتبہ ان کو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت بیمار ہیں، اور ان کی زندگی کی امید کم ہے؛ تو وہ اس چھڑی کو لے کر حاضر ہوئے اور پوچھا:

امیر المومنین! کیا حال ہے، کیسی طبیعت ہے؟

کہا: بس اب جانے کا وقت آ گیا ہے۔

پوچھا: کہاں کے سفر کا ارادہ ہے؟

کہا: آخرت کا سفر درپیش ہے۔

پوچھا: واپسی کب ہے؟

کہا: کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا وہاں جانے والا کبھی واپس آیا کرتا ہے؟

پوچھا: پھر آپ نے اس کے لیے کیا تیاریاں کی ہیں؟

کہا: افسوس اسی کا ہے کہ اس کے لیے جو تیاریاں کی جانی چاہیے تھیں؛ وہ نہیں ہوئیں۔

انہوں نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ کا دنیا میں تو یہ حال تھا کہ اگر کہیں دو تین روز کے لیے جانا ہوتا تھا تو لشکر کی ایک ٹکڑی پہلے بھیج دیا کرتے تھے جو خیمے لگا دیا کرتی تھی، کھانے پینے کا سامان اور عیش وعشرت کی چیزیں لے کر وہاں پہنچ جاتی تھی، آپ کے لیے وہاں خیمے لگا دیئے جاتے تھے، اور ہر طرح کے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ دو تین دن کے سفر کے لیے تو آپ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے، اور اتنا لمبا سفر جہاں سے (آپ خود ہی کہہ رہے ہیں) واپس کوئی نہیں آیا کرتا، اس کے لیے آپ نے کوئی تیاری نہیں کی؟

پھر کہا: آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے جو آپ نے ایک وقت یہ کہہ کر میرے حوالہ کی تھی کہ کوئی مجھ سے زیادہ بیوقوف ملے اس کو دیدوں۔ آج میں سمجھا ہوں کہ آپ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہے کہ آپ دنیا کے معمولی معمولی سفر کے لیے بڑی زبردست تیاریاں کیا کرتے تھے، اور اتنے طویل سفر کے لیے آپ نے کوئی تیاری ہی نہیں کی! یہ کہہ کر وہ چھڑی ہارون الرشید کے حوالہ کی اور چل دیئے۔

سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

یہ کوئی ہنسنے ہنسانے کی بات نہیں ہے؛ بلکہ درحقیقت یہی معاملہ ہمارا اور آپ سب کا ہے، ہم سب اسی میں مبتلا ہیں۔ دنیا کی چندروزہ زندگی کے لیے اتنی تیاریاں کرتے ہیں، بہتر سے بہتر مکانات تعمیر کرتے ہیں اور ان کے اندر ہر طرح کے عیش و عشرت، راحت وآرام کے اسباب کی بھرپور کوششیں کرتے ہیں، اور آخرت کے

متعلق ہم اپنی زبان سے یوں تو کہتے ہیں کہ ہمیں وہاں جانا اور ہمیشہ رہنا ہے، لیکن اس کے واسطے ہماری طرف سے کوئی تیاری نہیں ہے۔ گویا کہ اس حماقت اور بے وقوفی میں ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔ اسی لیے اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلافِ عظام کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگیوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت موت کو پیشِ نظر رکھتے تھے، انہوں نے اپنے نفس کو کبھی اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ طویل امیدیں قائم کرے کہ جس کی وجہ سے موت سے غفلت ہو جائے۔ ہم جو بڑی بڑی امیدیں باندھتے ہیں اور اس کے لیے دس بیس سال کے لمبے لمبے پروگرام بناتے ہیں، حالاں کہ کہنے والے نے بڑی عمدہ بات کہی ہے: ع سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

ہمیں پتہ نہیں ہے کہ ایک منٹ کے بعد، پانچ منٹ کے بعد اور ایک گھنٹے کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ تو یہ لمبی تمنائیں ہی ہیں جنہوں نے ہمیں غفلت میں ڈال رکھا ہے۔

اسی لیے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے کہ موت کو یاد کیا جائے اور امیدوں، تمناؤں کو کم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ذکر کی ہیں۔

حقیقی کامیابی

پہلی آیت لائے ہیں: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اپنے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہم پر موت نہیں آنے والی ہے۔ جب موت آئے گی اور ہم وہاں پہنچیں گے ﴿وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے روز تم کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وہاں کا معاملہ کیا ہے؟ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ جو آدمی جہنم سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا؛ وہ کامیاب ہے، اور حقیقی

کامیابی اسی کا نام ہے۔ ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ فیکٹری بنالی تو کامیاب ہو گئے، ایک سے دو کر دی تو کامیاب ہو گئے بلڈنگ بنالی تو کامیاب ہو گئے، تجارت خوب چل رہی ہے تو کامیاب ہو گئے، دنیا کے اعتبار سے جو آدمی جتنا زیادہ پیسہ کماتا ہے، لوگ اسی کو کامیاب سمجھتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں کہا گیا کہ جو آدمی اپنے آپ کو جہنم سے بچالے اور جنت کا حقدار ہو جائے وہ کامیاب ہے ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ دنیوی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے، اس کے اندر پھنسنے کی اور اس سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حیثیت سے آدمی سوچتا رہے کہ دنیوی زندگی دھوکہ کی چیز ہے، ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے، قبرستان کی زیارت کرتا رہے، پہلے لوگوں کے حالات پر غور کرتا رہے، بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے فاتح دنیا میں آئے؛ لیکن وہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے، کوئی بھی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گیا۔

اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں

آگے ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ آدمی گناہ کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ کل توبہ کر لیں گے، پھر توبہ کر لیں گے، لیکن بتلا دیا گیا کہ کل کیا ہونے والا ہے اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ کل کی توبہ کے خیال سے آج گناہ میں مبتلا ہونے سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہو سکتی۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ توبہ کی وجہ سے گناہ معاف بھی ہو جائیں، تب بھی ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس اچھے سے اچھا مرہم ہے جس کے متعلق مرہم کے ایجاد کرنے والوں نے گارنٹی دے رکھی ہو کہ کیسا ہی زخم کیوں نہ ہو، آپ لگائیں گے تو فوراً اچھا ہو جائے گا۔ تو کیا کوئی آدمی اس وجہ سے کہ اس کے پاس ایسا مرہم ہے کہ اس

کے لگانے سے زخم فوراً اچھا ہو جاتا ہے، اپنی انگلیاں کاٹ لیتا ہے؟ کیا اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے؟ جب ہم اپنے جسم کے معاملہ میں ان سارے معالجات اور تدبیریں ہونے کے باوجود اس کا خطرہ مول نہیں لیتے، تو آخرت کے معاملہ میں ایسا کیوں کیا جائے؟ آگے فرمایا: اور کسی کو معلوم نہیں ہے کہ کس جگہ اس کی موت آنے والی ہے، تو پھر آدمی کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

نہ جلدی، نہ دیر

آگے ایک اور ارشاد نقل کیا: ﴿فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ اس آیت سے پہلے یہی مضمون بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں اور نافرمانیوں میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ اگر ہر ایک نافرمانی پر گرفت کرنے لگے تو پھر کوئی جاندار دنیا کے اندر باقی نہیں رہ سکتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ اب وہ وقت کتنا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے، باقی مقررہ وقت سے پہلے اس کو موت نہیں آئے گی۔ لیکن جب وقتِ مقررہ آجائے گا تو موت ٹھیک اسی وقت آکر رہے گی، ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوسکتا، نہ وقت مقررہ سے پہلے آسکتی ہے اور نہ وقت مقررہ سے مؤخر ہوسکتی ہے۔

وہی گھاٹے میں ہیں

آگے ایک اور ارشاد نقل کیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غفلت میں نہ ڈالیں۔ عام طور پر آدمی مال اور اولاد کی وجہ سے غفلت کا شکار ہوتا ہے، خاص یہی دو اسباب ہوتے ہیں تو ان دونوں کے باب میں چوکنا کر دیا گیا کہ ان کی وجہ سے اللہ کی یاد، اس کے احکام

کی بجا آوری، اور اس کی اطاعت سے غفلت میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمایا: جو آدمی ایسا کرے گا یعنی مال واولاد کی محبت میں آکر غفلت کا شکار ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائے گا تو یہی لوگ خسارے اور گھاٹے والے ہیں، ان کو آخرت کا نقصان اٹھانا پڑے گا ﴿وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کر واس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آجائے، پھر وہ یوں کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے قریب کے وقت کے لیے مہلت کیوں نہ دی؟ یعنی موت جب آئے گی اور مال خرچ نہیں کیا تو وہ تمنا کرے گا کہ مجھے کچھ وقت مل جائے؛ تا کہ یہ مال جو میرے پاس ہے، میں وہ خرچ کردوں اور نیکوکار بن جاؤں، نیک اعمال کرنے لگوں۔ آدمی کو جب تک کہ موت نہیں آجاتی وہاں تک غفلت میں رہتا ہے، اور جیسے ہی موت بالکل سر پر آجاتی ہے تو ایسی تمنائیں کرتا ہے لیکن ان تمناؤں سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ اور جب کسی کا مقررہ وقت آجائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو ذرّہ برابر بھی مہلت نہیں دیں گے، اس وقت تو اس کی جان قبض کر ہی لی جائے گی۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

وہی پرانی روش

دوسری آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کا دھوکہ ہے؛ بلکہ آخرت میں جانے کے بعد کفار یہ تمنا کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے؛ تا کہ ہم ایمان لے آئیں اور اعمالِ صالحہ کرلیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر دوبارہ بھی جائیں گے تب بھی غفلت ہی کا شکار ہونے والے ہیں۔ اور دنیا ہے ہی ایسی کہ آدمی دھوکہ میں

پڑ جاتا ہے، اور اس میں ایسا مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر آدمی ایسی باتیں صرف وقت آنے پر ہی کرتا ہے۔ آپ دنیا میں دیکھ لیجئے کہ بہت سے لوگ جب کسی مہلک اور خطرناک بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جس میں بچنے کی امید نہیں رہتی، اس وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر میں زندہ رہا تو کبھی نافرمانی نہیں کروں گا، اور اپنے اعمالِ بد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ طے کرتے ہیں کہ پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کروں گا، لیکن پھر جب اچھے ہو جاتے ہیں تو پہلے جیسے تھے ویسے ہی ہو جاتے ہیں، ان کی پرانی روش میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔

حساب کتاب کا منظر

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا﴾ یہاں تک کہ جب ان کے پاس موت کا وقت آئے گا تو یوں کہیں گے: باری تعالیٰ! مجھے واپس بھیج دیجئے تا کہ میں نیک اعمال کروں اور پیچھے جو مال چھوڑ آیا ہوں اس میں سے صدقہ وخیرات کروں (باری تعالیٰ فرماتے ہیں) ہرگز نہیں! یہ ایک ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے نکال رہا ہے، جس پر عمل ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ تو صرف ایسی ہی باتیں ہیں، اگر دوبارہ بھیجا جائے تب بھی وہ اپنی حرکتوں پر ہی رہے گا ﴿وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ اور (موت کے بعد) ان کے دوبارہ زندہ کئے جانے تک ایک پردہ ہے یعنی دنیا سے جانے کے بعد برزخ کی زندگی آتی ہے، جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور لوگ دوبارہ پیدا کیے جائیں گے وہاں تک اس کو وہیں رہنا ہے ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ﴾ پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ زندہ

کیسے جائیں گے، اس وقت آپس میں کوئی رشتہ داریاں نہیں رہیں گی۔ دنیا میں تو رشتہ داریوں اور تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ آڑے وقت میں ایک دوسرے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ ہوتا تھا، لیکن جب آخرت میں پہنچیں گے تو کسی طرح کی کوئی رشتہ داری باقی نہیں رہے گی، ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا عمل ہوگا، اور نہ ایک دوسرے کے پاس کچھ مانگ سکیں گے ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُونَ﴾ وہاں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر نیک اعمال کے ذریعہ اس کا ترازو بھاری ہوجائے گا تو وہ کامیاب ہے، اور اگر اعمالِ صالحہ سے اس کا ترازو ہلکا رہے گا تو پھر یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان اور گھاٹے میں ڈالا، اور وہ جہنم کے اندر ہمیشہ رہیں گے ﴿تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ﴾ جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جُھلسا دے گی اور وہ اس کے اندر بھی بالکل بدصورت ہوجائیں گے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جہنمی کے اوپر کا ہونٹ پیشانی تک چڑھ جائے گا، اور نیچے کا ہونٹ ناف تک لٹک جائے گا۔ (ترمذی۔) اور زبان باہر نکل کر اتنی لمبی ہوجائے گی کہ جہنمی لوگ اس کو روندیں گے (ترمذی. بَابُ مَا جَاءَ فِي عِظَمِ أَهْلِ النَّارِ) یعنی جہنمی کا جہنم کے اندر یہ حال ہوگا کہ چہرا بگڑ جائے گا، شکل وصورت بگڑ جائے گی۔

﴿أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِيْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ﴾ وہاں ان کو جہنم کے داروغہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہماری نشانیاں اور پیغام تمہارے پاس نہیں آئے تھے کہ جب تمہارے سامنے پڑھے جاتے تھے، تو تم اس کو جھٹلاتے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ نصیحت قبول کرنے کا جو وقت تھا اس سے تم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر پوچھا جائے گا:

﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴾ دنیا میں کتنے سال رہے؟ دنیا کی پچاس، ساٹھ، سو، ایک سو پچاس سال کی اتنی طویل زندگی جو ملی تھی اس کے باوجود یہ حال ہوگا

کہ وہ کہیں گے ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ہم تو ایک دن رہے یعنی وہاں آخرت میں پہنچنے کے بعد دنیا کی یہ طویل زندگی بھی مختصر معلوم ہوگی۔ دنیا میں اگر اس بات کا کچھ احساس ہوتا تو کچھ کار آمد بھی ہوتا۔ اور بعض لوگ تو کہیں گے کہ ہم پورا ایک دن بھی نہیں رہے، بلکہ ایک دن کا بھی کچھ حصہ دنیا میں رہے۔ ان سے کہا جائے گا: ﴿فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ﴾ فرشتے جو سب کچھ شمار کرنے کے لیے مقرر تھے انہی سے پوچھو ﴿قَالَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيْلاً لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اور کہا جائے گا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی بہت تھوڑی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اگر تم جانتے ہو ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ پھر کہا جائے گا کہ کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا؟ یعنی وہاں تمہارے اعمال کے متعلق کوئی پوچھ نہیں ہوگی؛ بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سب پوچھا جائے گا اور حساب کتاب ہوگا۔ اور کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص کام کے لیے پیدا کیا ہے، اور پھر لوٹ کر وہاں جانا ہے جہاں اس کے متعلق سوال ہوگا۔

کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا؟

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے واسطے، اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو حق اتارا اس کے سامنے جھکیں یعنی ایمان والوں کے دل تو ایسے ہونے چاہئیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی آیتیں اور احکام ان کے سامنے پیش کیے جائیں تو ان کے دل جھک جائیں اور ان کو قبول کرلیں اور اللہ کی یاد کے لیے آمادہ ہوجائیں ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ﴾ اور وہ ایسے نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی۔ یعنی امتِ محمدیہ سے پہلے جن امتوں کو کتابیں دی گئیں (جیسے یہود

اور نصاریٰ) ان کو ایسا نہیں بننا چاہیے ﴿فَطَالَ عَلَيۡهِمُ الۡأَمَدُ﴾ زمانہ ان کے اوپر طویل ہوگیا یعنی نبیوں کی صحبت سے وہ دور ہو گئے، تو نتیجہ یہ ہوا ﴿فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ﴾ ان کے دل سخت ہو گئے ﴿وَ كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فَاسِقُوۡنَ﴾ اور ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔ آدمی اللہ تعالیٰ کی ان آیات کی کثرت سے تلاوت کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو مدِ نظر رکھے؛ تب ہی غفلت دور ہو سکتی ہے۔ یہاں تو نمونے کے طور پر چند آیتیں پیش کی گئیں جن میں خاص طور پر متوجہ کیا گیا کہ موت آنے والی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور جواب دینا ہے، وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ دنیوی زندگی کی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی بہت قلیل ہے، اس تھوڑے سے وقت کو آدمی سنبھال لے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اہتمام کرلے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچالے، نفس اور شیطان کے دھوکے میں نہ آئے؛ تو اس کے لیے کامیابی ہے۔

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

۴۷۵:-عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: أَخَذَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِمَنۡكِبِي فقال: كُنۡ فِي الدُّنۡيَا كَأَنَّكَ غَرِيۡبٌ أَوۡ عَابِرُ سَبِيۡلٍ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا: دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ پردیسی (پردیس میں) یا راستہ چلتا ہوا آدمی رہتا ہے

افادات:- آپ کسی جگہ سفر کر کے جائیں تو وہاں کوئی مکان بناتے ہیں؟ نہیں بناتے۔ پردیس میں آدمی سوچتا ہے کہ مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہے، دو دن کا مسئلہ ہے، جس طرح بھی وقت گزر جائے۔ میں جس کام کے لیے آیا ہوں اس کو پورا

کرلوں، پھر جلدی سے لوٹ جاؤں گا۔ دنیا میں آدمی کو اسی طرح رہنا چاہیے، اس لیے کہ ہمارا اصل گھر تو آخرت میں ہے، دنیا میں جو آنا ہوا ہے وہ آخرت کی تیاری کے لیے ہی ہے، اسی لیے یہاں کے گھر کو آباد کرنے کی اور دنیا کے عیش وآرام کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

﴿اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ﴾ بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرمایا کہ یا جیسے راستہ چلتا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ یعنی پردیسی کا تو کسی جگہ دو دن ٹھہرنا بھی ہوتا ہے، وہ تو گیسٹ ہاؤس یا ہوٹل میں قیام بھی کرتا ہے، لیکن جو آدمی راستہ کاٹ رہا ہے اور چل رہا ہے، وہ تو چل ہی رہا ہے، کہیں ٹھہرتا نہیں ہے۔ اس کا حال تو اس سے بھی آگے ہوتا ہے کہ وہ تو اتنا بھی نہیں سوچتا، جتنا دو دن قیام کرنے والا آدمی سوچتا ہے۔ کوئی آدمی راستہ میں چل رہا ہو تو کتنا ہی اچھا منظر آئے، وہ اس منظر کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ میں تو مسافر ہوں، یہاں سے گزر رہا ہوں، ایسے مناظر تو آیا ہی کریں گے، اگر میں ان کی طرف توجہ کروں گا تو میرا سفر رہ جائے گا۔

وقت آنے سے پہلے تیاری کرلو

آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقولہ نقل کیا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے:

﴿إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَآءَ﴾ جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ یعنی جب صبح ہو تو یہ نہ سوچو کہ شام ہونے والی ہے، بس آدمی اسی وقت تیاری کر لے، اور ہر وقت موت کے واسطے تیار اور ریڈی (Ready) رہے، یہ نہ سوچے کہ کل کر لیں گے۔ آج کا کام کل پر چھوڑا نہیں جاتا؛ بلکہ ہر وقت اپنے آپ کو موت کے واسطے تیار رکھے۔ صبح ہو تو شام کا انتظار نہیں، اور شام ہو تو صبح کا انتظار نہیں۔ اپنی تندرستی کے اندر ہی بیماری کے لیے

تیاریاں کرلو، اور اپنی زندگی میں موت کی تیاری کرلو۔

دنیوی اعتبار سے آدمی تندرستی کے زمانہ میں سوچتا ہے کہ یہ تندرستی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، کبھی بیماری بھی آسکتی ہے، تو تندرستی کے زمانہ میں وہ اتنا کچھ کما لیتا ہے کہ کبھی بیماری آئے تو تندرستی کے زمانہ کا کمایا ہوا کام دے۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے معاملہ میں بھی آدمی کو سوچنا چاہیے کہ تندرستی کے زمانہ میں اعمال کا اتنا زیادہ اہتمام کرو کہ اگر کبھی درمیان میں بیماری آگئی، اور اس کی وجہ سے اس طرح کے اعمال انجام نہ دے سکو، تو تندرستی میں کیا ہوا عمل کارآمد ہو۔ جیسے آدمی تندرستی کے زمانہ کی کمائی سے بیماری میں فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طریقے سے اعمال کے معاملہ میں بھی ہونا چاہئے۔ ویسے فرائض تو ادا کرنے ہی ہیں؛ لیکن نوافل کے لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی تندرستی کے زمانہ میں جن نوافل کا اہتمام کرتا ہے، بیماری کی وجہ سے اگر ان کو انجام نہ دے سکے، تب بھی اللہ تعالیٰ اس کا ثواب اس کو عطا فرمائیں گے۔

اور اپنی زندگی سے موت کے لیے توشہ حاصل کرلو۔ موت تو آنے ہی والی ہے، اس کے لیے اپنی زندگی ہی میں تیاری کرلینی چاہئے، آخرت کی تیاری کے معاملہ میں آدمی غفلت نہ برتے۔

وصیت لکھنے کا حکم اور طریقہ

۵۷۵:-وعنه : أَنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ، لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ، يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلاَّ وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ، هٰذَا لفظ البخاری.)

وفی روایةٍ لمسلمٍ : يَبِيتُ ثَلاَثَ لَيَالٍ.

قَالَ ابن عمر: مَا مَرَّتْ عَلَيَّ لَيْلَةٌ مُنْذُ سَمِعْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ ذٰلِكَ إِلاَّ وَعِنْدِي وَصِيَّتِي.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ دو راتیں نہ گزارے مگر اس حال میں کہ کوئی ایسی چیز جو اس کے پاس قابلِ وصیت ہو جس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔

افادات:-یعنی ایسی وصیت جو ضروری ہے وہ اپنے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہیے، مثلاً ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ یا بندوں کا کوئی حق باقی ہے، تو اس سلسلہ میں وصیت کرنا لازم ہے، اگر آدمی بغیر وصیت کے مرے گا تو اس حق کے ضائع ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔ جیسے: ایک آدمی کی نمازیں فوت ہوئی ہیں، وہ ان کی قضا کر رہا ہے؛ تو قضا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو وصیت بھی لکھ دینی چاہیے کہ میں اپنی نمازیں- جو مجھ پر اتنی باقی ہیں- روزانہ اتنی قضا کر رہا ہوں، اور فلاں تاریخ سے میں نے شروع کر رکھی ہیں، اگر اس کی قضا مکمل ہونے سے پہلے میری موت آ جائے تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال میں سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کیا جائے۔ یہی حال روزوں کا ہے۔ اگر وصیت لکھی ہوئی ہے تو وارثوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مال کے تہائی میں سے فدیہ ادا کریں۔ لیکن اگر وصیت نہیں کی ہے تو ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر وارث ادا کریں گے تو ان کا تبرع اور احسان ہے؛ لیکن ان کے اوپر ضروری نہیں ہے؛ چاہے وہ لاکھوں کی دولت چھوڑ کر گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق باقی ہوں تو ان کے حق میں وصیت کرنا بھی ضروری ہے، اور بندوں کے جو حقوق ہیں وہ بھی آدمی ہر وقت لکھے ہوئے تیار رکھے کہ فلاں کا میرے اوپر اتنا قرض باقی ہے، اگر اس کی ادائیگی سے پہلے میری موت آ جائے تو میرے مال میں سے اس کو ادا کیا جائے۔ اسی طرح امانتوں کے متعلق بھی لکھ لینا ضروری ہے۔ ہر امانت پر باقاعدہ نام کے ساتھ لکھے کہ یہ فلاں کی امانت ہے۔ جتنے بھی حقوق یا امانتیں

ہیں ان کے متعلق وصیت لکھی ہوئی ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ خود کو یاد ہے، لیکن اس پر لکھا ہوا نہیں ہے اور ایسی حالت میں موت آ گئی، تو ظاہر ہے کہ ورثاء اس کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے جس کی امانت ہے اس تک پہنچا نہیں سکیں گے، تو اس صورت میں ذمہ داری مرنے والے کی ہوگی۔ لیکن اگر وصیت کے طور پر لکھا ہوا ہے اور پھر ورثاء کی طرف سے کوتاہی ہوئی؛ تو وہ گنہ گار ہوں گے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ یا بندوں کے حقوق میں سے جو چیز بھی قابلِ وصیت ہو، اس کو لکھ کر تیار رکھنا چاہیے۔ وصیت کا تیار رکھنا گویا اپنے آپ کو موت کے لیے تیار رکھنے کی علامت ہے، اس لیے کہ موت کب آئے گی کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔

زندگی، موت اور امیدیں

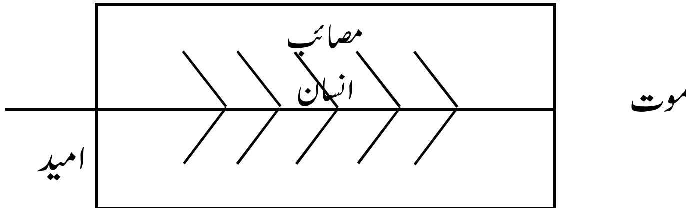
۵۷۶:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: خَطَّ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خُطُوطاً، فَقَالَ: هَذَا الإِنْسَانُ وَهَذَا أَجَلُهُ، فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ جَاءَ الخَطُّ الأَقْرَبُ. (رواہ البخاری)

۵۷۷:- وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: خَطَّ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خَطّاً مُرَبَّعاً، وَخَطَّ خَطّاً فِی الوَسَطِ خَارِجاً مِنْهُ، وَخَطَّ خُطَطاً صِغَاراً إِلَى هَذَا الَّذِی فِی الوَسَطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِی فِی الوَسَطِ، فَقَالَ: هَذَا الإِنْسَانُ، وَهَذَا أَجَلُهُ مُحِيطاً بِهِ - أَوْ قَدْ أَحَاطَ بِهِ - وَهَذَا الَّذِی هُوَ خَارِجٌ أَمَلُهُ، وَهَذِهِ الخُطَطُ الصِّغَارُ الأَعْرَاضُ، فَإِنْ أَخْطَأَهُ هَذَا، نَهَشَهُ هَذَا، وَإِنْ أَخْطَأَهُ هَذَا، نَهَشَهُ هَذَا. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ خط (لکیریں) کھینچیں، پھر فرمایا: یہ انسان ہے، اور یہ اس کی موت ہے۔ ابھی وہ امیدوں کی بھول بھلیوں ہی میں ہوتا ہے کہ قریب والا خط اسے آ دبوچتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مربع (چوکور) نشان بنایا، اس کے اندر سے ایک لمبا خط کھینچا جو پورے چوکھٹے کے اندر سے گزر کر پار ہو گیا۔ پھر اس بیچ والے لمبے خط کے دونوں طرف لکیریں کھینچیں اور فرمایا: چوکٹھا موت ہے جو آدمی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، آدمی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اندر کا جو لمبا خط ہے وہ انسان ہے۔ اور باہر جو خط نکالا گیا ہے وہ اس کی امیدیں اور تمنائیں ہیں جو آدمی موت سے بھی آگے کی کیا کرتا ہے۔ اور جو چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچی تھیں ان کے متعلق فرمایا: یہ اس کے اوپر آنے والے مصائب، آلام وآفات ہیں۔ اب اگر ایک سے چھوٹتا ہے تو دوسری میں مبتلا ہوتا ہے۔ دوسری سے چھوٹتا ہے تو تیسری کی گرفت میں آتا ہے۔ (نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔)

افادات:- مطلب یہ ہے کہ آدمی کی تمنائیں اپنی زندگی سے بھی آگے کی ہوا کرتی ہیں، انسان بہت آگے کی سوچتا ہے، اور چاروں طرف جو خط لگائے گئے ہیں وہ مصیبتیں ہیں جو ہر وقت اس پر آتی رہتی ہیں۔ کونسی مصیبت اس کا قصہ ختم کردے نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ سلسلہ برابر پوری زندگی چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں موت آکر پکڑ لیتی ہے۔



بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الْأَمَلِ

موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

﴿مجلس ۲﴾

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

بیان چل رہا تھا کہ موت کو یاد رکھنا چاہیے اور امیدوں کو مختصر کرنا چاہیے۔ اسی سلسلہ میں روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو

۵۷۸:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: بَادِرُوا بِالأَعْمَالِ سَبْعاً، هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلاَّ فَقْراً مُنْسِياً، أَوْ غِنًى مُطْغِياً، أَوْ مَرَضاً مُفْسِداً، أَوْ هَرَماً مُفَنِّداً أَوْ مَوْتاً مُجْهِزاً، أَوْ الدَّجَّالَ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ، أَوْ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ؟! (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو (کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سات چیزوں کا تذکرہ آرہا ہے ان میں سے کچھ چیزیں پیش آجانے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو جائے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اعمالِ خیر کے معاملہ میں کل کا انتظار نہ کرے) کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلا دینے والا ہو؟ یا ایسی مالداری کا جو سرکشی میں مبتلا کر دینے والی ہو؟ یا ایسی بیماری کا جو تمہاری صحت کو خراب اور قویٰ کو ختم کرنے والی ہو؟ یا ایسے بڑھاپے کا جو سٹھیا دینے والا ہو؟ یا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟ یا دجال کا انتظار ہے کہ اَن دیکھی چیزوں میں سب سے بدتر چیز ہے جس کا انتظار کیا جاتا ہے؟ یا پھر قیامت کا انتظار ہے؟ حالاں کہ قیامت تو بہت ڈرانے والی اور کڑوی حقیقت ہے۔

امروز و فردا

افادات:- عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے

دل میں کسی نیک عمل، یا کسی بھلائی، یا کسی عملِ خیر کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہوتا ہے، تو ایسے موقع پر نفس اور شیطان اس نیک عمل سے روکنے کے لیے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ کل کرلیں گے۔ شیطان کا معاملہ ایسا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب فریب اختیار کرتا ہے۔ کسی مؤمن کے متعلق یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی نیکی کے کام کے متعلق وہ یہ کہے کہ یہ کام کرنا ہی نہیں ہے، اس لیے جب اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا تو اس کو روکنے کے لیے شیطان یہ تدبیر اختیار کرتا ہے کہ اس کو کل پر ٹالنے کی کوشش کرتا ہے کہ کل اس کام کو کریں گے۔ یا کوئی آدمی جوانی کی عمر میں ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے، جب ادھیڑ عمر آئے گی، تب اعمالِ خیر کا اہتمام کریں گے۔ تو شیطان اور نفس اعمالِ خیر اور نیکی کے کام سے روکنے کے لیے کل پر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید فرماتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ میں سبقت کرو، یعنی جب دل میں اس کام کا داعیہ پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا شدہ اس داعیہ کی قدر کرتے ہوئے جلدی سے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرو۔

نیکی کے داعیہ کی قدر کرو

بزرگوں نے لکھا ہے کہ نیک کام کا داعیہ جب کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مہمان ہے۔ جیسے کسی کے گھر مہمان آئے، تو اس کی قدر کی جاتی ہے، اکرام کیا جاتا ہے، اور مہمان کے مناسب عزت واحترام کا معاملہ کیا جاتا ہے اگر آنے والے مہمان کا احترام نہ کیا جائے اور قدر نہ ہو، اور وہ مہمان اگر شریف الطبع ہے تو دوسری مرتبہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ اسی طریقہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک کام کا داعیہ آدمی کے دل میں ڈالا جاتا ہے، تو یہ وارِدِ روحانی ہوتا ہے،

یہ داعیہ باری تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا مہمان ہوتا ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے، اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس داعیہ پر فوری طور پر عمل کا اہتمام کرلے۔ اگر اس وقت ٹال دیا، فوری طور پر اس پر عمل نہیں کیا، تو ہوسکتا ہے کہ دوبارہ دل میں داعیہ پیدا ہی نہ ہو۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ داعیہ تو دل میں پیدا ہو، لیکن اس وقت عمل کا موقع نہ ہو؛ اس لیے نبی کریم ﷺ تاکید فرماتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ انجام دینے کے معاملہ میں سبقت اور جلدی کرو۔

بھلا دینے والا فقر

''هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلاَّ فَقْراً مُنْسِياً'' کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بُھلا دینے والا ہو؟ مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی نیک کام کرنے کے معاملہ میں تاخیر کیوں کررہے ہیں؟ کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ یہ کام کل انجام دیا جاسکے گا؟ ہوسکتا ہے کہ آج اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیک کام کرنے کے لیے اسباب عطا فرما رکھے ہیں، آج آپ کے پاس وسائل موجود ہیں، جتنا مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے اتنا مال بھی دے رکھا ہے، اب اگر آپ نے اس کام کو انجام نہیں دیا، تو ہوسکتا ہے کہ وہ مال آپ کے ہاتھ سے نکل جائے، اور ایسا فقر آجائے جو بُھلا دینے والا ہو، تو کیا تم اس بات کا انتظار کرتے ہو؟ یعنی آج جب اپنی خوشحالی کے وقت، عیش وآرام کی حالت میں نیکی کے کام کو انجام نہیں دے رہے ہو؛ تو کیا جب فقر وفاقہ آجائے گا جس کے اندر آدمی مصیبت کی وجہ سے اپنی ضرورت کی چیز بھی بھول جایا کرتا ہے، اس وقت تم نیکی کا کام کروگے؟ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب فقر کی مصیبت آتی ہے تو بہت سے اپنے کام بھی آدمی بھول جایا کرتا ہے۔ خدا نہ کرے ایسا وقت آئے، اس سے پہلے پہلے نیکی کے کام انجام دے دو۔

سرکش بنانے والی مالداری

''أَوْ غِنًى مُّطْغِياً'' یا تمہیں انتظار ہے ایسی مالداری کا جو سرکشی میں مبتلا کردینے والی ہو؟ بعض مرتبہ آدمی سوچتا ہے کہ ذرا حالت ٹھیک ہوجائے، ابھی مال کم ہے، ذرا مال آجائے۔ یا مال ہے لیکن کچھ زیادہ ہوجائے، تو اس وقت ہر نیک کام کو انجام دیں گے۔ اس وقت ہم کو فراغت کا موقع بھی مل جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متوجہ فرماتے ہیں کہ مال بڑھ جانے اور دولت کی زیادتی کی صورت میں تم بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نیکی کے کام کرو، ہوسکتا ہے کہ مالداری تم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ کردے۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مال کی جب فراوانی ہوتی ہے، دولت کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھتا ہے، اس کے احکام کو توڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایسی مالداری کا انتظار ہے جو تم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی میں مبتلا کردینے والی ہو؟

مہلک بیماری

''أَوْ مَرَضاً مُّفْسِداً'' یا تمہیں ایسی بیماری کا انتظار ہے جو تمہاری صحت کو خراب کرنے والی اور تمہارے قویٰ کو ختم کرنے والی ہو؟ یعنی آدمی سوچتا ہے کہ کل اس نیکی کے کام کو انجام دیں گے، حالاں کہ آج بدن میں تندرستی ہے، قویٰ کام کر رہے ہیں، آدمی اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور نیکی کے کاموں میں ان صلاحیتوں کو استعمال کرسکتا ہے، پھر بھی اگر آج اس کام کو انجام نہیں دیتا اور سوچتا ہے کہ کل کریں گے، آئندہ دیکھا جائے گا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کل ہوسکتا ہے کہ تم پر ایسی

بیماری حملہ کردے، کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوجاؤ جو تمہاری صلاحیتوں کو فاسد اور خراب کردے، تمہاری صحت اور قویٰ ایسے بگاڑ کر رکھ دے کہ جن اعضاء سے تم نیکی کے کام کر سکتے تھے وہ صلاحیت ہی تمہارے اندر باقی نہ رہے۔ تو کیا ایسی بیماری کا انتظار ہے؟ اس کے آنے سے پہلے پہلے صحت وتندرستی کو اور اپنی صلاحیت وسلامتی کو غنیمت سمجھ لو اور نیکی کا کام کرلو۔

سٹھیا دینے والا بڑھاپا

''أَوْ هَرَماً مُفَنِّداً'' یا بڑھاپے کا انتظار ہے؟ بعض مرتبہ آدمی سوچتا ہے کہ ابھی جوان ہوں، ابھی عمر ہی کیا ہے، ابھی تو دنیا کے اندر بہت رہنا ہے، اَدھیڑ عمر ہوگی، اس کے بعد بڑھاپا آئے گا، اس وقت نیکی کے اعمال کا اہتمام کریں گے۔ حالاں کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بڑھاپے کے اندر ہی آدمی کو موت آئے، دنیا کے اندر جوان بھی مرا کرتے ہیں، اس لیے بڑھاپے کی کوئی گارنٹی نہیں اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ پھر یہ ہے کہ بڑھاپا آ گیا تو ہوسکتا ہے کہ بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے آپ کے اعضاء کام ہی نہ کرسکیں۔ سٹھیا دینے والا بڑھاپا آجائے، جس کے نتیجے میں عقل بھی ماؤف ہوجاتی ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہوجاتی ہے، قویٰ بھی جواب دینے لگتے ہیں۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کیا ایسے بڑھاپے کا انتظار ہے؟ اس سے پہلے پہلے نیکی کا کام کرلو۔

اچانک کی موت

''أَوْ مَوْتاً مُجْهِزاً'' یا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟ آدمی سوچتا ہے کہ پھر کرلیں گے۔ ظاہر ہے کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے بڑے سے بڑے

ملحد اور دہریوں کو بھی انکار نہیں۔ ہر ایک کو یہ بات تسلیم ہے کہ موت آنے والی ہے۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں تو مقرر ہے لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کون سے وقت آ جائے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کیا اچانک کی موت کا انتظار ہے؟ اس لیے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جوانی کے بعد اَدھیڑ عمر آئے گی، پھر بڑھاپا اور پھر موت آئے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے پہلے بھی اچانک کی موت آ کر گرفتار کر لے۔ اگرچہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ موت سے پہلے موت کی علامتیں اور نشانیاں آدمی کے اوپر ظاہر ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی گویا اس کو نصیحت کی جاتی ہے۔

تم نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے

میں نے پہلے بھی واقعہ سنایا تھا جو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کسی کی ملاقات ملک الموت سے ہوگئی، انہوں نے کہا: دنیا کی حکومتوں کا دستور تو یہ ہے کہ کسی کو کوئی سزا دینی ہوتی ہے تو اس کو پہلے سے نوٹس دے کر آگاہ کیا جاتا ہے کہ آپ کو سزا دی جانی ہے؛ اور تمہارا معاملہ تو ایسا ہے کہ اچانک ہی آ جاتے ہو اور روح قبض کر لیتے ہو۔ ملک الموت نے جواب میں کہا: میری طرف سے تو اتنی زیادہ نوٹس دی جاتی ہے کہ اتنی کسی اور کی طرف سے نہیں دی جاتی ہوگی۔ بخار کا آنا، بیماریوں کا آنا، قویٰ کا کمزور ہونا، بال کا سفید ہونا، اولاد کی اولاد کا ہوجانا؛ یہ سب میرے نوٹس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے: ﴿أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ﴾ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ کوئی آدمی اپنی اصلاح کرنا چاہتا اور نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کرلیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔

یہاں ڈرانے والے سے مراد بعض مفسرین نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ آپ ﷺ نے آ کر آگاہ کر دیا کہ موت آنے والی ہے اور آپ نے لوگوں کو ڈرایا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب دینا ہے، اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی ہے۔ بعضوں نے کہا: اس سے مراد اولاد کی اولاد کا ہونا ہے۔ یعنی بیٹوں کے یہاں اولاد کا ہو جانا گویا اس بات کی علامت ہے کہ اب آپ کی رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آپ کو دنیا سے جانے کی تیاری کر لینی چاہئے۔ بالوں کا سفید ہو جانا، نگاہوں کا کمزور ہو جانا، شنوائی کی صفت کا متأثر ہو جانا؛ یہ ساری علامتیں ہیں۔ تو ملک الموت نے کہا: دیکھو! اتنے سارے نوٹس بھیجتا ہوں کہ کوئی بھی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہو گی؛ لیکن کیا کریں کہ ہمارے اتنے سارے نوٹس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا۔ (۱) (التذکرۃ: جلد ۱ ص: ۴۶)

دجّال

'' أَوِ الدَّجَّالَ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ '' یا پھر دجال کا انتظار ہے؟ ظاہر ہے کہ آدمی ابھی نیک اعمال نہیں کرتا، یوں سوچ رہا ہے کہ آئندہ زمانہ میں کریں گے، لیکن آنے والا زمانہ کیسا ہو گا اس کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ سخت سے سخت حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ معلوم نہیں آدمی کن مصائب کا شکار ہو جائے اور کیسے ماحول سے اس کو واسطہ پڑے۔ آج نیکی کا کام نہیں کرتا تو کیا دجال آئے گا تب نیکی کا کام کرے گا؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ اَن دیکھی چیزوں میں سب سے بدتر چیز جس کا انتظار کیا جاتا ہے وہ دجال ہے۔ یعنی دجال ایک ایسی حقیقت ہے جو ابھی تک وجود میں نہیں آئی، لیکن جو چیزیں ہم نے نہیں دیکھی ہیں، آئندہ زمانہ میں آنے والی ہیں، اور

---

(۱) نوٹ: - اس موضوع پر نہایت عمدہ تفصیل، حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد سوم، صفحہ ۵۰ تا ۵۷ پر ہے۔ ضرور ملاحظہ فرما لیں۔

جس کا انتظار کیا جاتا ہے، ان میں سب سے بدتر چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ دجال ہے۔ تو کیا اس کا انتظار ہے کہ وہ آئے گا تو ہم نیک اعمال کریں گے؟ حالاں کہ جب ابھی نیک کام کی طرف قدم نہیں بڑھتے، نیکی کی طرف طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، تو جب دجال دنیا میں آجائے گا اس وقت تو گمراہی کے دروازے زیادہ کھلے ہوئے ہوں گے؛ اس وقت نیکی کیا کر سکیں گے؟

قیامت

''أَوِ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ'' یا پھر قیامت کا انتظار ہے کہ جب قیامت قائم ہو جائے گی تب نیکی کے کام کریں گے؟ ظاہر ہے کہ قیامت بڑی سخت مصیبت لے کر آئے گی، اس کے بعد تو پھر نیکی کے موقع کا سوال ہی نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خاص طور سے متوجہ کیا کہ آدمی کے دل میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا ہو، اور اعمالِ خیر کے لیے طبیعت آمادہ ہو، اس وقت تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس داعیہ کی قدر کرتے ہوئے فوری طور پر نیک عمل میں لگ جانا چاہیے۔

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

۵۷۹:- وعنه قال قال رسول الله ﷺ: أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يَعْنِي الموتَ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی چیز موت کو کثرت سے یاد کرو۔

افادات:- موت زندگی کی ہر لذت کو ختم کر دینے والی ہے، اور جب

موت آجائے گی تو آدمی دنیا کے اندر کیسے ہی عیش و آرام میں رہتا ہو، کیسی ہی لذت میں ہو؛ ساری لذتیں ختم ہو جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس چیز کو کثرت سے یاد کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ چوبیس گھنٹوں میں اس کو کتنی مرتبہ یاد کرتے ہیں؟ رات کو سونے کے لیے جاتے ہیں اس وقت کیا کیا خیالات ہمارے دل و دماغ میں آتے ہیں؟ اپنے معاش کے متعلق بہت ساری چیزیں ہم سوچتے ہیں، اپنے کاروبار کے متعلق بہت ساری تدبیریں کرتے ہیں، اپنی تجارت و دکان کے متعلق اور اپنی دوسری چیزوں کے متعلق بہت کچھ غور و فکر کرتے ہیں، اور بہت ساری چیزوں کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہے؛ لیکن کبھی ہمیں موت کا خیال نہیں آتا۔ آدمی اپنی آنکھوں سے اپنے رشتہ داروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، اپنے ہاتھ سے ان کو غسل دیتا ہے، اپنے ہاتھ سے اپنے رشتہ داروں کو قبر میں اتارتا اور دفن کرتا ہے۔ کل جو زمین کے اوپر ہمارے سامنے چلتے پھرتے تھے آج وہ قبروں کے اندر ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہم دیکھتے ہیں اس کے باوجود ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے۔ ہماری سب سے بڑی بیماری ہی آخرت سے غفلت ہے۔ اگر آدمی موت کو اکثر یاد کرتا رہے، ہر وقت اس بات کا استحضار اور تصور ہو کہ موت آنے والی ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، اپنے کئے کا جواب دینا ہے، تو غفلت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی جو نافرمانیاں ہوتی ہیں، یا اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ان کی نوبت ہی نہیں آ سکتی، آخرت کا دھیان اور فکر ہی اصل چیز ہے۔ آدمی اگر موت کو یاد کرتا رہے تو پھر ایسی غفلت طاری نہیں ہو سکتی جس کے نتیجہ میں نافرمانی ہو۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موت کو کثرت سے یاد کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اب ہم اپنی حالت پر غور کریں کہ کیا ہم پورے چوبیس گھنٹوں میں کبھی ایک دو

مرتبہ بھی موت کو یاد کرتے ہیں؟ اس کی بھی ہمیں توفیق نہیں ملتی۔ اس لیے یہ خاص اور اہم چیز ہے جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جو آدمی دن میں پچیس مرتبہ یہ دعا پڑھتا ہے: **"أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِيْ فِي الْمَوْتِ وَفِيْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ"** پھر اگر اس کو اسی دن میں موت آ جائے تو شہداء کا درجہ ملے گا۔ (مؤطا: باب ما یکون من الموت شھادۃ. الحزب الاعظم، منزل الخامس، یوم الاربعاء، دعا رقم: ۴۵) دیکھو! موت کو یاد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت کے مقام کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔

موت کا مراقبہ

بزرگوں نے ایک مراقبہ کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ آدمی سونے سے پہلے تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے یہ سوچے: میری موت کا وقت قریب ہے، روح نکل رہی ہے، اب گھر والے میری آنکھیں بند کر رہے ہیں، اب لوگوں میں اعلان ہو رہا ہے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا، اب غسل کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، میرے کپڑے اتارے جا رہے ہیں، اب تخت پر لٹایا گیا اور غسل دیا جا رہا ہے، اس کے بعد کفن پہنایا جا رہا ہے، اب جنازہ میں رکھا جا رہا ہے، لوگ کندھوں پر اٹھا رہے ہیں، نمازِ جنازہ پڑھی جا رہی ہے۔ قبر میں اتارا جا رہا ہے، اب مجھ پر مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ کم سے کم سوتے وقت اس پورے منظر کا استحضار کرے؛ اسی کو **"مراقبۂ موت"** کہا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں آخرت کی فکر لاحق ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچنے کی توفیق ہوگی۔

درود شریف کا فائدہ

۵۸۰:- وعن أُبَيِّ بنِ كعبٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ **كَانَ رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **إِذَا ذَهَبَ ثُلُثُ**

اللَّيْلِ قَامَ، فَقَالَ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! اذْكُرُوا اللّٰهَ، جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ، تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ، جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيهِ، جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيهِ. قُلْتُ: يَارسول الله! إِنِّي أُكْثِرُ الصَّلَاةَ عَلَيْكَ، فَكَمْ أَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِي؟ فَقَالَ: مَا شِئْتَ. قُلْتُ: الرُّبُع؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ: فَالنِّصْف؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ: فَالثُّلُثَيْنِ؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ: أَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِي كُلَّهَا؟ قَالَ: إِذاً تُكْفَى هَمَّكَ، وَيُغْفَرُ لَكَ ذَنْبُكَ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گزر جاتا تھا تو اٹھتے اور فرماتے: اے لوگو! اللہ کو یاد کرو (ہمیں بھی اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ رات کے اخیری حصہ میں اٹھ کر اللہ کو یاد کریں) لرزہ دینے والی آ گئی، اس کے بعد میں آنے والی آ جائے گی (جب پہلا صور پھونکا جائے گا اس کے چالیس سال کے بعد دوسرا صور پھونکا جائے گا) موت اپنے تمام لوازمات کے ساتھ آ گئی (مطلب یہ ہے کہ موت کب آ جائے، یہ کہا نہیں جا سکتا۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ پر کثرت سے درود بھیجتا رہتا ہوں، دعاؤں کا میرا جو وقت ہے اس میں سے مَیں آپ پر درود بھیجنے کے لیے کتنا وقت تجویز کروں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جتنا تمہارا جی چاہے۔ میں نے کہا: چوتھائی حصہ آپ پر درود بھیجنے کے لیے الگ کر لوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہاں! تمہیں اختیار ہے، اگر اور زیادہ کر لو؛ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے کہا: کیا آدھا تجویز کر لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہیں اختیار ہے، اگر اس میں اور اضافہ کرو؛ تو تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: دو تہائی حصوں کو فارغ کر لوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہیں اختیار ہے، اگر اس میں اور زیادہ کر لو؛ تو

تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنے پورے وقت کو آپ پر درود پڑھنے کے لیے فارغ کرلوں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب تو تمہاری تمام ضرورتیں پوری کی جائیں گی، اور تمہارے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

افادات:- درود شریف کی کثرت کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہاری تمام پریشانیاں دور ہوجائیں گی اور تمہاری تمام ضرورتوں کی اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

بَابُ اسْتِحْبَابِ زِيَارَةِ الْقبورِ لِلرِّجَالِ وما يَقُوْلُهُ الزائر

مَردوں کے لیے قبرستان جانے کا استحباب اور وہاں کے مسنون اعمال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قبرستان جانا اور اس کے فائدے

نیا عنوان قائم کیا ہے: مَردوں کے لیے قبروں کی زیارت کا مستحب ہونا۔ جو آدمی قبروں کی زیارت کے لیے جائے تو وہ وہاں جا کر کیا کہے؟ کیوں کہ اس سے پہلے باب میں موت کی یاد کو ذکر کیا تھا، اور قبروں کی زیارت بھی موت کو یاد کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اسی مناسبت سے یہ باب لائے ہیں۔

۵۸۱:-عن بُرَيْدَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ **قَالَ قَالَ رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم **: كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عن زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا.** (رواہ مسلم)

وفي رواية: فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَزُورَ الْقُبُورَ فَلْيَزُرْ، فإِنَّهَا تُذَكِّرُنَا الآخِرَةَ.

ترجمہ:- حضرت بریدہ اُسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا؛ لیکن اب تم قبروں کی زیارت کرو۔

دوسری روایت میں بھی ترغیب آئی ہے: جو آدمی قبروں کی زیارت کرنا چاہے تو کرے، اس لیے کہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

افادات:- زیارتِ قبور کی پہلے ممانعت کر دی گئی تھی لیکن پھر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اجازت دے دی۔ اسی لیے بعض حضرات نے زیارتِ قبور کو مستحب کہا ہے۔ آدمی اگر قبروں کی زیارت کرتا رہے تو اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ موت یاد رہتی ہے اور اس کے نتیجہ میں آدمی کو تین فائدے حاصل ہوتے ہیں:-

[۱] توبہ کی توفیق ہوتی ہے۔

[۲] اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی عطا فرما رکھا ہے اس پر قناعت نصیب ہوتی ہے۔

۳ عبادات میں اطمینان اور دلجمعی حاصل ہوتی ہے۔

اور اگر آدمی موت کو یاد نہیں کرتا تو اس کے نتیجہ میں اس کے برعکس اس کو نہ تو توبہ کی توفیق ہوتی ہے، اور نہ اس کو اللہ کے دیئے ہوئے پر قناعت ہوتی ہے، بلکہ حرص پیدا ہو جاتی ہے کہ جو ملتا ہے اس سے اور زیادہ ملے اور زیادہ ملے۔اس کی تمنائیں، امیدیں اور آرزوئیں بڑھتی رہتی ہیں، عبادات میں بھی اطمینان اور دلجمعی نصیب نہیں ہوتی۔اس لیے قبروں کی زیارت کے مستحب ہونے کو بیان فرمارہے ہیں۔قبرستان جانا موت کو یاد دلانے کا ایک ذریعہ ہے۔

کیا عورتیں قبرستان جاسکتی ہیں؟

باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ''لِلرِّجَالِ'' یعنی ''مردوں کے واسطے'' کی قید لگائی۔اس سے بتانا چاہتے ہیں کہ مَردوں کے واسطے قبروں کی زیارت مستحب ہے، اس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔لیکن ایک سوال ہے کہ کیا عورتوں کے لیے بھی قبروں کی زیارت جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ مَردوں ہی کے لیے مستحب ہے، عورتوں کے لیے نہیں، اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد ہے جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے: لَعَنَ اللّٰہُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْر (مسند ابو یعلی:۵۹۰۸/السنن الکبریٰ للبیہقی:۷۴۵۵) قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

اور کچھ حضرات عورتوں کے لیے بھی قبروں کی زیارت کو مستحب تو نہیں کہتے، البتہ چند شرطوں کے ساتھ جائز کہتے ہیں۔وہاں جاکر اپنے غم کو تازہ نہ کرے۔بدعات کا ارتکاب نہ کرے۔

قبر کی زیارت کر کے مقصد تو فقط موت کو یاد کرنا اور آخرت کا استحضار ہے، پھر بھی علماءِ احناف میں سے متأخرین نے علیٰ الاطلاق عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کو ممنوع لکھا ہے، چاہے کوئی بھی عورت ہو، اور کسی بھی نیت سے جانا چاہتی ہو۔ چاہے وہ اہل اللہ کی قبریں ہوں یا اپنے رشتہ دار کی قبریں ہوں۔

بعض حضرات نے عورتوں کے لیے حرام ہونے کی تصریح کی ہے۔اس لیے کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کی قبروں پر عورتیں جائیں گی تو وہاں پر رونا دھونا ہوگا اور غم کو تازہ کرنا ہوگا۔اور بزرگوں اور نیک بندوں کی قبروں پر جائیں گی تو وہاں بدعات کا ارتکاب کریں گی، شریعت کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کریں گی۔اور مشاہدہ بھی ہے کہ عام طور پر وہاں یہی سب ہوتا ہے، اور حکم جو لگتا ہے وہ اسی بنیاد پر لگا کرتا ہے، اب اگر کوئی عورت ایسی چیزوں سے مستثنیٰ ہو، تو اس کی وجہ سے اس کو اجازت نہیں مل سکتی۔ بہر حال! متأخرین کا فتوی یہی ہے کہ عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت درست نہیں ہے

قبرستان جانے کی دعا اور آداب

۵۸۲:-وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كانَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كلَّما كَانَ لَيلَتُهَا مِنْ رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَخرُجُ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ إِلَى البَقِيعِ ،فَيقولُ: السَّلامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَأَتَاكُمْ مَا تُوعَدُونَ، غَداً مُؤَجَّلونَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لاَحِقُونَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لأَهْلِ بَقِيعِ الغَرْقَدِ.(رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی میری باری کی رات ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے آخری حصہ میں بقیع (جو مدینہ منورہ کا قبرستان ہے) تشریف لے جاتے، اور ان الفاظ وکلمات سے ان کو سلام کرتے تھے: اے مسلمانوں کی آبادی والو! تم پر سلام

ہو۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس چیز کا وعدہ کیا جاتا تھا وہ چیز تم تک پہنچ چکی، اور قیامت تک کے لیے مہلت ہے۔اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔اے اللہ تو بقیعِ غرقد یعنی اس قبرستان والوں کی مغفرت فرما۔

قبرستان کس دن جائے؟ مقاصدِ زیارت

افادات:-قبرستان کی زیارت کے سلسلہ میں علماء نے لکھا ہے کہ جمعہ کا دن اور اس میں بھی صبح کا وقت سب سے اچھا ہے۔اس لیے آدمی جمعہ کے دن صبح کے وقت قبرستان کی زیارت کے لیے جائے۔ویسے جمعہ سے ایک دن پہلے یعنی جمعرات، ایک دن بعد یعنی سنیچر، اسی طرح پیر؛ اس طرح کل چار دنوں- جمعرات، جمعہ، سنیچر اور پیر- میں قبروں کی زیارت کے لیے قبرستان جانے کو مستحب لکھا ہے، اور اس میں سب سے اچھا جمعہ کا دن ہے اور وقت صبح کا ہو تو زیادہ مناسب ہے، ورنہ جو وقت میسر آجائے۔

زیارتِ قبور ایک تو موت کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہوتی ہے، اس لیے جن قبروں کی زیارت کی جارہی ہیں ان کا پہچاننا بھی ضروری نہیں ہے، قبروں کا دیکھنا ہی آدمی کے لیے موت کی یاد کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوسرے یہ کہ زیارت؛ قبرستان میں جو مدفون ہیں ان کے لیے دعا کرنے کے واسطے ہوتی ہے، اس کے لیے بھی پہچاننا ضروری نہیں ہے، قبرستان جاکر وہاں والوں کے لیے دعائے مغفرت کرے، جیسے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت البقیع میں جو لوگ مدفون تھے ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

تیسرے یہ کہ زیارت؛ اپنے مرحوم رشتہ داروں، ماں باپ وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہوتی ہے، یہ ان کا ہم پر حق ہے اور اس کی ادائیگی کے مختلف طریقے

ہیں، ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آدمی ان کے لیے دعائے مغفرت کرے، ایصالِ ثواب کرے۔ تو قبرستان جا کر ان کی قبر کی زیارت کرنا بھی انہیں حقوق کی ادائیگی میں داخل ہے۔ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر اپنے ماں باپ کی قبروں میں سے کسی ایک کی زیارت جمعہ کے دن کرتا ہے تو اس کے لیے حج کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ (نوادر الاصول فی احادیث الرسول ۱/۱۲۶/ فیض القدیر شرح جامع الصغیر ۶/۱۸۳)

اور اللہ والوں کی قبر کی بھی زیارت کی جاتی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ان کی برکتوں میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔ مگر وہاں زیارت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب قبرستان میں قدم رکھے تو دعا اور سلام کے الفاظ پڑھے، جو آگے والی روایت میں بھی آنے والے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی باقاعدہ تعلیم دی ہے۔

زیارتِ قبور کی تعلیم

۵۸۳:- وعن بریدة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى الْمَقَابِرِ أَنْ يَقُولَ قَائِلُهُمْ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسلِمِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَلاحِقُونَ، أَسْأَلُ اللهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کو باقاعدہ سکھلاتے تھے کہ کوئی آدمی جب قبرستان جائے تو یوں کہے: تم پر سلامتی ہو اے مؤمنین اور مسلمین کی آبادی والو! اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے آ کر ملنے والے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں (اور اس کا بھی اضافہ کرے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔)

زیارت کی دعا میں ’’ان شاءاللہ‘‘ کیوں؟

افادات:- یہاں سوال ہوسکتا ہے کہ موت کا آنا تو یقینی ہے، پھر جو ’’ان شاءاللہ‘‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے؛ وہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ موت یقینی ہے؛ لیکن موت ایمان ہی پر آئے، اس کی کیا گارنٹی ہے؟ اور یہاں سلام مسلمانوں اور ایمان والوں کو کیا جا رہا ہے، اور ’’ان شاءاللہ‘‘ کا اضافہ اس لیے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہمیں بھی ایمان کے اوپر موت نصیب فرما کر تمہارے اندر شامل کرے گا۔

حسنِ خاتمہ اور سوءِ خاتمہ کے اسباب

ایمان کے اوپر موت نہ آنے کے جو اسباب ذکر کیے ہیں، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ آدمی نماز چھوڑے۔ دوسرا: شراب کا عادی ہو۔ تیسرا: ماں باپ کا نافرمان ہو۔ اور چوتھا: ایمان والوں کو تکلیف وایذاء پہنچاتا ہو۔ کتابوں میں خاص طور پر ان چار کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ان کاموں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے برے خاتمہ کا اندیشہ رہتا ہے۔

اور اگر کوئی آدمی مسواک کا اہتمام کرے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ امید ہے کہ اس کو ایمان کے اوپر موت نصیب ہوگی۔ اس لیے ہمیں ہر اس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے متعلق کتابوں میں لکھا ہو کہ اس کے نتیجہ میں ایمان کے اوپر موت نصیب ہوتی ہے اور خاتمہ اچھا ہوتا ہے۔ اور ہر اس چیز سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کے نتیجہ میں خاتمہ برا ہوسکتا ہے۔

قبرستان میں داخلہ کے وقت سلام

بہرحال! قبرستان میں داخل ہوتے وقت سلام کرے۔ پھر صاحبِ قبر کو بھی خصوصیت کے ساتھ ''السلام علیکم'' کہہ کر سلام کرسکتا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی مؤمن جب اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے اوپر سے گزرتا ہے جس کو وہ پہچانتا تھا، اور اس کو سلام کرتا ہے، تو صاحب قبر اس کو محبت سے دیکھتا ہے، اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کسی صاحبِ قبر کو بھی خاص طور سے اگر سلام کیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح کو لوٹاتے ہیں، پھر وہ سلام کا جواب دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے (مشکوٰۃ المصابیح مع شرحہ مراعاۃ المفاتیح، وذکرہ ابن القیم فی کتاب الروح تحت المسئلۃ الاولیٰ وہی ہل تعرف الاموات زیارۃ الاحیاء وسلامہم أم لا؟) اس لیے ایک تو قبرستان میں داخل ہوتے وقت عمومی کلمات سے سلام کرے، پھر جس کی قبر پر جارہا ہے اس کو بھی خصوصیت سے کلماتِ سلام کہے۔ جیسے کسی مجمع میں داخل ہوتے ہیں تو ''السلام علیکم'' کہتے ہیں، پھر کسی خاص آدمی سے ملتے ہیں تو الگ سے سلام کیا جاتا ہے۔

ایصالِ ثواب کا طریقہ

پھر قبرستان میں داخل ہوتے ہی عمومی انداز میں پورے قبرستان والوں کے لیے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرے۔ اس سلسلہ میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ آدمی قبرستان میں داخل ہونے کے بعد سورۂ فاتحہ۔ سورۂ بقرہ کا اول؛ الٓم سے مفلحون تک۔ آیۃ الکرسی۔ سورۂ بقرہ کا آخر یعنی آمن الرسول سے لے کر سورت

کے ختم تک ۔سورۂ یٰس ۔سورۂ تبارک ۔سورۂ تکاثر۔سورۂ اخلاص بارہ یا گیارہ یا سات یا تین مرتبہ۔(شامی،جلد۱/ص:۶۶۶) یہ سب پڑھ کر اس کا ثواب قبرستان والوں کو پہنچا دے؛ تو اس قبرستان میں جتنے بھی مردے ہیں ان کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ اس پڑھنے والے کو بھی ثواب عطا فرمائیں گے۔اس لیے جیسا موقع ہو اس کے مطابق پڑھے۔ اگر وقت ہے تو سب کے لیے الگ الگ ایصالِ ثواب کا بھی اہتمام کیا جائے۔

ایصالِ ثواب کی ایک شکل تو یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد یوں کہے: اے اللہ! میں نے جو کچھ پڑھا ہے، اس کا ثواب اس قبرستان کے تمام مردوں کو میری طرف سے پہنچا دے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ پڑھنے سے پہلے دل میں نیت کرے کہ میں ان کی طرف سے پڑھتا ہوں، تو پھر بعد میں کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ دل میں آپ نے نیت کی ہے پھر جو کچھ پڑھا ہے، اس کا ثواب پہنچ جائے گا۔ یہ دونوں شکلیں ہیں۔

ثواب پورا پہنچتا ہے، یا تقسیم ہو کر؟

پھر علماء نے مستقل ایک بحث لکھی ہے کہ پڑھ کر جو ثواب بھیجا جاتا ہے، وہ پورا پورا ہر ایک کو ملتا ہے، یا تقسیم ہو کر ملتا ہے؟ تو اصول، قاعدہ اور قیاس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ثواب تقسیم ہو کر ملے۔ جب آپ پڑھ کر سب کو دے رہے ہیں تو تقسیم ہی کیا جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے اگر کوئی آدمی امید رکھے کہ وہ ہر ایک کو پورا پورا ثواب دے گا؛ تو اس کی رحمت سے کوئی بعید بات نہیں ہے۔ وہاں تو آدمی کے اخلاص کو دیکھا جاتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جتنوں کو پڑھ کر بخشا ہے، ان سب کو پورا پورا ملے گا، اور جتنا ان کو ملا ہے اتنا ہی اس کو ملے گا اور اس کو پڑھنے کا الگ سے ملے گا۔ (شامی۱/ ۶۶۶) مثلاً آپ نے دس مرتبہ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" پڑھ کر دس

آدمیوں کو بخشا، تو ان دسوں کو دس دس مرتبہ "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" کا ثواب ملے گا، اور ان کے برابر آپ کو سو "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" کا ثواب ملے گا، اور آپ نے دس مرتبہ پڑھی ہے اس کا الگ یعنی ایک سو دس "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی چیز بعید نہیں ہے، آدمی اگر امید رکھے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے: "أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ" بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھتا ہے، ویسا ہی معاملہ میں اس کے ساتھ کرتا ہوں۔ اس لیے ہر ایک کو اس بات کی عادت بنا لینی چاہیے کہ جب مسلمانوں کے کسی قبرستان کے پاس سے گزر رہو رہا ہو، تو کم سے کم تین مرتبہ "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" پڑھ کر اس کا ثواب پورے قبرستان والوں کو پہنچا دے۔

زندوں کو بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

اس موقع پر علماء نے اس پر بھی کلام کیا ہے کہ مُردوں کی طرح زندوں کو بھی ثواب پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ چوں کہ مُردے محتاج ہیں وہ خود کوئی نیک عمل نہیں کر سکتے، اس لیے ان کو تو پہنچایا جاسکتا ہے، جب کہ جو لوگ زندہ ہیں وہ نیک عمل کرنے پر قادر ہیں، ابھی ان کا اعمال نامہ بند نہیں ہوا ہے، اس لیے وہ خود اپنے لیے کریں۔ ان کو ثواب نہیں پہنچایا جاسکتا۔ لیکن دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح ثواب مُردوں کو پہنچتا ہے، اسی طرح زندوں کو بھی پہنچتا ہے (شامی، جلد۱/ص: ۶۶۲) اس لیے کہ ایصالِ ثواب کا حاصل اتنا ہی ہے کہ آپ نے جو نیک عمل کیا، اس پر آپ کو جو اجر وثواب ملا، آپ اللہ تعالیٰ سے درخواست ودعا کر رہے ہیں کہ: اے اللہ! یہ ثواب جو مجھے ملا ہے، فلاں کو دیدے۔ جو ثواب آپ نے کمایا ہے اور آپ کے کھاتے میں جمع ہوا ہے، اب آپ اس کو دوسرے کے کھاتے میں ٹرانسفر کر رہے ہیں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

قبر کے پاس کس طرح کھڑا رہے؟

پھر آپ کسی مخصوص قبر کی زیارت کے لیے جائیں تو اس کے دائیں بازو پاؤں کی طرف کھڑے رہیں، اس طرح کہ آپ کی پشت قبلہ کی طرف ہو، اس لیے کہ مُردے کو قبر میں اُسی کروٹ لٹایا جاتا ہے۔ اگر آپ سرہانے کی طرف کھڑے ہوں گے تو اس کو دیکھنے میں تکلیف ہوگی، جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہو تو پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑتا ہے، اس میں دیکھنے والے کو زحمت ہوتی ہے، لیکن اگر سامنے کھڑے رہو تو اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ کتابوں میں یہی آداب لکھے ہیں۔ ہاں اگر وہاں ایسی جگہ نہیں ہے بلکہ قبریں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ پاؤں کی طرف جانے کی صورت میں قبر پر پاؤں رکھنے پڑتے ہیں، یا راستہ سرہانے کی طرف ہی ہے، تو پھر اس صورت میں مجبوری ہونے کی وجہ سے اجازت ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ آپ آرام سے پاؤں کی طرف سے جا سکتے ہیں تو پھر پاؤں ہی کی طرف اس طرح کھڑے رہیں کہ قبلہ کی طرف پیٹھ ہو اور مُردہ جو لیٹا ہوا ہے وہ لیٹے لیٹے آپ کو دیکھ رہا ہو۔ اور سلام بھی کیا جائے۔

دور کھڑا رہے یا قریب؟ تو لکھا ہے کہ اس کی زندگی میں جتنا دور اور قریب رہتے تھے، اسی طرح کا معاملہ کیا جائے۔ جیسے بڑا آدمی ہوتا ہے تو زندگی میں اس کی عظمت کی مناسبت سے ہم ایک دم قریب نہیں جاتے؛ بلکہ ادب کی وجہ سے تھوڑا سا دور ہٹ کر کھڑے رہتے ہیں، تو موت کے بعد بھی وہی مناسبت باقی رہے گی، اس لیے موت کے بعد بھی ہٹ کر کھڑے رہیں۔ اور اگر زندگی میں آپ بالکل قریب جاتے تھے تو قبر کے بھی بالکل قریب رہیں۔ اور ایصالِ ثواب کرنے کے بعد اس کے لیے دعائے مغفرت کا بھی اہتمام کیا جائے کہ **"دعائے مغفرت اہم ہے"**۔

ثواب پہنچنے کے بارے میں مذاہبِ ائمہ

ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں ایک چیز یاد رہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت معتزلہ کی ہے جو پہلے گزرے ہیں، وہ یوں کہتے ہیں کہ کسی بھی عمل کا ثواب نہیں پہنچتا، ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نیک عمل کا جو ثواب پہنچایا جاتا ہے وہ دو طرح کے ہیں: ایک مالی عبادتیں ہیں، اور دوسری جانی عبادتیں ہیں۔ تو مالی عبادتوں کا ثواب تو سب کے نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ اور جانی عبادتیں یعنی نماز پڑھ کر یا قرآن و تسبیح پڑھ کر جو ثواب ملتا ہے، وہ شوافع اور مالکیہ کے یہاں نہیں پہنچتا، اگرچہ شوافع کے متأخرین علماء نے فرمایا ہے کہ اس کا ثواب بھی پہنچ جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک دونوں قسم کی عبادتوں کا ثواب پہنچ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانی عبادتوں کے مقابلہ میں مالی عبادتوں کا اہتمام زیادہ کرنا چاہیے؛ تاکہ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک بالاتفاق وہ ثواب پہنچے۔

(شامی، جلد ا/ص: ۶۶۶)

دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب؟

اور دعائے مغفرت کے مفید ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے، اہلِ سنت والجماعت اور معتزلہ دونوں اس کو مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دعائے مغفرت مردہ کے حق میں مفید و کارآمد ہے، اس لیے اگر دعائے مغفرت کرلے تو ایک ایسی چیز ہو جائے گی جس کے میت کے حق میں مفید ہونے میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ ویسے بھی علماء نے لکھا ہے کہ ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعائے مغفرت کا اہتمام زیادہ ہونا چاہئے۔ لیکن ہم لوگوں کا مزاج برعکس بنا ہوا ہے۔ ہم لوگ دعائے مغفرت کے مقابلہ میں

ایصالِ ثواب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اذامَاتَ الِانْسانُ، اِنْقَطَعَ عنهُ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثلاثةٍ، صدقةٍ جاريةٍ، أَوْ علمٍ يُنْتَفَعُ بهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ" آدمی کا جب انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے؛ البتہ تین چیزیں باقی رہتی ہیں، یا تو اس نے کوئی ایسا نیکی کا کام کیا تھا جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، جیسے کہیں کنواں کھدوادیا، کہیں مسجد بنوادی، مدرسہ تعمیر کرادیا، مسافر خانہ تعمیر کرادیا، کوئی کتاب وقف کردی، یا علم کا کوئی سلسلہ جاری کردیا، کسی کو نماز سکھادی، اس نے دوسرے کو سکھائی، اس نے تیسرے کو سکھائی۔ یا کسی کو قرآنِ مجید پڑھنا سکھایا، اب وہ دوسروں کو سکھا رہا ہے؛ یہ سارے سلسلے ایسے ہیں کہ ان سے مرنے کے بعد بھی فائدہ ہوتا رہتا ہے، اس لیے ان کا ثواب بھی ملتا رہتا ہے۔

دعائے مغفرت زیادہ مفید ہے

یا اولادِ نیک ہے جو ماں باپ کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔ یہ دعائے مغفرت بہت مفید چیز ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ دعا کے مفید اور کارآمد ہونے کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! کسی کا کوئی عزیز یا رشتہ دار جیل میں ہو، اب ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی آدمی کوشش کرکے اس تک دو وقت کھانے کا ٹفن پہنچاتا ہے۔ اور دوسرا آدمی ٹفن تو نہیں پہنچاتا، مگر ذمہ داروں سے مل کر کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح یہ جیل سے باہر نکلے، اس کے لیے کیس تیار کراتا ہے، یا سفارش کراتا ہے کہ کسی طرح جلدی سے جیل سے باہر آجائے۔ تو اب آپ ہی بتاؤ کہ ٹفن پہنچانے والا زیادہ عمدہ کام کررہا ہے یا جیل سے نکالنے کے لیے کوشش کرنے

والے کی کوشش بڑھ کر ہے؟ یہ بات اور ہے کہ دونوں کی کوشش اپنی جگہ پر عمدہ ہے، اور دونوں کا کام محبت ہی کی وجہ سے ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ چھڑانے کی کوشش کرنے والا زیادہ اہم کام انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح سے ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعائے مغفرت کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔ ویسے دونوں کام اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔

اگر کوئی یوں کہے کہ جب اس کی مغفرت ہوگئی ہے، یا وہ اللہ کے نیک بندے ہیں جو بخشے بخشائے ہیں؛ اب ان کے لیے دعائے مغفرت کے کیا معنیٰ؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ دعائے مغفرت کی خاصیت ہے کہ کوئی آدمی کسی کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے، اگر اس کے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو یہی دعائے مغفرت اس کے لیے ترقیٔ درجات کا سبب بنتی ہے۔ معلوم ہوا کہ دعا ایک بہت ہی مفید اور کار آمد چیز ہے۔

تو قبروں کی زیارت کے سلسلہ میں جو باتیں اہم ہیں، وہ سب تفصیل سے ذکر کر دی گئیں۔

ایک مراقبہ

۵۸۴: وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: مرَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِقُبورٍ بالمدِينَةِ، فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: السَّلامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ، يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحنُ بالأثَرِ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر مدینہ منورہ میں چند قبروں کے پاس سے ہوا، آپ ان کی طرف اپنے چہرے سے متوجہ ہوئے (یعنی ان کے قریب گئے) اور آپ نے کہا: اے قبر والو! تم پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے (دیکھو! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعائے مغفرت فرمائی) تم ہم سے پہلے دنیا سے رخصت ہوئے، ہم تمہارے بعد میں آ رہے ہیں۔

افادات:- ظاہر ہے جانے والے چلے گئے، اب ہماری باری ہے۔ آدمی قبرستان میں جا کر یہ بھی سوچے، اور قبر والا جیسا آدمی تھا ویسا منظر سامنے لائے۔ بہت سی قبریں ایسے لوگوں کی ہوں گی جن کو آپ نے ان کی زندگی میں دیکھا تھا کہ کیسے حالات تھے، بعض کروڑ پتی تھے، بڑے رعب و دبدبے والے تھے، بڑے ثروت و دولت والے، بڑے عہدے ومنصب والے ایسے بھی ہوں گے جن سے آپ واقف تھے، ان کی قبر پر جب نظر پڑے تو آدمی کو سوچنا چاہیے کہ زندگی میں اس آدمی کا کیا حال تھا، اور آج قبر کے اندر پڑا ہوا ہے، کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اس غور وفکر کے نتیجہ میں آدمی کا دل دنیا کی طرف سے سرد ہوتا ہے، اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے، دنیا کی محبت کم ہوتی ہے، اور قبروں کی زیارت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔

غفلت کا انتہائی درجہ، اس کا علاج

ورنہ آج کل ہم لوگوں کا مزاج تو ایسا بنا ہوا ہے اور غفلت اتنی زیادہ طاری ہے کہ قبرستان میں ایک طرف میت کو دفن کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف لوگ ٹولیاں بنا بنا کر دنیا کی باتوں میں لگے ہوئے ہیں، اتنی دیر کے لیے بھی ہم سے خاموش رہا نہیں جاتا۔ بعض لوگ تو وہیں بیڑی سگریٹ پینے لگتے ہیں۔ قبرستان سے ہمیں جو عبرت حاصل کرنی چاہیے وہ ختم ہوگئی۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے: اب تو قبرستان سے عبرت حاصل کرنے کی ہماری صلاحیت بھی باقی نہیں رہی۔ ہاں! اتنا ہے کہ ہسپتال جاتے ہیں تو تھوڑا بہت اثر ہو جاتا ہے؛ لیکن اب تو دھیرے دھیرے وہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے، ہسپتال جا کر بھی اثر قبول کرنے والے پہلے کے مقابلہ میں کم لوگ رہ گئے ہیں۔ ہاں! کوئی اگر شدید مریض ہو جس کی کیفیت دیکھنے کے قابل نہ ہو؛ تو کچھ اثر ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ

کے یہ سارے حالات ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارا مزاج جو ایسا بنتا جارہا ہے وہ غفلت کا انتہائی درجہ ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غفلت کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بتلایا ہے، اور اس کے ذریعہ عبرت حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس لیے اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر وہاں جانے کے بعد بھی ہمارے دلوں پر اثر نہیں ہوتا؛ تو پھر ہماری اس قساوت، دل کی سختی اور غفلت کو دور کرنے کا کیا علاج کیا جائے۔ اس لیے آدمی کو کثرت سے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پہلے روزانہ وہاں جائے اور زیادہ وقت وہاں گزارے، یہاں تک کہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ جیسے: ایک آدمی کوئی میٹھی چیز کھا رہا ہے اور وہ اس کو کڑوی لگ رہی ہے، تو پھر اس آدمی کو سوچنا چاہیے کہ یہ میری بیماری ہے، مجھے اس کا علاج کرنا چاہیے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آدمی قبروں کی زیارت کا اہتمام کرے۔ ہم لوگ اس سلسلہ میں بڑی غفلت برتتے ہیں، بہت گنے چنے ہوتے ہیں جو اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ کم سے کم جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے قبرستان جائیں، پھر گھر میں قدم رکھیں۔ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ آج کل ایسا ہو گیا ہے کہ ایک صاحب کہنے لگے: اب تو مرنے والوں کو اتنا جلدی بھلا دیا جاتا ہے کہ موت کے بعد تیسرے چوتھے دن تو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ ویسے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ دفن کرنے کے بعد دفن کرنے والے قبر سے واپس رخصت ہونے لگتے ہیں تو ایک فرشتہ مٹھی میں مٹی اٹھا کر ان کے چہروں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ! اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ اور اس کو بھول جاؤ (شرح الصدور بشرح حال الموتیٰ والقبور، باب دفن العبر في الأرض التي خلق منها) اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ اس فرشتہ کی بات کا اثر ہم

بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔

خیر! یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے اتنے سارے واقعات پیش آتے ہیں ان کے بعد تو ہمارا جی کسی چیز میں لگنا ہی نہیں چاہیے۔ مرنے والوں کو دیکھ رہے ہیں اور دفن کر رہے ہیں، لیکن ہم پر انتہائی درجہ کی غفلت طاری ہو چکی ہے۔ حالاں کہ مزاج میں اعتدال ہونا چاہیے، اور ان باتوں کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

كَرَاهَةُ تَمَنِّي الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ وَلَا بَأْسَ بِهٖ لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ فِي الدِّيْنِ

کسی مصیبت کے سبب موت کی تمنا کا ناپسندیدہ ہونا اور دینی فتنہ میں مبتلا ہونے کے ڈر سے موت کی دعا کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پچھلے ابواب میں چند باتیں گزریں، پہلے موت کو یاد کرنے کا تذکرہ تھا، اس کے بعد والے باب میں قبروں کی زیارت کا طریقہ بتلایا تھا، ان ابواب کی وجہ سے شاید کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ موت کی دعا بھی کی جاسکتی ہے، موت مانگی بھی جاسکتی ہے؛ تو موت مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق تفصیل ہے جو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے تحت بتا رہے ہیں کہ کسی مصیبت کے نازل ہونے کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا منع ہے، البتہ اگر دین میں فتنہ کا ڈر اور خطرہ ہو، تو موت کی تمنا کی جاسکتی ہے۔

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیماری میں گرفتار ہوتا ہے، ایک مدت تک علاج و معالجہ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، لیکن وہ بیماری ٹھیک نہیں ہوتی، وہ آدمی اس بیماری کی وجہ سے پریشان ہو کر عاجز آ کر موت کی دعا و تمنا کرتا ہے۔ یا مالی و اقتصادی اعتبار سے مصیبت آئی، کھانے پینے کی تکلیف ہے، ادھر ادھر بہت کچھ ہاتھ پیر مارے، محنت بھی کی؛ لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا، طویل مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، گھر والے بھی تقاضے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ یا اولاد پریشان کرتی ہے، یا بیوی نافرمان ہے جس کی وجہ سے ٹینشن رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی دنیوی مصیبت کی وجہ سے، چاہے وہ بیماری کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں ہو، آدمی یہ سوچتا ہے کہ موت بھی نہیں آتی؟ اگر موت آجائے تو اچھا ہے۔ لیکن ایسے حالات کی وجہ سے موت کی تمنا اور دعا کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر موت مانگنی ہی ہے تو؟

اگر ایسے حالات آ گئے کہ پریشانی کی وجہ سے طبیعت موت کی دعا کرنے

کے لیے آمادہ ہی ہے، تو اس کا ایک طریقہ بتایا گیا کہ آدمی یوں دعا کرے: ''أَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ، وَتَوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ'' اے اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی میں بھلائی اور خیر ہے، اور مجھے موت دے اگر میرے لیے موت میں خیر اور بھلائی ہو۔ اس لیے کہ آدمی کا یقینی اور قطعی طور پر اپنے لیے موت کا سوال کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنے لیے گویا یہی سمجھتا ہے اور اس نے اپنے لیے فیصلہ کرلیا ہے کہ موت ہی میرے حق میں بہتر ہے، حالاں کہ ظاہر ہے اس کو آئندہ کے حالات معلوم نہیں کہ مستقبل اپنے اندر کیا چھپائے ہوئے ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ اس لیے آدمی اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کرے؛ بلکہ جب حالات ایسے ہوں تو یہ دعا کرسکتا ہے جو ابھی بتلائی، لیکن صراحتاً موت کی دعا مانگنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

دینی آزمائش کی وجہ سے موت مانگنا

البتہ اگر آزمائش اور حالات ایسے پیش آئے کہ دینی اعتبار سے نقصان کا اندیشہ اور خطرہ ہے کہ کہیں ایمان ہاتھ سے نہ چلا جائے، یا بدعملی میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ یقین کے درجہ میں ہو، یا غالب گمان ہو- صرف وہم کی بنیاد پر نہیں- تو اپنے آپ کو دینی ضرر اور نقصان سے بچانے کے لیے اگر وہ موت کی دعا کرتا ہے تو اس کی اجازت دی گئی ہے؛ ورنہ اجازت نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اخیری حج کیا جس کے بعد ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اس حج میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دعا کی تھی: اے اللہ! سلطنت کے حدود بہت پھیل چکے ہیں اور میرے قویٰ کمزور ہورہے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ تیرے بندوں

میں سے کسی بندے کا حق میرے ہاتھوں کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ایسا ہوا اس سے پہلے تو مجھے موت عطا فرما۔ وہاں سے واپس لوٹ کر جب مدینہ منورہ پہنچے اور ایک دو نمازیں ہی پڑھانے کی نوبت آئی تھی کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ (فتح الباری/ اسد الغابہ/ سیرۃ ابن الخطاب)

موت کی تمنا کرنے کی کوئی وجہ نہیں

۵۸۵:- عن أَبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ: أَنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قالَ: لا يَتَمَنَّ أحدُكُمُ الموْتَ، إمَّا مُحْسِناً فَلَعَلَّهُ يَزْدَادُ، وإمَّا مُسِيئاً فَلَعَلَّهُ يَسْتَعْتِبُ.

(متفقٌ عَلَيْهِ، وهذا لفظ البخاری)

وفی روایة لمسلم: عن أَبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قالَ: لاَيَتَمَنَّ أَحَدُكُمُ المَوْتَ، وَلاَيَدْعُ بِهِ مِنْ قَبْلِ أنْ يَأْتِيَهُ، إنَّهُ إذَا مَاتَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ وَ إنَّهُ لاَيَزِيدُ المُؤْمِنَ عُمُرُهُ إلاَّ خَيْراً.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے (کیوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگے خود ہی اس کی توضیح فرمائی ہے۔ اس لیے کہ موت کی تمنا کرنے والا دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ نیکوکار ہے، یا بدکار ہے۔ اعمالِ صالحہ پر مداومت کرنے والا ہے، یا برائیوں اور گناہوں میں مبتلا رہتا ہے) اگر وہ نیکوکار ہے تو (موت کی تمنا کیوں کرتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے اسے نیک کام کرنے کی توفیق دے رکھی ہے، تو آئندہ کی زندگی میں مزید نیک کام اس کے ہاتھوں وجود میں آئیں گے) اس کی نیکیوں میں اضافہ ہوگا (اور یہی چیز آخرت کے اعتبار سے درجات کی ترقی کا ذریعہ بنے گی۔ تو ایسے آدمی کے لیے تو زندگی میں فائدہ ہے، پھر کیوں موت مانگتا ہے؟) اور اگر وہ بدکار ہے (اس لیے موت کی

تمنا کرتا ہے تاکہ جلدی سے اس کو بدکاری سے نجات ملے) تو ہوسکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں اس کوتوبہ نصیب ہوجائے (نیکی کی توفیق مل جائے، اور وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرلے۔ اگر ابھی اسی حالت میں موت آجائے گی تو دنیا سے بغیر توبہ کے جائے گا، حالاں کہ اس کے لیے آئندہ امید اور توقع ہے کہ اعمالِ صالحہ اور توبہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرلے۔ اس لیے ایسا آدمی بھی کیوں موت کی تمنا کرتا ہے؟)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی روایت مسلم شریف میں دوسرے الفاظ سے آئی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے، اور موت آنے سے پہلے اس کی دعا بھی نہ کرے۔ اس لیے کہ جب وہ مرجائے گا تو عمل کا سلسلہ ختم ہوجائے گا (اس لیے کیوں ایسی چیز کی تمنا کررہا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اعمال کا سلسلہ ختم ہوتا ہے) اور مؤمن کی عمر اس کے لیے خیر ہی لے کر آتی ہے (اگر نیکوکار ہے تو اس کے لیے خیر ہونا ظاہر ہے، اور اگر بدکار ہے تو جیسا کہ اوپر آگیا کہ امید ہے اس کو توبہ نصیب ہوجائے؛ تو یہ زندگی اس کے لیے بھی خیر کا ذریعہ بنے گی)

موت کی قطعی دعا نہ کرے

۵۸۶:- وعن أنسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: لاَ يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ المَوْتَ لِضُرٍّ أَصَابَهُ، فَإِنْ كَانَ لاَ بُدَّ فَاعِلاً، فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الحَيَاةُ خَيْراً لِي، وَتَوَفَّنِي إِذَا كَانَتِ الوَفَاةُ خَيْراً لِي. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی کسی تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے- جو اس کو پہنچی ہے- موت کی تمنا نہ کرے۔ اور اگر دعا کرنی ہی ہے تو (پھر قطعی طور پر دعا نہ کرے کہ اے اللہ! مجھے موت دے ہی

دے، بلکہ) یہ دعا کرے: اے اللہ! اگر میرے لیے میری زندگی میں خیر و بھلائی ہے، تو مجھے زندہ رکھ۔ اور اگر میرے لیے موت کے اندر بھلائی ہے، تو مجھے موت نصیب کر۔

افادات:- دنیوی مصیبت چاہے جسمانی ہو، چاہے مالی ہو، چاہے کسی اور طریقہ کی ہو؛ بہر حال مصیبت، تکلیف اور بیماری کی وجہ سے آدمی موت کی تمنا نہ کرے، اور اگر کسی وجہ سے ایسی دعا کرنی ہی ہو، اس کی طبیعت موت کی دعا کرنے کے لیے بے چین ہو، تو پھر قطعی طور پر دعا نہ کرے، بلکہ یہ دعا کرے: اے اللہ! میرے لیے میری زندگی میں اگر خیر اور بھلائی ہے تو مجھے زندہ رکھ، اور اگر میرے لیے موت کے اندر بھلائی ہے تو مجھے موت عطا کر۔ اس لیے کہ وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے لیے کس چیز میں خیر و بھلائی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لیے آدمی کو مستقبل سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں میں قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جب بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے تو اسی انداز سے کرے۔

مانگی تھی تلے کو، ملی اوپر کو

پہلے بھی میں نے قصہ سنایا تھا، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک آدمی سفر کر رہا تھا، سواری کے لیے کوئی جانور نہیں تھا اس لیے پیدل سفر کر رہا تھا۔ جب چلتے چلتے تھک گیا تو دعا کرنے لگا: اے اللہ! سواری دیدے، گھوڑا دیدے، گھوڑی دیدے بار بار یہی دعا کرتا رہا۔ جب دیکھا کہ نہ گھوڑا مل رہا اور نہ گھوڑی مل رہی ہے، تو کہنے لگا: اے اللہ! گھوڑی کا بچہ ہی دیدے۔ خیر! پھر وہ تھکا ہارا راحت و آرام حاصل کرنے اور کچھ ستانے کے لیے ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کے قریب سے ایک سپاہی ایک گھوڑی پر سوار جا رہا تھا، اس کی گھوڑی حاملہ تھی۔ اتفاق کی بات کہ وہیں اس کی

گھوڑی کو بچہ پیدا ہوا۔ نیا پیدا شدہ بچہ تھا، اس کو چلانا تو مناسب نہیں تھا، اس لیے اس سپاہی نے اس آدمی کو ایک ڈنڈا مار کر کہا: چل اُٹھ! اور اُس کے کندھے پر اس بچہ کو ڈالا اور کہا: اس کو لے کر میرے ساتھ آگے آگے چل۔ اب یہ کہنے لگا کہ: اے اللہ! مانگی تھی تلے کو، مل گئی اوپر کو۔

عورتوں کی عادت

اس لیے جب اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگی جائے تو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ ہماری بہت سی ایسی دعائیں قبول نہیں کرتے ورنہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے مال اور اولاد سے ناراض ہو کر بددعا کرتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ تھوڑی تکلیف پہنچی تو کہتی ہیں کہ: یہ بچہ مر بھی نہیں جاتا، تکلیف دیتا رہتا ہے، مر جائے تو اچھا۔ پھر جب وہ دعا قبول ہو جاتی ہے تو زندگی بھر روتی پھرتی ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی بہت سی دعاؤں کو قبول نہیں کرتے۔ قرآنِ پاک میں بھی موجود ہے ﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُم بِالْخَيْرِ (یونس:۱۱)﴾ اس کی تفسیر بخاری شریف میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں (۱) تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس چیز کے متعلق یقینی معلوم نہ ہو، اس کے متعلق آدمی یقینی طور پر اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا نہ کرے۔

بددعا کا خاصہ

ایک بات ضمناً یاد آ گئی اس لیے بتلا دیتا ہوں۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ بعض مرتبہ کسی کو کوئی نقصان و تکلیف پہنچتی ہے، اب یہ سمجھتا ہے کہ فلاں آدمی نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا،

بلکہ کسی دوسرے نے کیا ہے۔ اب وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ فلاں نے میرے ساتھ ایسا کیا ہے، اس لیے اس کا نام لے کر اس کے لیے بددعا کرتا ہے کہ اے اللہ! اس کو موت آجائے، اس کا ایسا نقصان ہو جائے، وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ تو اس کے لیے بددعا اس لیے کر رہا ہے کہ یہی سمجھ رہا ہے کہ اسی آدمی نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور میرا نقصان کیا ہے، میرے گھر کو آگ اسی نے لگائی ہے، حالاں کہ اس نے اس کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا نہیں ہے، کسی نے اس کے ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے، اور اس کے دل و دماغ میں ایسا بھر دیا ہے۔

اور یاد رکھنا بددعا کا ایک خاصہ ہے۔ جو لوگ بددعائیں کرتے رہتے ہیں وہ بھی ذرا سنبھلیں، اس لیے کہ بددعا ایک طرح کی لعنت ہے۔ اور لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دور کر دینے کی دعا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی جب کسی کے لیے بددعا کرتا ہے تو یہ بددعا آسمان پر جاتی ہے، لیکن آسمان کے دروازے اس کے لیے بند کر دیئے جاتے ہیں، پھر نیچے آتی ہے اور جس کے لیے بددعا کی گئی ہے اس کے پاس جاتی ہے، اب اگر وہ اس بددعا کا حقدار ہوتا ہے، یعنی جس کے لیے بددعا کی گئی ہے، واقعتاً اس کی حرکتیں ایسی ہیں کہ اس نے ظلم و زیادتی کا معاملہ بددعا کرنے والے کے ساتھ کیا ہے؛ تب تو وہ اس کو لگ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ بلا وجہ اس کے لیے بددعا کی گئی ہے؛ تو پھر وہ اس کو نہیں لگتی، بلکہ بددعا کرنے والے پر ہی واپس لوٹ آتی ہے، اور اسی کو نقصان پہنچاتی ہے۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مثال

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے تھے کہ

بددعا تو ایک گیند کی طرح ہے، اگر آپ نے گیند پھینکی تو جہاں پھینکی گئی ہے وہ جگہ نرم ہے اور اس گیند کو اپنے اندر سمونے کی اس میں صلاحیت ہے تو وہ گیند اندر چلی جائے گی، اور اگر وہ جگہ اس قابل نہیں ہے، بلکہ سخت ہے، تو جس نے گیند پھینکی ہے اسی کے پاس واپس آ جائے گی۔ بددعا کا بھی یہی حال ہے۔

احتیاط والی بات

اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی کسی کے لیے بددعا کیوں کرے؟ اور اگر اپنے کسی نقصان کی وجہ سے ایسی نوبت آ ہی گئی ہے تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کسی کا نام نہ لے؛ بلکہ یوں کہے: اے اللہ! جس نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے، میرے گھر میں جس نے آگ لگائی ہے، اس کے ساتھ تو ایسا کر۔ اس لیے کہ ہوسکتا ہے جس کا نام لیا ہے اس نے نہ کیا ہو، کسی دوسرے نے کیا ہو۔ جب آپ یہی کہیں گے کہ جس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے، تو پھر وہ اپنی جگہ پر درست ہے۔ اب اگر آپ جس کے متعلق سمجھ رہے ہیں، اسی نے کیا ہے تو اس کو لگے گی۔ اور اگر اس نے نہیں کیا ہے بلکہ کسی دوسرے نے کیا ہے تو جس نے کیا ہے اس کو لگے گی۔ اس لیے بددعا کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اگر منع نہ ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا

۵۸۷:- وعن قيسِ بنِ أَبِي حَازِمٍ، قَالَ: دَخَلْنَا عَلَى خَبَّابِ بنِ الأَرَتِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نَعُودُهُ وَقَدِ اكْتَوَى سَبْعَ كَيَّاتٍ، فَقَالَ: إِنَّ أَصْحَابَنَا الَّذِينَ سَلَفُوا مَضَوْا، وَلَمْ تَنْقُصْهُمُ الدُّنْيَا، وَإِنَّا أَصَبْنَا مَا لَا نَجِدُ لَهُ مَوْضِعاً إِلَّا التُّرَابَ وَلولا أَنَّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم نَهَانَا أَنْ نَدْعُوَ بِالْمَوْتِ لَدَعَوْتُ بِهِ. ثُمَّ أَتَيْنَاهُ مَرَّةً أُخْرَى

وَهُوَ يَبْنِي حَائِطاً لَهُ، فَقَالَ: إِنَّ الْمُسْلِمَ لَيُؤْجَرُ فِي كُلِّ شَيْءٍ يُنْفِقُهُ إِلَّا فِي شَيْءٍ يَجْعَلُهُ فِي هَذَا التُّرَابِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت قیس بن اَبی حازم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت خباب بن اُرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے، ہم لوگ ان کے پاس عیادت وخبر گیری کے لیے حاضر ہوئے (حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان حضراتِ صحابہ میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لائے تھے، اور جن کو بڑی تکلیفیں پہنچائی گئیں تھیں) انہوں نے اس بیماری میں سات مرتبہ داغ لگوائے تھے (لکھا ہے کہ ان کو بواسیر کی تکلیف تھی، کسی طرح سے ٹھیک نہیں ہو رہی تھی، کسی نے یہ علاج بتلایا تو انہوں نے داغ لگوائے۔ جب ہم لوگ حاضر ہوئے تو) انہوں نے فرمایا: ہمارے وہ ساتھی جو انتقال کر گئے، انہوں نے دنیا کو ایسی حالت میں چھوڑا کہ دنیا نے ان کی آخرت کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور ہم دنیا میں زندہ رہے تو ہمارے ہاتھ میں اتنی دولت آئی کہ اس کو رکھنے کے لیے مٹی کے علاوہ اور کوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موت کی دعا سے ہم کو منع نہ کیا ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا (اس سے معلوم ہوا کہ موت کی دعا کرنے سے منع کیا گیا ہے) قیس بن حازم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: پھر دوبارہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت وہ اپنی ایک دیوار درست کرا رہے تھے (یعنی تعمیر کرا رہے تھے، جب ہم نے یہ دیکھا تو اس پر) انہوں نے کہا: مسلمانوں کو ان کے ہر اس کام میں جس میں وہ مال خرچ کرتے ہیں؛ ثواب ملتا ہے، مگر جو مال مٹی میں ڈالیں (یعنی تعمیر پر خرچ کرے اس میں ثواب نہیں ملتا)۔

افادات:- جب آدمی کو دنیا کے اندر کوئی بھی نعمت اور راحت پہنچتی ہے تو اس میں اس کے اعمالِ خیر کا دخل ہوتا ہے، اور جو تکلیف ومصیبت آتی ہے اس میں اس

کے اعمالِ بد کا دخل ہوتا ہے ﴿وَمَآ أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے وہ ساتھی جو ایمان لائے اور اس کے واسطے انہوں نے تکلیفیں اٹھائیں، ان تکلیفوں پر بڑے بڑے ثواب کے مستحق بنے، لیکن دنیا کی نعمتیں ان کو ہاتھ لگے اس سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس لیے کہ بعد میں فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا، بڑے بڑے ملک فتح ہوئے، اور مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں بے شمار دولت آئی۔ اگر وہ لوگ بھی یہ زمانہ پاتے تو ان کے پاس بھی یہ ساری چیزیں آتیں اور دنیا میں کچھ نعمتیں، مال و دولت اور ثروت ان کو بھی ملتیں، اور ان کو آخرت میں ان کے اعمال کا جو بدلہ ملنے والا ہے اس کے اندر کمی کا ذریعہ بنتیں، لیکن وہ تو ان سب میں سے کچھ بھی نہیں لے گئے؛ اس لیے ان کو آخرت میں پورا پورا بدلہ ملے گا۔ گویا دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ دنیا کی نعمتوں نے ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں ہونے دی، دنیا سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جتنے بھی اعمال کیے تھے ان کا پورا پورا بدلہ وہیں ملے گا۔ اور ہم دنیا میں زندہ رہے تو ہمارے ہاتھ میں اتنی دولت آئی کہ اس کو رکھنے کے لیے مٹی کے علاوہ اور کوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں صدقہ کرنے کے لیے درہم موجود نہیں تھا اور آج میرے گھر پر تیس چالیس ہزار درہم پڑے ہوئے رہتے ہیں۔

تعمیر میں خرچ ناپسندیدہ ہے

مسلمانوں کو ان کے ہر اس کام میں جس میں وہ مال خرچ کرتے ہیں- چاہے اولاد اور گھر والوں پر ہو یا دوست احباب پر- ثواب ملتا ہے، مگر جو مال مٹی میں ڈالیں یعنی

تعمیر کے اندر خرچ کریں، اس پر ثواب نہیں ملے گا۔ تعمیر پر مال خرچ کرنے کی حدیثِ پاک میں ممانعت آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کا گزر ہمارے پاس سے ہوا، اور ہمارا ایک جھونپڑا تھا جس کو ہم مٹی سے لیپ رہے تھے، تو حضور اکرم ﷺ نے تعمیر سے متعلق یہی ارشاد فرمایا جو اوپر گزرا۔ اس پر ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ جھونپڑا ہی تو ہے جس کو لیپ کر ذرا ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: موت تو اس سے بھی جلدی آنے والی ہے (ترمذی: باب ماجاء فی قصر الأمل/ابوداود: باب مَا جَاءَ فِي الْبِنَاءِ) یعنی جھونپڑا لیپ کر ٹھیک ٹھاک کرو گے تو اس ٹھیک کئے ہوئے جھونپڑے سے پورا فائدہ اُٹھانے کی نوبت بھی نہیں آئے گی، اس لیے کہ یہ جھونپڑا سال دو سال، چار سال تو ٹکے گا، اس سے پہلے تو موت آ جائے گی۔ معلوم ہوا کہ تعمیر میں مال خرچ کرنے کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مساجد کو مزین کرنے سے حدیثِ پاک میں ممانعت آئی ہے اور مساجد کو مزین کرنے کو قیامت کی نشانی بتلایا گیا ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث ِ پاک میں اس کی ممانعت کے باوجود آج تعمیر کا یہ حال ہے کہ عمارتیں آسمان کو چھو رہی ہیں؛ تو اگر ذرا سی ترغیب آئی ہوتی تو ہمارا کیا حال ہوتا!!!۔

بَابُ الْوَرَعِ وَتَرْكِ الشُّبُهَاتِ

احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وَتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًا وَّھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمٌ۔

ورع کا مطلب

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے: ورع کا بیان۔

ورع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی احتیاط اور بچاؤ سے کام لے۔ جس چیز سے شریعت نے منع کیا ہے اس سے بچنا تو ضروری ہے ہی، اگر کوئی آدمی اس کا ارتکاب کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ لیکن شریعت کی منع کی ہوئی کچھ چیزوں سے بچنے کے لیے آدمی ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن سے شریعت نے منع نہیں کیا ہے؛ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''ورع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بعض ایسے کاموں سے بھی اپنے آپ کو بچائے جو فی نفسہٖ جائز ہیں، لیکن ان کے کرنے کی صورت میں یہ خطرہ ہے کہ یہی کام کسی ناجائز کام تک لے جانے کا ذریعہ بنیں گے؛ اسی کا نام ''ورع'' ہے۔

تو ورع کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی ناجائز کام میں پھنس جانے اور مبتلا ہو جانے اور ناجائز چیز کا ارتکاب ہو جانے کے ڈر سے جائز کام کو بھی چھوڑ دے۔

شبہ والی چیز کو چھوڑ نا

عنوان کا دوسرا جزو تھا ''تَرْكُ الشُّبُهَات'' جس کام کے متعلق آدمی کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ یہ جائز ہے یا نا جائز- جس کو مشتبہ کہتے ہیں- ان چیزوں کو بھی چھوڑ دینا- کبھی کسی کام میں دونوں طرح کے پہلو ہوا کرتے ہیں، آدمی کسی ایک پہلو کو دیکھتا ہے تو اس کو وہ کام جائز معلوم ہوتا ہے، دوسرے پہلو سے اس کو دیکھتا ہے تو وہ کام ناجائز معلوم ہوتا ہے، گویا اس کام کے سلسلہ میں اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؛ تو اس کو بھی چھوڑ دے۔

تم اس کو معمولی سمجھتے ہو

باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا: ﴿وَتَحْسَبُوْنَهُ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللهِ عَظِيْمٌ﴾ تم اس کو معمولی سمجھتے ہو، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بہت بڑی چیز ہے۔ بعض مرتبہ کوئی معمولی اور چھوٹا سا کام ہوتا ہے، جس کو آدمی ہلکا سمجھ کر کر ڈالتا ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا اور قابلِ مؤاخذہ ہوتا ہے، اور اسی پر پکڑ دھکڑ ہو جاتی ہے۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکایاتِ صحابہ میں ایک قصہ ذکر کیا ہے۔ ایک بزرگ تھے، انہوں نے خط لکھا۔ اس زمانہ میں قلم سے لکھا جاتا تھا، اس کی روشنائی کو سکھانے اور خشک کرنے کے لیے مٹی استعمال کی جاتی تھی۔ خط لکھنے کے بعد اس خط پر مٹی ڈال دیتے تھے، وہ مٹی روشنائی کو چوس لیا کرتی تھی، پھر اس مٹی کو جھاڑ دیا کرتے تھے۔ تو خط لکھنے کے بعد اس پر ڈالنے کے لیے مٹی نہیں تھی۔ جس مکان میں رہتے تھے وہ کرایہ کا کچا مکان تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کی دیوار پر سے کچھ مٹی کھرچ کر اس پر ڈال لوں اور روشنائی کو خشک کر لوں، پھر خیال آیا کہ یہ مکان کرایہ کا ہے،

میں مالک تو ہوں نہیں۔ پھر سوچا کہ معمولی سی مٹی ہی تو ہے، اس لیے کھرچ کر ڈال دی، رات کو خواب میں دیکھا، کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے: کل قیامت میں پتہ چلے گا کہ یہ مٹی معمولی ہے یا نہیں!۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی کسی کام کو اپنے خیال سے چھوٹا سمجھتا ہے؛ لیکن یہی چھوٹا کام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بن کر اس کی قسمت کا فیصلہ کر ڈالتا ہے، اس لیے ایسی کسی بھی چیز کو معمولی نہ سمجھا جائے۔

اور گناہوں کا مسئلہ ایسا ہی ہے۔ گناہ کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی۔ علماء نے قرآنِ پاک کی آیتوں اور احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے گناہوں کی تقسیم صغیرہ اور کبیرہ کی ہے یعنی چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ۔ اس کے باوجود بعض اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ کوئی گناہ چھوٹا نہیں، سب گناہ بڑے ہی ہیں، انہوں نے اس پہلو سے دیکھا کہ گناہ کے ذریعہ نافرمانی کس کی ہو رہی ہے؟ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی نافرمانی ہو رہی ہے۔ اور اللہ کی عظمت، اس کی کبریائی، اس کی بڑائی اور اس کی شان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو کوئی معمولی نافرمانی بھی معمولی نہیں ہے۔ کوئی آدمی کسی بڑے آدمی کی شان میں کوئی معمولی چیز کر لیتا ہے، تو وہ بھی بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔

یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بدنگاہی کے متعلق پوچھا کہ: حضرت! بدنگاہی اور نامحرم کو دیکھ لینا؛ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ حضرت نے جواب میں لکھا کہ: چنگاری چھوٹی ہو یا بڑی؛ آگ لگانے کا کام تو دونوں ہی کرتی ہیں۔ ہمارے ایمان کو برباد کرنے کے لیے ایک بدنگاہی بھی کافی ہے۔ آدمی چھوٹی سی چنگاری اور جلتی ہوئی سگریٹ کو اپنے کپڑے کی پیٹی میں یہ سمجھ کر نہیں رکھتا کہ یہ چھوٹی سی تو ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پیٹی

کوجلانے کے لیے ایک سگریٹ بھی کافی ہے۔اس لیے آدمی کو گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کہیں رفتار کو قابو میں لانا پڑتا ہے

اور گناہوں سے بچنے کے لیے بہت سے ایسے کام جو فی نفسہٖ گناہ نہیں ہیں، لیکن ان کے کرنے کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے کہ آدمی کی طبیعت گناہوں تک پہنچ جائے، ان جائز کاموں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ جیسے: بیمار آدمی کو بہت سی چیزوں سے بچایا جاتا ہے، ان میں بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جو واقعۃً اس کے لیے مضر ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مضر تو نہیں ہوتیں لیکن اس کے باوجود گھر والے اس کے سامنے نہیں لاتے کہ اگر یہ کھائے گا تو ہوسکتا ہے کہ پھر معاملہ آگے بڑھے۔

ہم اپنے دنیوی معاملات میں ہر جگہ یہ سب باتیں سوچتے ہیں، جیسے کاروباری سلسلہ میں بھی سرکاری قانون کی رو سے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو ممنوع ہیں، اور بہت سے کام ممنوع تو نہیں ہوتے لیکن پھر بھی آدمی سوچتا ہے کہ اگر یہ کرلیں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پکڑ ہوجائے، اس لیے جو کام ممنوع نہیں ہیں ان سے بھی بچنے کا اہتمام کرتا ہے۔

یا جیسے آپ ڈرائیونگ کرتے ہیں۔تو ڈرائیونگ کے دوران بھی بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہوجائے، تو احتیاط کی خاطر وہاں اپنی رفتار کو قابو میں لے آتے ہیں۔ دین کی راہ پر چلنے والے آدمی کو بھی بہت سی مرتبہ اپنی رفتار کم کردینی پڑتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایکسیڈنٹ ہوجائے۔ جب ہم اپنے دنیوی معاملات میں ہر جگہ اس چیز کا خیال

کرتے ہیں کہ پکڑ دھکڑ نہ ہو جائے، اگرچہ وہ چیز اپنی ذات کے اعتبار سے کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بچاتے ہیں؛ تو پھر دین کے معاملہ میں ایسا کیوں نہیں سوچتے؟

مشتبہ سے بچا تو دین وعزت محفوظ

اب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کچھ احادیث پیش کرتے ہیں۔ آگے جو روایت لائی جارہی ہے وہ دین کے معاملہ میں بڑی اہم روایت ہے۔ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں، اپنے زمانہ کے بہت بڑے صاحبِ تقوی وطہارت بزرگ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں جمع کیں، پھر ان میں سے انتخاب کر کے ایک کتاب تصنیف کی تو ان پانچ لاکھ میں سے چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) روایتیں اس کتاب میں ذکر کیں، اسی کتاب کا نام ''سنن ابوداود'' ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ان چار ہزار آٹھ سو روایتوں کا خلاصہ صرف چار حدیثیں ہیں جن میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے جو ابھی آرہی ہے۔

۵۸۸:- وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رضی اللہ عنہما قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ: إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى، يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللهِ مَحَارِمُهُ. أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.

(متفقٌ عَلَيْهِ، وروياه مِنْ طرقٍ بِألفاظٍ متقاربةٍ.)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: حلال بھی واضح ہے، اور حرام بھی واضح ہے (یعنی شریعت نے بتلا دیا ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے) اور اس حلال وحرام کے بیچ بیچ میں بعض چیزیں مشتبہ ہیں جن کو بہت سے لوگ جانتے بھی نہیں (اور ان کے متعلق وہ آسانی سے فیصلہ بھی نہیں کر پاتے۔ اب جو آدمی اپنے دین کی حفاظت کرنا چاہتا ہو اور اپنے آپ کو دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچانا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ان مشتبہ چیزوں سے بچالے) اب اگر اس نے مشتبہ سے اپنے آپ کو بچالیا تو اپنے دین اور اپنی عزت وآبرو دونوں کی حفاظت کرلی۔ اور جو شبہ والی چیز کے اندر پڑا تو وہ حرام کے اندر مبتلا ہوجائے گا (اور اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مثال دے کر سمجھاتے ہیں) جیسے ایک چرواہا کسی چراگاہ کے قریب اپنے جانوروں کو چرا رہا ہو، تو ہوسکتا ہے کہ وہ ادھر منہ ڈال دے اور اندر چلا جائے۔ اور جان لو کہ ہر بادشاہ وحکمران کی کچھ چراگاہیں (باڑے) مقرر ہیں۔ خبردار! اللہ تعالیٰ کی چراگاہیں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ اور دیکھو! ہر آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے، اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑتا ہے۔ اور سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔

افادات:- ''إِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ'' مشتبہ چیزوں سے اگر بچ جائے گا تو دین بھی محفوظ رہے گا، یہ تو صاف بات ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے نہیں بچا تو آگے جا کر یہی چیز حرام میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بنے گی، اور جب حرام میں مبتلا ہوگا تو دین کہاں محفوظ رہا؟ تو مشتبہ سے بچنے میں گویا دین کی حفاظت ہوئی۔ اور عزت کی حفاظت اس طرح ہوتی ہے کہ جب آدمی کوئی مشتبہ کام کرتا ہے تو لوگ طعنہ دیتے ہیں اور بطور تعجب کہتے ہیں کہ فلاں نے ایسا کام کیا؟ گویا اس کی عزت پر آنچ آئی اور یہی

چیز اس کے لیے باعثِ عیب ہوئی۔ خاص کر دین دار طبقہ، جن کو دین سے کوئی تعلق ہوتا ہے، دینی معاملات میں کوئی مخصوص حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہ جب کبھی کوئی ایسا کام کر لیتے ہیں جو فی نفسہ تو جائز ہوتا ہے؛ لیکن کچھ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ،تو لوگ اسی کو موضوعِ بحث بنا لیتے ہیں کہ دیکھو! فلاں صاحب نے ایسا کیا۔ اب اگر کہا بھی جائے کہ وہ کام جائز تھا اس لیے کیا، اس میں کیا اشکال ہے؟ تب بھی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تو دیکھو! اگر یہ آدمی اپنے آپ کو اس کام سے بچاتا؛ تو اس کی عزت کی بھی حفاظت ہوتی۔

شاہی چراگاہ

پہلے زمانہ میں بادشاہ، حکمران اور نواب ہوتے تھے، ان کے یہاں زمین کا ایک بڑا حصہ شاہی چراگاہ کے طور پر مخصوص کر لیا جاتا تھا، وہاں کسی اور کو جانور چرانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ گویا ان کے جانوروں کے چرنے کے لیے ایک مخصوص باڑا ہوتا تھا اور اس کے متعلق اعلان کر دیا جاتا تھا کہ یہ سرکاری چراگاہ ہے، اس کے اندر کوئی دوسرا اپنے جانور نہ چرائے۔ اب اگر اس میں کوئی آدمی اپنے جانور چراتا تو وہ مجرم قرار دیا جاتا، اور اس کو سزا کا حقدار سمجھا جاتا۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک چرواہا اپنے جانوروں کو کسی مخصوص باڑے اور سرکاری چراگاہ کے قریب چرا رہا ہو، تو اگرچہ جانوروں کو اندر نہیں لے گیا، بلکہ اس باڑے کے باہر کا جو حصہ ممنوع نہیں ہے، اور جہاں چَرانے کی اجازت ہے؛ لیکن اس سرکاری باڑے کے بالکل قریب لگا ہوا حصہ ہے، تو ہو سکتا ہے کہ کبھی اس کی غفلت کی جہ سے کوئی جانور سرکاری چراگاہ میں منھ ڈال دے، یا اندر گھس جائے؛ تو اس پر پکڑ دھکڑ ہو جائے۔ بس! ہمارے نفس کا بھی یہی حال ہے، اگر ہم اپنے نفس کو دور دور سے نہیں بچائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ نفس اندر ہی مبتلا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں، سب حکمرانوں کے اوپر حکمران ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی قانون سے تعلق رکھنے والا کچھ حصہ ایسا ہے جس کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ کوئی اس کام کو نہ کرے۔ اسی کو حرام کہتے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے اس کو سرکاری باڑے اور چراگاہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس کے متعلق حاکم کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی نہ جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کاموں کا کوئی ارتکاب نہ کرے، یہ سرکاری چراگاہ ہے، کسی کو اس میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اب کوئی آدمی مشتبہ کام کرے گا تو مشتبہ چیز تو حرام کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس وہ مشتبہ کام کرتے کرتے اندر پہنچ جائے اور حرام کا ارتکاب کر لے۔

اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آ گیا تو......

پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ جیسے جسمانی نظام کے اعتبار سے دل صحیح ہو تو سب اعضاء صحیح رہتے ہیں، اور دل پر ذرا سی آنچ آ گئی تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے، اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آ گیا تو سارا دین گڑبڑ میں آ جائے گا، اور دل ٹھیک رہا تو سارا دین ٹھیک رہے گا۔ جسم کے اندر جتنے اعضاء ہیں وہ سب دل کے تابع ہیں۔ آنکھ دیکھے گی نہیں جب تک کہ دل نہیں چاہے گا، جب دل حکم دے گا کہ یہ دیکھو، تو آنکھ دیکھے گی۔ دل حکم دے گا کہ سنو تو کان سنے گا۔ دل حکم دے گا کہ یہ بولو، تو زبان بولے گی۔ دل حکم دے گا فلاں چیز پکڑو، تو ہاتھ آگے بڑھیں گے۔ دل حکم دے گا کہ فلاں جگہ جاؤ، تو قدم اٹھیں گے۔ اگر دل نہیں چاہے گا تو

پھر وہ کام نہیں ہوگا۔ جیسے کوئی کہے کہ یہ چیز کھاؤ، تو سامنے والا کہتا ہے کہ دل نہیں چاہتا، جب تک کہ آدمی کا دل نہیں چاہے گا وہاں تک وہ کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ پورا جسم ظاہری اعتبار سے بھی دل کے تابع ہے۔

نیت پر بنیاد کیوں؟

اسی لیے نیت کے اوپر بنیاد رکھی گئی ہے۔ نیت کیا ہے؟ دل کا چاہنا اور نہ چاہنا؛ اسی کا نام نیت ہے۔ اور یہ نیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ آپ کو اس کام پر آمادہ کرنے والا جذبہ کون سا تھا۔ وہ اگر ٹھیک ہے تو آپ کا کام بھی ٹھیک ہے، اور اگر وہ گڑبڑ ہے تو اس کام میں بھی گڑبڑ ہوگی۔

اس بات کا ڈر رہے گا

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو پیش کر کے خاص طور پر ''ورع'' ہی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! سرکاری چراگاہ کے اندر جانے کی ممانعت ہے، لیکن جو حصہ چراگاہ سے بالکل لگا ہوا ہے، وہ ممنوع حصہ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی چرواہا اپنے جانوروں کو لے کر اس حصہ میں چرائے گا تو اس بات کا ڈر رہے گا کہ کوئی جانور ممنوع حصہ کے اندر چلا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے، ان کے قریب قریب کی کئی چیزیں ایسی ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو حلال اور درست ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان سے بچنے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی چیزیں آگے بڑھ کر گناہ میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بن جائیں۔

ایک نمونہ

احکام میں بھی بہت مرتبہ اس کی رعایت کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! روزہ کی حالت میں مَیں اپنی بیوی کو بوسہ دے سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا۔ دوسرا آدمی آیا اور یہی سوال کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اجازت دیدی۔ دراصل پہلا سوال کرنے والا نوجوان تھا، اور ظاہر ہے کہ نوجوان کو اگر بوسہ کی اجازت دی جاتی، تو معاملہ جماع تک پہنچ سکتا تھا، اور دوسرا بوڑھا تھا اس میں وہ خطرہ نہیں تھا (ابوداود. باب کَرَاهِيَتِهِ لِلشَّابِّ. حدیث نمبر: ۲۳۸۹) ویسے فقہاء نے تو یہ قید کے ساتھ ہی بتادیا کہ جس کو اپنے اوپر یہ اندیشہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں معاملہ آگے پہنچ سکتا ہے تو اس کو اجازت نہیں ہے، ورنہ گنجائش ہے۔ بوسہ فی نفسہٖ مفسدِ صوم نہیں ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔ یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے۔

امام صاحب کا ورع

ہمارے اسلاف کا معاملہ دین کے بارے میں یہی تھا۔ وہ حضرات تو گناہوں سے بچنے کے معاملہ میں بہت زیادہ پختہ اور محتاط تھے، پھر بھی اپنے آپ کو معمولی معمولی چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دوپہر کے وقت جارہے تھے، گرمی کا زمانہ تھا۔ گرمی کے موسم میں آدمی کوشش کرتا ہے کہ سایہ کے اندر ذرا آرام سے چلے۔ تو وہاں دیواروں کا سایہ تھا اسی میں چلتے ہوئے جارہے تھے، چلتے چلتے اچانک سایہ میں سے باہر نکل آئے۔ کسی نے کہا: آپ باہر کیوں آ گئے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس مکان کی دیوار کا یہ سایہ ہے، اس صاحبِ مکان کو میں نے کچھ قرض دے رکھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آدمی یوں سمجھے کہ میں نے جو قرض دیا ہے اس کی وجہ سے اس کی چیز سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ اور جس کو قرض دیا جائے، پھر اس قرض کے بدلہ میں اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے؛ تو وہ سود ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کوفہ کے قریب ایک قافلہ لوٹا گیا، اور اس لوٹ کی کچھ بکریاں کوفہ کے مارکیٹ میں بکیں، کس نے بیچی اور کس نے خریدی، اس کا کچھ پتہ نہیں چلا، لیکن اتنا طے تھا کہ لوٹ کا مال مارکیٹ میں بکا ہے، اور اس میں بکریاں بھی تھیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کسی سے پوچھا: بکری کی عمر کتنی ہوا کرتی ہے؟ بتایا گیا: چھ سال۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چھ سال تک بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ حالاں کہ آپ کسی بھی مفتی سے پوچھئے تو وہ یہی کہے گا کہ آپ کے لیے بکری کا گوشت کھانا ممنوع نہیں ہے؛ لیکن وہاں صرف اس بات کا ڈر تھا کہ میں بکری کا گوشت کھالوں، تو کہیں وہی بکری نہ ہو جو لوٹی گئی تھی۔ وہ حضرات اس معاملہ کے اندر اتنا زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ ہمارے اکابرین اور بزرگوں کے اور بھی بہت واقعات ہیں جو اس سلسلہ میں بہت زیادہ محتاط تھے۔

ناظمِ مطبخ کا ورع

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ سنایا تھا کہ مظاہر علوم میں ایک استاذ مولانا ظہور الحق صاحب تھے جو ناظمِ مطبخ تھے۔ اور مطبخ میں جو کھانا پکتا ہے وہاں کا جو ذمہ دار ہوتا ہے اس کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ نمک اور مزہ کے اعتبار سے کھانا برابر ہے یا نہیں، اور یہ کام چکھ کر ہی ہوسکتا ہے، لیکن وہ اتنی زیادہ احتیاط کرتے تھے کہ خود کبھی نہیں چکھتے تھے، بلکہ کسی طالب علم کو بلا کر چکھواتے تھے، حالاں کہ اگر خود بھی چکھتے تو یہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی ہوتی اور شرعاً اس کی اجازت تھی؛ لیکن اپنے آپ کو اس سے بچاتے تھے۔

مہتمم صاحب کا ورع

حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مظاہر علوم کے مہتمم تھے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب جلسہ ہوتا تھا تو پورے جلسہ کا انتظام کرتے تھے، شام کو گھر سے ان کا جو کھانا آتا تھا، وہ ایک کونہ میں رکھ دیتے تھے اور رات کو سب کام نمٹا کر، مہمانوں کو فارغ کر کے اپنا وہی کھانا جو بالکل ٹھنڈا ہو چکا ہوتا تھا، ایک کونہ میں بیٹھ کر کے کھا لیتے تھے۔ اتنی زیادہ احتیاط فرماتے تھے۔

محشّیٔ بخاری کا ورع

حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جن کا حاشیہ بخاری شریف کے اوپر ہے۔ ان کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مظاہر کے چندہ کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ کلکتہ ہی میں کسی جگہ ملاقات کے لیے تشریف لے گئے (جیسے یہاں نشاط سوسائٹی سے کوئی آدمی کسی کی ملاقات کے لیے چوک بازار جائے تو اس میں کرایہ خرچ ہوتا ہے) لیکن انہوں نے اس جگہ جانے کے لیے مدرسہ سے کرایہ وصول نہیں کیا، اور لکھا کہ اگر چہ میں وہاں گیا تو سب سے زیادہ چندہ ہوا؛ لیکن وہاں جانے میں میری نیت چندہ کرنے کی نہیں تھی؛ بلکہ اپنے ذاتی کام کے لیے ایک شخص سے ملاقات کی نیت تھی، اگر چندہ کی نیت سے جاتا تو مجھے حق تھا کہ مدرسہ سے کرایہ وصول کروں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رجسٹر کے اندر یہ نوٹ لکھا تھا، میں نے خود وہ نوٹ لکھا ہوا دیکھا ہے۔

طالبِ علمی کے زمانہ میں احتیاط

حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اکابر میں گزرے

ہیں۔ان کے حالات میں لکھا ہے کہ دہلی میں پڑھتے تھے، وہ طالبِ علمی کے زمانہ میں صرف روٹی کھاتے تھے، کبھی روٹی سالن کے ساتھ نہیں کھائی۔کسی نے کہا: آپ صرف روٹی کھاتے ہیں؟ تو کہا: دہلی میں جتنے بھی سالن بنتے ہیں، ان میں امچور ڈالا جاتا ہے (امچور یعنی کچے آم کو سکھا کر رکھ لیا جاتا ہے، اور سالن کے اندر کھٹائی پیدا کرنے کے لیے ڈالتے ہیں۔دلی والوں کے یہاں ہر سالن میں ڈالا جاتا ہے) اور ہمارے علاقہ کے اندر آموں کے باغات کی بیع صحیح نہیں ہوتی؛ اس لیے یہ سالن نہیں کھاتا۔اتنا زیادہ احتیاط فرماتے تھے!۔

......پھر ایک خط نہ لیتے

حضرت مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے بارے میں لکھا ہے کہ دہلی سے کاندھلہ جاتے تو بہلی والوں سے پہلے سے معاملہ کرلیا کرتے تھے اور اپنا پورا سامان بتلادیتے تھے کہ میں سوار ہوؤں گا اور یہ میرا سامان ہے، اور اتنا کرایہ ہوگا۔یہ سب طے ہوچکنے کے بعد اگر کوئی آدمی آتا اور کہتا کہ حضرت! آپ کاندھلہ تشریف لے جارہے ہیں، میرا یہ ایک خط لے جایئے، تو حضرت فرماتے: دیکھو! میں اس سے معاملہ کرچکا ہوں اور اپنا سارا سامان بتلاچکا ہوں جس میں یہ خط نہیں تھا، اب تم اس سے پوچھ لو، اگر وہ اجازت دے، تو میں یہ خط لوں گا، ورنہ نہیں۔حالاں کہ ایک خط لینے میں کون سا وزن بڑھ جاتا؛ لیکن نہیں لیتے۔یہ ان کے تقویٰ اور ورع کی بات تھی۔

پرہیز گاری برتنا ہر ایک کا کام نہیں

ایک مرتبہ بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے کاندھلہ جارہے تھے۔اور بزرگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق بات کرتے ہیں۔راستہ میں

بیل گاڑی چلانے والے سے پوچھا: تم بیل کو کتنا چارہ دیتے ہو اور تمہاری تنخواہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ دورانِ گفتگو اس نے کہا: یہ گاڑی تو ہماری نہیں ہے، یہ تو ہماری مالکہ کی ہے۔ پوچھا: کون ہے؟ پتہ چلا کہ یہ بیل گاڑی کسی طوائف اور رنڈی کی ہے۔ یہ سن کر حضرت کو ایک دم جھٹکا سا لگا، لیکن فوراً نہیں اترے بلکہ تھوڑی دیر چلنے دیا، پھر کہا: گاڑی ذرا ٹھہراؤ، مجھے استنجے کا تقاضہ ہے، اور فارغ ہو جانے کے بعد اپنا ڈھیلا سکھانے کے لیے پیدل چلتے رہے، گاڑی چل رہی ہے اور حضرت بھی ساتھ چل رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا: حضرت! بیٹھ جایئے، تو حضرت نے کہا: ذرا پاؤں کی رگیں پھول گئی ہیں، اس لیے پاؤں چھوٹے کر رہا ہوں اور چلتے رہے۔ چلتے چلتے جب کافی دیر ہوگئی تو وہ بھی سمجھ گیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پتہ چل گیا کہ یہ طوائف کی ہے، اس لیے نہیں بیٹھیں گے۔ تو اس نے کہا کہ: حضرت! اگر ایسا ہو کہ آپ بیٹھنے والے نہ ہوں تو میں واپس چلا جاؤں۔ حضرت نے کہا کہ: یہ بات تو صحیح ہے کہ میں نہیں بیٹھوں گا؛ لیکن تم کو میرے ساتھ وہاں تک چلنا ہوگا، اس لیے کہ میرے ساتھ معاملہ کیا ہے اور میری وجہ سے دوسرے گاہکوں کو منع کیا ہوگا، تو اس کا نقصان ہوگا اور مجھے یہ گوارہ نہیں ہے۔ پھر خالی گاڑی وہاں تک لے گئے، اور پورا کرایہ ادا کیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر حاشیہ لکھا ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری برتنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ خالی گاڑی اس لیے ساتھ لے گئے کہ بعض لوگوں کو کام کیے بغیر کرایہ لینا اچھا معلوم نہیں ہوتا، تو اس پر بھی بوجھ نہ پڑے کہ حضرت تو بیٹھے نہیں، اب میں اس کا کرایہ کیوں لوں؟

میں نے بات سمجھنے کے لیے یہ چند نمونے بتلائے کہ اگر مسئلہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کام جائز ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ لوگ احتیاط کرتے تھے۔ جیسے بعض

لوگ کہتے ہیں کہ فتویٰ کے اعتبار سے جائز ہے اور تقویٰ کے اعتبار سے ناجائز ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی گناہ میں پھنس جانے کے ڈر سے جائز کام کو بھی آدمی چھوڑ دے؛ اسی کا نام ورع ہے، اور اس کی حدیثِ پاک میں تاکید آئی ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ورع

۵۸۹:- وعن أنسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَجَدَ تَمْرَةً فِي الطَّرِيقِ، فَقَالَ: لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لأَكَلْتُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راستہ میں ایک کھجور کا دانہ ملا تو آپ نے فرمایا: اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ دانہ صدقہ کا ہوگا، تو میں اس کو کھا لیتا۔

افادات:- یعنی ایک طرف امت کو اس بات کی تعلیم بھی دیدی کہ کھانے کی ایک چیز پڑی ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، ضائع نہیں ہونی چاہیے، لیکن اپنے آپ کو اس کو کھانے سے اس لیے بچا رہے ہیں کہ ہوسکتا ہے کھجور کا یہ دانہ صدقہ کا ہو، اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے صدقہ کھانا منع تھا، اس لیے آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔ تو کھجور کا وہ دانہ صدقہ کا ہوگا صرف اس ڈر کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو استعمال نہیں فرمایا؛ یہی ورع ہے۔ حالاں کہ یقینی طور پر اور گارنٹی کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ صدقہ ہی کا ہے۔

جس چیز پر دل کھٹکے......

۵۹۰:- وعن النَّوَاسِ بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: البِرُّ: حُسْنُ الخُلُقِ. وَالإِثْمُ: مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ. (رواہ مسلم)

((حَاكَ)) بِالحاءِ المهملةِ والكافِ: أَيْ تَرَدَّدَ فِيهِ

ترجمہ:- حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نیکی یہ ہے کہ آدمی کے اخلاق اچھے ہوں۔ اور گناہ یہ ہے جو دل میں کھٹکے، اور اس سے لوگ واقف ہوجائیں اس کو تو ناپسند کرے۔

۵۹۱:- وعن وَابِصَةَ بن مَعبدٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: جئتَ تَسأَلُ عَنِ البِرِّ؟ قُلْتُ: نَعَمْ. فَقَالَ: اسْتَفْتِ قَلْبَكَ. البرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ القَلْبُ. وَالإِثْمُ: مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ، وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ، وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتُوكَ. (حديث حسن، رواه أحمد والدَّارمِيُّ في مُسْنَدَيْهِمَا.)

ترجمہ:- حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا (اس سے پہلے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ پوچھوں) آپ نے خود ہی فرمایا: نیکی کیا ہے، اس کے متعلق پوچھنے کے لیے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے دل سے فتویٰ لے لو۔ جس کام پر دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے۔ اور جس کام کے متعلق دل میں کھٹکا اور تردد ہو (کہ کروں یا نہ کروں؛ تو سمجھ جاؤ کہ) یہی گناہ ہے، چاہے فتویٰ دینے والے تمہیں فتویٰ دے دیں۔

وہی ''دل'' کہلانے کے لائق ہے

افادات:- جس چیز کے متعلق دل میں کھٹکا ہو؛ اس کام کو نہیں کرنا چاہیے، احتیاط کا تقاضہ یہی ہے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ وہ آدمی جس کا دل گناہوں سے پاک ہو؛ وہی دل ''دل'' کہلانے کے لائق ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کسی آدمی نے مسلسل گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے اپنا قلب ہی خراب کرلیا ہے، اور اب زنا کر کے بھی اس کو کھٹکا پیدا نہ ہو، اور وہ یوں کہے کہ مجھے تو کوئی کھٹکا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی

بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بلکہ وہاں تو یوں کہا جائے گا کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو چکی ہے، اور مسخ شدہ فطرت معیار قرار نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً: کسی کی ٹانگ ہی ٹیڑھی ہو تو سیدھا جوتا اس کے اندر نہیں آ سکتا۔

احتیاطاً بیوی کو الگ کر دیا

۵۹۲:- وعن أَبِي سِرْوَعَةَ عُقبَةَ بنِ الحارِثِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابنَةً لأبي إِهَابِ بن عزيزٍ، فَأَتَتْهُ امْرَأَةٌ، فَقَالَتْ: إِنِّي قَدْ أَرْضَعْتُ عُقْبَةَ وَالَّتِي قَدْ تَزَوَّجَ بِهَا. فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ: مَا أَعْلَمُ أَنَّكِ أَرْضَعْتِنِي وَلاَ أَخْبَرْتِنِي، فَرَكِبَ إِلَى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بِالْمَدِينَةِ، فَسَأَلَهُ: فَقَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: كَيْفَ؟ وَقَدْ قِيلَ. فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجاً غَيْرَهُ. (رواه البخاری) ((إِهَابٌ)) بكسر الهمزة و((عَزِيزٌ)) بفتح العين وبزای مكررة.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو سروعہ عقبہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو اہاب بن عزیز کی بیٹی (جویریہ) سے نکاح کیا۔ ایک سیاہ فام عورت آئی اور اس نے کہا: میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے، اور اس لڑکی کو بھی دودھ پلایا ہے جس کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے (گویا اس عورت کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں اس لیے ان کا نکاح آپس میں نہیں ہو سکتا) تو اس پر حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: مجھے معلوم نہیں ہے کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہو، اور اگر پلایا تھا تو میں جوان اور بڑا ہو گیا، آج تک تم نے مجھے اطلاع اور خبر کیوں نہیں دی؟ (گویا ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تیری اس خبر میں مجھے شک ہے، اس لیے وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ لیکن بہر حال! یہ ایک اہم بات تھی، چوں کہ حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے اس لیے باقاعدہ یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پر ایک عنوان قائم کیا ہے: "بَابُ الرِّحْلَةِ فِی الْمَسْئَلَةِ النَّازِلَةِ" کوئی مسئلہ پیش آئے اس کو دریافت کرنے کے لیے مستقل سفر کرنا۔ ہمارے اکابر اور اسلاف کا یہی حال تھا۔ اتنا سا ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے اُس زمانہ میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ آج کل تو ایکسپریس ہائی وے اور "A.C" بسیں چلتی ہیں، پھر بھی ہم ایسا اہتمام نہیں کرتے) تو یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کَیْفَ؟ وَقَدْ قِیْلَ" تم اس کو اپنے نکاح میں کیسے باقی رکھ سکتے ہو، جبکہ یہ بات کہی گئی؟ (یعنی اگرچہ آج تک تمہیں اس کی اطلاع نہیں ہوئی اور نہ اس نے تم کو بتلایا، اور نہ تمہیں معلوم ہے؛ لیکن جب اس کی زبان سے یہ بات نکلی ہے، تو اب ظاہر ہے کہ ایک کھٹکے والی چیز ہوگئی، اس لیے احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس عورت کو نکاح میں باقی نہ رکھا جائے۔ آپ نے جدائی کے لیے صاف طور پر نہیں کہا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے جدائی کے لیے فرمایا) چناں چہ حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت سے جدائی اختیار کرلی اور اپنے نکاح سے نکال دیا اور اس عورت نے دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کرلیا۔

ایک مسئلہ

افادات: ۔ویسے فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ اگر کوئی ایک عورت کسی کے متعلق دودھ پلانے کی اطلاع دے تو صرف اس کی اطلاع سے دودھ پلانے کا مسئلہ ثابت ہوگا یا نہیں؟ ہم اس وقت اس سے بحث نہیں کرتے، لیکن یہاں پر اکثر حضراتِ علماء یہی فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس سے بچنے کی جو تاکید فرمائی تھی وہ ورع کے طور پر تھی۔ یعنی اس کا احتمال ہے کہ واقعی

اس نے دودھ پلایا ہو۔ اور جب اس کی بات سچی ہو تو ان کے لیے اس سے نکاح کرنا حرام ہے۔ تو صرف حرام کے ڈر سے بھی آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے۔

شک والی چیز چھوڑ کر......

۵۹۳:- وعن الحسن بن علی رضی اللہ عنہما قَالَ: حَفِظتُ من رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

معناه: اتْرُكْ مَا تَشُكُّ فِيهِ، وَخُذْ مَا لَا تَشُكُّ فِيهِ.

ترجمہ:- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سن کر یہ کلمہ اور جملہ یاد کرلیا ہے: "دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ" یعنی شک والی چیز کو چھوڑ کر بغیر شک کی چیز کو اختیار کرو۔

افادات:- کسی معاملہ میں شک و تردد ہو، تو تردد والی چیز کو چھوڑ دو۔ آدمی کو بلا تردد والی چیز کو اختیار کرنی چاہیے؛ ورع کا خلاصہ یہی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ

۵۹۴:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ لِأَبِي بَكْرٍ الصديق رضی اللہ تعالیٰ عنہ غُلَامٌ يُخْرِجُ لَهُ الخَرَاجَ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهِ، فَجَاءَ يَوْماً بِشَيْءٍ، فَأَكَلَ مِنْهُ أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الغُلَامُ: تَدْرِي مَا هَذَا؟ فَقَالَ أَبُو بكر: وَمَا هُوَ؟ قَالَ: كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِإِنْسَانٍ فِي الجَاهِلِيَّةِ، وَمَا أُحْسِنُ الكَهَانَةَ، إِلَّا أَنِّي خَدَعْتُهُ، فَلَقِيَنِي، فَأَعْطَانِي لِذَلِكَ هَذَا الَّذِي أَكَلْتَ مِنْهُ، فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَهُ، فَقَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِي بَطْنِهِ. (رواه البخاري)

((الخَرَاجُ)): شَيْءٌ يَجْعَلُهُ السَّيِّدُ عَلَى عَبْدِهِ يُؤَدِّيهِ كُلَّ يَومٍ، وَبَاقِي كَسْبِهِ يَكُونُ لِلْعَبْدِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک غلام تھا جس کو انہوں نے خراج پر اٹھا رکھا تھا، اس کا خراج استعمال کرتے تھے۔ (غلام سے کہہ دیا تھا کہ تم کماتے رہو اور اس میں سے مجھے اتنا حصہ دے دینا۔ وہ جو لاتا تھا اس کو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے استعمال میں لاتے تھے) ایک دن وہ غلام کھانے کی کوئی چیز لے کر آیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو کھالیا (مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابھی ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ) اس غلام نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ (دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ غلام نے کہا: آپ تو روزانہ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے لایا، اور آج آپ نے نہیں پوچھا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فاقہ تھا اور طبیعت میں کھانے کا تقاضہ تھا اس لیے نہیں پوچھا اور ایک لقمہ منہ میں ڈال لیا) تو فرمایا: اچھا! اب بتادے کہ کہاں سے لایا ہے؟ اس نے کہا: اسلام لانے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں مَیں نے ایک آدمی کے لیے کہانت کی تھی (کہانت یعنی غیب کی خبریں دینا اور مستقبل کے متعلق بتلانا۔ اُس زمانہ میں عرب میں اس کا بڑا رواج تھا، کاہن اور جوتشی ہوا کرتے تھے جو لوگوں کو بتلایا کرتے تھے کہ تمہارا یوں ہوگا اور فلاں ہوگا۔ تو اس نے کہا کہ اس وقت میرے پاس ایک آدمی آیا تھا اور اسی کے متعلق میں نے کہانت کی ایک بات کہی تھی) حالاں کہ میں کہانت جانتا بھی نہیں تھا (میں نے اس کو دھوکہ دیا تھا ''کریلا نیم چڑھا'' والی بات تھی، یعنی ایک تو کہانت خود غلط کام تھا اور اس میں بھی جانتا نہیں تھا، دھوکہ دیا تھا) آج میری اس کی ملاقات ہوئی تو میں نے جو کہانت کی تھی اس کی اجرت اور معاوضہ کے طور پر اس نے مجھے یہ کھانا دیا تھا جو آپ نے کھایا (حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے منہ میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ پیٹ میں تھا وہ سب قے کر ڈالا۔

......تو بھی نکال کر رہتا

افادات:- مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک لقمہ تھا، قے کرنے کے واسطے انگلی ڈالی تو قے نہیں ہوئی، کسی نے کہا کہ ایک ہی لقمہ کھایا ہے، کیسے نکلے گا، ایسا کیجئے کہ آپ پانی پی کر قے کریں تو پانی کے ساتھ وہ لقمہ بھی نکل آئے گا۔ چناں چہ ایک بڑا پیالہ پانی کا بھر کر منگوایا، اس کو پیا اور پھر قے کی تو بڑی مشکل سے وہ لقمہ باہر آیا۔ اس پر کسی نے کہا کہ ایک ہی تو لقمہ تھا، آپ نے اس کے لیے اتنی زیادہ زحمت اور تکلیف کیوں اٹھائی؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا: اگر وہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی میں اس کو نکال کر رہتا، کیوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ وہ گوشت جو حرام غذا سے تیار ہوا ہو، جہنم کی آگ کا زیادہ حق دار ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ حرام غذا سے پل کر تیار ہو۔

خراج کا مطلب یہ ہے کہ اُس زمانہ میں لوگوں کے پاس کئی کئی غلام ہوتے تھے، اپنے کام اور خدمت کے واسطے تو ایک دو کافی ہو جاتے تھے، باقی کو آقا اجازت دے دیتا تھا کہ تم کو جو ہنر اور کام آتا ہے؛ وہ کرتے رہو، اور تمہاری کمائی میں سے اتنا ہم کو دے دیا کرنا، بقیہ سب تمہارا ہوگا۔ تو جو مقدار آقا اپنے لینے کے لیے مقرر کرتا تھا اس کو ”خراج“ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بیٹے کو دوسروں سے کم دیا

۵۹۵:- وعن نافِع أن عُمَرَ بن الخَطّاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ كَانَ فَرَضَ لِلْمُهَاجِرِينَ الأَوَّلِينَ أَرْبَعَةَ الآفٍ وَفَرَضَ لابْنِهِ ثَلاَثَةَ آلافٍ وَخَمْسَمِئَةٍ، فَقِيلَ لَهُ: هُوَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ فَلِمَ نَقَصْتَهُ؟ فَقَالَ: إِنَّمَا هَاجَرَ بِهِ أَبُوهُ. يقول: لَيْسَ هُوَ كَمَنْ هَاجَرَ

بِنَفْسِهِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں بیت المال میں سے جو وظیفے مقرر کیے تھے، تو مہاجرینِ اولین کے لیے وظیفہ کے طور پر چار ہزار (۴۰۰۰) درہم سالانہ مقرر کیے تھے؛ لیکن اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے لیے- جو اپنے باپ کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے اور وہ بھی مہاجرینِ اولین میں سے تھے ان کے لیے- بجائے چار ہزار (۴۰۰۰) کے ساڑھے تین ہزار (۳۵۰۰) مقرر کیے۔ کسی نے پوچھا: یہ بھی تو مہاجرینِ اولین میں سے ہیں، آپ کا بیٹا ہوا تو کیا ہوا؟ ان کے لیے بھی تو چار ہزار مقرر کیجیے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: (اس وقت عبداللہ چھوٹے تھے، اور) ان کو ان کے باپ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

افادات:- گویا یوں سمجھئے کہ اصل ہجرت تو ان کے باپ نے کی تھی اور ان کے باپ ان کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کی ہجرت کے اندر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عملی طور پر گویا کچھ نقص محسوس کیا، یعنی وہ مکمل طور پر اپنے ارادہ سے نہیں، بلکہ اپنے باپ کے تابع بن کر آئے تھے۔ جو آدمی مستقل بالارادہ ہوتا ہے، اور اپنے ارادہ وفیصلہ سے جو کام کرتا ہے اس کا معاملہ اور جو اپنے باپ کے فیصلہ وارادہ سے کرتا ہے، ان دونوں میں کچھ نہ کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے۔ گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جو آدمی خود اپنے ارادہ وفیصلہ سے ہجرت کر کے آیا، یہ اگرچہ اسی زمانہ میں ہجرت کر کے آئے تھے؛ لیکن پھر بھی دونوں میں کچھ تو فرق ہے۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹا ہونے کی وجہ سے جو معاملہ کیا وہ احتیاط ہی کی وجہ سے تھا۔

نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تقسیم کرنے کے لیے چادریں آئیں۔

آپ نے ہر ایک کو ایک ایک چادر دی۔ بعد میں کسی وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ دینے کے لیے منبر پر کھڑے ہوئے تو ان کے جسم پر اسی طرح کی دو چادریں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "إِسۡمَعُوۡا وَأَطِيۡعُوۡا" سنو اور کہنا مانو، تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا: "لَا سَمۡعَ وَ لَا طَاعَةَ يَا عُمَرُ" ہم نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے۔ پوچھا: کیوں بھائی؟ اس نے کہا: وہ جو چادریں آئی تھیں ان میں سے آپ نے سب کو ایک ایک تقسیم کی، اور آپ کے جسم پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ دو چادریں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے انصاف سے کام نہیں لیا، تو پھر کیسے آپ کی بات سنی اور مانی جائے۔ اسی مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا: اٹھو اور ان کو جواب دو۔ وہ کھڑے ہوئے اور کہا: میرے حصہ میں جو چادر آئی تھی وہ میں نے اپنے ابّا کو دی ہے، پھر اس آدمی نے کہا: اب ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ (سیرت ابن الخطاب: ۱۶۷)

کوئی متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا......

۵۹۶:- وعن عَطِيَّةَ بن عُروة السَّعْدِيِّ الصحابيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : لَا يَبۡلُغُ الۡعَبۡدُ أَنۡ يَكُونَ مِنَ الۡمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأۡسَ بِهِ، حَذَراً مِمَّا بِهِ بَأۡسٌ. (رواه الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عطیہ بن عروہ سعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ایسی چیز کو جس کے اندر کوئی خطرہ اور حرج نہیں ہے محض اس ڈر سے چھوڑ دے کہ اس کے کرنے کی وجہ سے حرج والی کسی چیز میں مبتلا ہونا لازم آئے گا۔

لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں

افادات:- حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے کوئی آدمی اچھی آواز سے کچھ اشعار پڑھ رہا تھا تو انہوں نے اس کو منع کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! کیوں نہیں سنتے؟ حضرت نے فرمایا: لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں، اور بلا مزامیر یعنی گانے بجانے کے آلات کے بغیر صرف اچھی آواز والے اشعار کو بھی بعض علماء نے منع کیا ہے۔ حضرت مستقل امام نہیں تھے، بلکہ کبھی کبھی لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے، اس لیے انہوں نے اس کو سننا گوارہ نہیں کیا۔ لوگوں کی نمازوں کو بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے

اِسْتِحْبَابِ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ اَوِ الْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّيْنِ وَوُقُوْعٍ فی حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَّنَحْوِهَا

خلوت گزینی کا مستحب ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

زندگی گزارنے کے دو طریقے

زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں، دونوں متضاد اور الگ الگ ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان، رشتہ داروں، پڑوسیوں، دوستوں میں، معاشرہ اور سماج میں رہ کر سب کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے۔ اور دوسرا طریقہ عُزلت کا ہے یعنی آدمی گوشہ نشینی اختیار کرے، سماج اور سوسائٹی سے الگ تھلگ ایسی جگہ جہاں کسی سے کوئی واسطہ نہ پڑتا ہو، لین دین کی اور کوئی معاملہ کرنے کی نوبت نہ آئے، جس کو گوشہ نشینی کی زندگی کہا جاتا ہے اس طرح زندگی گزارے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں

اسلام نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی ہے۔ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی لوگوں سے کٹ کر پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مشقت اٹھا کر تن تنہا رہے، جس کو ’’برہم چریہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ اسلام آنے سے پہلے بنو اسرائیل کے اندر بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جس کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے: وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید) یہ رہبانیت: جسے انہوں نے ایجاد کیا ہے، (باری تعالیٰ فرماتے ہیں) ہم نے ان کے اوپر یہ طریقہ لازم نہیں کیا تھا، بلکہ یہ چیز انہوں نے اپنے طور پر یہ سمجھتے ہوئے ایجاد کی کہ یہ طریقہ اختیار کر کے ہم اللہ تعالیٰ کو راضی اور خوش کر لیں گے۔ پھر اس کا جو اہتمام ہونا چاہیے اور اس کی جو رعایت کی جانی چاہیے، اس کے حقوق و حدود کو جس طرح بجالانا چاہیے اس کو بجا نہیں

لا سکے۔ اس لیے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم نہیں کی گئی تھی، بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اختیار کی تھی، اس کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔

بہرحال! اسلام رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کو سماج ہی میں بھیجا، جہاں لوگوں کا اجتماعی گروہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے، انہی میں آ کر وہ کام کرتے ہیں، اور انسان فطری طور پر بھی ایسا ہی بنایا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں رہ کر زندگی گزارے، اور پیدائشی طور پر بھی وہ اپنے ساتھ کچھ تعلقات اور رشتہ داریاں لے کر دنیا میں آتا ہے، اس لیے اصل تو یہ ہے کہ آدمی سماج اور سوسائٹی میں رہ کر زندگی گزارے، چناں چہ حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ آدمی جو لوگوں کے اندر مل جل کر رہتا ہے، اور ان کی طرف سے پہنچائی جانے والی ایذاؤں اور تکلیفوں پر صبر سے کام لیتا ہے، وہ اس سے بہتر ہے جو الگ تھلگ رہتا ہے اور ان کی ایذاء رسانیوں پر صبر نہیں کرتا۔ (ترمذی: ۲۵۰۷، باب [مخالطۃ المسلم للناس] / سنن ابن ماجہ: ۴۰۳۲، کتاب الفتن)

فتنہ کی حالت

اور جہاں لوگ مل کر زندگی گزارتے ہیں وہاں دو طرح کے حالات ہوتے ہیں، ایک تو فتنہ کی حالت ہوتی ہے کہ مثلاً فتنہ اتنا عام ہو گیا کہ آدمی کو اپنے آپ کو گناہوں اور ان کی طرف لے جانے والے اسباب و وسائل سے بچانا مشکل ہو گیا، تو ایسے فتنہ و آزمائش کے زمانہ میں عزلت، گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرنے کو ترجیح دی گئی ہے، اور اسی کو پسند کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اگر لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں آدمی کو اپنے دین کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو کہ ان کی طرف سے جو حالات پیش آئیں گے ان پر صبر نہیں کر سکے گا اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی، اور ہو سکتا ہے کہ ان پر زیادتی ہو جائے، ان کے حقوق تلف ہوں، غیبت اور بہتان تراشی میں

ابتلاء کی نوبت آئے، اپنا حال ومزاج دیکھ کر اور لوگوں کے حالات دیکھ کر اس کو یہ غالب گمان ہے، اور اپنے دین کے اندر فتنہ، نقصان اور حرام یا شبہات میں پڑنے کا اندیشہ اور گمانِ غالب ہے؛ تو گوشہ نشینی پسندیدہ، مستحب اور مطلوب ہے، اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ اس صورت میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے آدمی پر ضروری ہے کہ اختلاط اور لوگوں کے ساتھ میل جول اختیار نہ کرے۔

گوشہ نشینی مستحب ہونے کی تین شکلیں

اور اگر عام حالات ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط، سماج اور سوسائٹی میں رہنے کی صورت میں دین کے متعلق کسی نقصان، یا حرام میں پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے؛ تو کون سی صورت بہتر ہے؟ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا یا گوشہ نشینی وتنہائی اختیار کرنا؟ تو اس سلسلہ میں علماء کی دورائیں ہیں۔ چناں چہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں اسی کو بیان فرماتے ہیں:

۱ :- "اِسْتِحْبَابُ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ" اگر زمانہ والوں میں بگاڑ آ گیا ہو تو تنہائی اور گوشہ نشینی مستحب ہے۔

۲ :- "أَوِ الْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّيْنِ" یا اپنے دین میں کسی نقصان یا کسی فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو، تو اس صورت میں بھی تنہائی مستحب ہے۔

۳ :- "وَوُقُوْعٍ فِي حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَنَحْوِهَا" یا سماج اور معاشرہ میں زندگی گزارنے کی صورت میں ڈر ہے کہ ہم حرام کاموں میں مبتلا ہو جائیں گے، کسی بھی طرح کا حرام ہو، صرف زنا کاری اور شراب نوشی ہی نہیں؛ بلکہ لوگوں کے حقوق ضائع ہونے، لوگوں پر بہتان تراشی، غیبت بازی ان کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا ہونے کا احتمال اور

ظن غالب ہو؛ تو اس صورت میں بھی گوشہ نشینی اور تنہائی مستحب ہے۔

اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ

اس سلسلہ میں انہوں نے ایک تو عام آیت سے استدلال کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ إِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑ لگاؤ، یعنی سب سے ہٹ کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا: آپ کہیے کہ میں تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے کھلم کھلا ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔

اسی سلسلہ میں کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔ اور آگے جو باب لائیں گے اس میں عام حالات میں کیا چیز پسندیدہ ہے، اس کو بتلائیں گے۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گوشہ نشینی

۵۹۷:- عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ان اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت سعد بن أبی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: بیشک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے، اور اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پاک صاف ہو، غناءِ قلبی کی دولت سے مالا مال ہو، اور لوگوں سے مخفی اور گمنام رہتا ہو۔

افادات:- یہاں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے صرف وہی الفاظ پیش کئے ہیں جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، لیکن صاحب الترغیب والترہیب نے مسلم شریف ہی کے حوالہ سے اس میں اضافہ فرمایا ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جب اختلاف چل رہا تھا اور ان میں آپس میں جنگ جاری تھی، اس زمانہ میں حضرت سعد بن أبی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے

اونٹوں اور بکریوں کو لے کر جنگل میں چلے گئے، اور وہاں یکسوئی اور گوشہ نشینی کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کیا (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں) اسی زمانہ میں ان کے بیٹے عمر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس ان کو سمجھانے کے لیے گئے، وہ اپنی سواری پر سوار آرہے تھے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ان کو دور سے آتا ہوا دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ ھٰذَا الرَّاکِبِ" اے اللہ! اس سوار کی برائی سے میں پناہ چاہتا ہوں۔ جب وہ ان کے قریب آئے تو کہنے لگے: ابا جان! لوگ تو وہاں قتل ہورہے ہیں اور آپ اپنے اونٹوں کو لے کر یہاں آگئے، لوگوں کی خبر کیوں نہیں لیتے؟ ان کے حال پر آپ توجہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا: چپ بھی رہو، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: "ان اللہَ یُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے، اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پاک صاف ہو، غناءِ قلبی کی دولت سے مالا مال ہو، اور لوگوں سے مخفی اور گمنام رہتا ہو۔ پھر فرمایا: اب جاؤ۔ یہ کہہ کر ان کو رخصت کر دیا، اور خود ساتھ نہیں گئے۔

(الترغیب والترہیب: ۷ ۱۳ ۴ / مسلم: ۷۶۲۱)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ منورہ سے باہر ہی اپنا ایک مکان بنالیا تھا، وہیں رہتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو وہیں سے ان کا جنازہ لایا گیا، اور بقیع میں دفن کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فتنہ کے زمانہ میں یکسوئی حاصل کر کے اپنی دین کی حفاظت ضروری اور واجب ہوجاتی ہے۔ اس روایت کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا قصہ

اصحابِ کہف کا قصہ جو بنی اسرائیل کے زمانہ میں پیش آیا تھا اس کو قرآنِ کریم

نے بیان کیا ہے اس میں اسی چیز کو بتلایا گیا ہے۔ ایک بادشاہ تھا جس کا نام دقیانوس تھا، بت پرست اور بڑا سخت گیر تھا، لوگوں کو بت پرستی کے لیے آمادہ کیا کرتا تھا، لوگ اس کی سختی کی وجہ سے یا پھر لالچ میں آ کر بت پرستی اختیار کر لیتے تھے۔ ان حالات میں چند نوجوان جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی وہ اپنے ایمان پر ہی قائم رہے، بادشاہ نے ان کو بلایا، انہوں نے برسرِ دربار بادشاہ کو ایمان کی دعوت دی اور اس کی بت پرستی پر اس کو ٹوکا۔ وہ ظالم تو تھا ہی، اسی وقت وہ انتقام لے سکتا تھا؛ لیکن اس نے ان کو مہلت دی کہ چند دن غور کر لو۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں تو اپنے ایمان پر قائم رہنا ہے۔ اس نے مہلت دی ہے تو ظاہر ہے کہ بعد میں بھی بت پرستی کے واسطے ہمیں مجبور کرے گا، اگر ہم اپنے ایمان کی حفاظت چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس بستی کو چھوڑ دیں۔ چناں چہ وہ وہاں سے نکل کر ایک کھوہ میں چلے گئے، وہیں چھپ گئے اور وہیں پناہ حاصل کر لی اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحۡمَةً وَهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ أَمۡرِنَا رَشَدًا﴾ اے اللہ! اپنی طرف سے ہمارے لیے رحمت کا فیصلہ فرما اور ہمارا معاملہ آسان کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کر دی، پھر کئی سالوں کے بعد جب اُٹھے اور باہر نکلے تو حکومت بدل چکی تھی، اور بادشاہ ایمان والا تھا۔

سب سے بہتر کون؟

۵۹۸:- وعن أبِي سَعِيدِنِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قالَ رَجُلٌ: أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ يَارسولَ اللهِ؟ قَالَ: مُؤْمِنٌ مُجَاهِدٌ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِي سَبِيلِ اللهِ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ رَجُلٌ مُعْتَزِلٌ فِي شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَعْبُدُ رَبَّهُ.

وفي رواية: يَتَّقِي اللهَ، وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: ایک

آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون سا آدمی سب سے اچھا اور بہتر ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: وہ مسلمان جو اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہو۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ آدمی جو کسی گھاٹی کے اندر یکسوئی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے۔

اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہو، گناہوں سے بچتا ہو، اور لوگوں کو اپنے شر سے بچاتا ہو۔ (یعنی لوگوں میں رہنے کی صورت میں یہ ڈر ہے کہ میرے شر سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی، اس لیے یکسوئی اور تنہائی اختیار کرتا ہو۔)

وہ زمانہ قریب ہے

۵۹۹:- وعنه قال قال رسُولَ اللہِ ﷺ: يُوشِكُ اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَّتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِيْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال کچھ بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور جہاں بارش گرا کرتی ہے ایسے علاقوں میں چلا جائے، اور وہ آدمی اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے ایسا کرے گا۔

ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں

۶۰۰:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی ﷺ قَالَ: مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ. فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وأنتَ؟ قَالَ: نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بھی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں! میں بھی مکہ والوں کی بکریاں چند سکوں کے بدلہ چرایا کرتا تھا۔

بہترین زندگی

۱۰۶: -وعنه عن رسول الله ﷺ أنّه قال: مِنْ خَيْرِ مَعَاشِ النَّاسِ لهم رَجُلٌ مُمْسِكٌ عِنَانَ فَرَسِهِ فی سَبيلِ الله، يَطيرُ عَلَى مَتْنِهِ كُلَّمَا سَمِعَ هَيْعَةً أَوْ فَزعَةً، طَارَ عَلَيْهِ يَبْتَغِي القَتْلَ، أَوِ المَوْتَ مَظَانَّه، أَوْ رَجُلٌ فِي غُنَيمَةٍ فی رَأسِ شَعَفَةٍ مِنْ هٰذِهِ الشَّعَفِ، أَوْ بَطنِ وَادٍ مِنْ هٰذِهِ الأَوْدِيَةِ، يُقِيمُ الصَّلاَةَ، وَيُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَيَعْبُدُ رَبّهُ حَتَّى يأتِيَهُ اليَقِينُ، لَيْسَ مِنَ النَّاسِ إلاَّ فِي خَيْرٍ. (رواه مسلم)

(يَطِيرُ): أيْ يُسرِعُ. وَ(مَتْنُهُ): ظَهْرُهُ. وَ(الهَيْعَةُ): الصوتُ للحربِ. وَ(الفَزعَةُ): نحوه. وَ(مَظَانُّ الشَيْءِ): المواضعُ الَّتي يُظَنُّ وجودُهُ فِيهَا. وَ(الغُنَيْمَةُ) بضم الغين: تصغير الغنم. وَ(الشَّعَفَةُ) بفتح الشين والعين: هي أعلى الجَبَلِ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں بہترین زندگی والا وہ آدمی ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے اس کی پیٹھ پر سوار اُڑا چلا جاتا ہو۔ جہاں کہیں دشمن کے ہتھیار یا گھبراہٹ کی آواز سنتا ہے اور دشمن کی طرف سے خطرے کی کوئی بات دیکھتا ہے؛ تو دوڑا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہے، اور اپنی جان قربان کرنے کی کوشش کرتا ہے، گویا مقابلہ کی حالت میں موت کو تلاش کرتا ہے۔ یا وہ آدمی جو اپنی چند بکریاں لے کر پہاڑ کی چوٹیوں میں سے کسی چوٹی پر یا کسی وادی میں جا کر رہتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔ اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا اور بھلائی پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ (خلاصہ یہ ہوا کہ فتنہ کے زمانہ میں اگر اپنے دین کے متعلق خطرہ ہو تو یکسوئی کو ترجیح دی گئی ہے۔)

بَابُ فَضْلِ الِاخْتِلَاطِ بِالنَّاسِ

لوگوں سے اختلاط کی شرائط

اب وہ زمانہ آیا کہ نہیں؟ تو اس سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا باب قائم کیا ہے جس میں انہوں نے کوئی روایت پیش نہیں کی ہے، بلکہ علماء کا جو نظریہ ہے صرف اسی کو پیش کیا ہے۔ فتنہ کے بارے میں تو انہوں نے اوپر باب قائم کر کے بتلا دیا کہ فتنہ کے زمانہ میں جب کہ آدمی کو سماج میں رہ کر اپنے دین کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو عزلت نشینی مستحب ہے، اور اگر دین کے فساد کا یقین ہو تو عزلت نشینی واجب ہے، لیکن عزلت نشینی کے لیے بھی باقاعدہ شرائط ہیں، ان تمام شرائط کا اہتمام کرتے ہوئے عزلت نشینی اختیار کرے۔

اور عام حالات میں کیا مناسب ہے؟ لوگوں کے ساتھ خلط ملط کر کے رہنا، یا عزلت نشینی؟ چناں چہ باب قائم کیا ہے: بَابُ فَضْلِ الِاخْتِلَاطِ بِالنَّاسِ، وَحُضُوْرِ جُمُعِهِمْ وَجَمَاعَاتِهِمْ، وَمَشَاهِدِ الْخَيْرِ، وَمَجَالِسِ الذِّكْرِ مَعَهُمْ، وَعِيَادَةِ مَرِيْضِهِمْ وَحُضُوْرِ جَنَائِزِهِمْ، وَمُوَاسَاةِ مُحْتَاجِهِمْ، وَإِرْشَادِ جَاهِلِهِمْ، وغَيْرِ ذَالِكَ مِنْ مَّصَالِحِهِمْ لِمَنْ قَدَرَ عَلَى الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وقَمَّعَ نَفْسَهُ عَنِ الْإِيْذَاءِ وَصَبَرَ عَلَى الْأَذىٰ. ''لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی فضیلت، جمعہ و جماعتوں کی حاضری، نیکی کے موقعوں پر حاضری، ذکر کی مجلسوں کی حاضری، مریضوں کی خبر پرسی، جنازوں کی حاضری، محتاجوں کی خیر خواہی، نادانوں کی رہنمائی، اس کے علاوہ دوسری مصلحتیں ہیں۔ یعنی سماج اور سوسائٹی میں رہ کر آدمی کو یہ سارے فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن یہ اس کے لیے ہے جو امر المعروف اور نہی عن المنکر کی قدرت رکھتا ہو، بھلی بات کا حکم کرنے اور بری بات سے منع کرنے پر قادر ہو، لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہو، یعنی اپنے آپ پر اتنا کنٹرول ہو کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور لوگوں کی طرف سے جو تکلیف پہنچے، اس پر صبر سے کام لیتا ہو؛ تو اس

صورت میں لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا پسندیدہ ہے۔

پھر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اِعْلَمْ اَنَّ الْاِخْتِلَاطَ بِالنَّاسِ عَلَى الْوَجْهِ الَّذِیْ ذَکَرْتُهٗ هُوَ الْمُخْتَار"۔ ان تمام شرائط کے ساتھ سماج اور سوسائٹی میں رہے جو اوپر بتلائے گئے (کہ وہ سارے فوائد ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام ہو، اور اپنے آپ کو لوگوں کی ایذاء رسانیوں سے بچاتا ہو، اور لوگوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر کرتا ہو) تب ہی پسندیدہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ایسی ہی گزری ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام، خلفاء راشدین کا بھی یہی طریقہ رہا ہے، ان کے بعد صحابہ، تابعین، علماءِ مسلمین اور خیارِ امت کا بھی یہی طریقہ رہا ہے، اور یہی اکثر تابعین اور ان کے بعد والوں کا مذہب ہے، امام شافعی، امام احمد اور اکثر فقہاء یہی فرماتے ہیں۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو۔ یہ عام حالات میں ہے۔

کیا وہ زمانہ آگیا؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ساتویں صدی کے ہیں، ان کے سو سال بعد علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ شارحِ بخاری آئے جو آٹھویں صدی کے بڑے عالم ہیں، وہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی ان ساری باتوں کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ہمارے زمانہ میں خلط ملط کر کے رہنے کے مقابلہ میں گوشہ نشینی افضل ہے۔ ان کے ستر سال بعد شارحِ بخاری علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ آئے، وہ بھی فرماتے ہیں کہ میں علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید کرتا ہوں، ہمارے زمانہ میں خرابیاں اور بڑھ گئی ہیں۔ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ ان تمام حضرات کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: یہ سب باتیں تو نویں صدی تک کی تھیں،

اب تو چودہویں صدی پوری اور پندرہویں صدی شروع ہوگئی، اب حالات میں جتنا بڑا انقلاب آ گیا ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی صاحبِ علم، صاحبِ تقویٰ، دیندار آدمی لوگوں میں یہ شرائط مذکورہ بالا رہے، تو آج بھی اس کے لیے لوگوں میں مل جل کر رہنا مفید ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو جیسا کہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی مجالس عام طور پر گناہوں سے خالی رہیں ہی نہیں، اس لیے دینی مجالس کو چھوڑ کر دوسری تمام مجالس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے، اِلّا یہ کہ وہاں جانے سے کسی کو دینی نفع پہنچنے کی امید ہو، تو اس صورت میں اس کی اجازت ہے۔

ماتحتوں کو نہ بخشے

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اس موضوع پر تفصیل سے کلام فرماتے ہوئے ایک خاص نصیحت فرمائی ہے کہ ایک بات یاد رہے، جہاں آپ کسی منکر سے روکنے کی طاقت رکھتے ہوں تو اسے روکنے میں کبھی دریغ نہ کرنا، پیچھے نہ ہٹنا، کمزوری نہ دکھلانا، خاص کر اپنے ماتحتوں (بیوی، اولاد، نوکر) کے معاملہ میں آدمی کو چاہیے کہ ذرّہ برابر بھی کمزوری نہ دکھلائے، اور منکرات و برائیوں سے ان کو روکنے کا اہتمام کرے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ رَأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ. فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذَالِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ (او کما قال علیہ والسلام)

تم میں سے جو آدمی کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو روکے، اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو دل سے اس کو برا سمجھے۔ پھر فرمایا: یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ اور بعض روایتوں میں ہے: ”وَلَيْسَ وَرَآءَ ذَالِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حِبَّةُ خَرْدَلٍ“ اس کے بعد ایمان کا درجہ ہے ہی نہیں۔ کم سے

کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل سے برا سمجھے۔

احقاقِ حق یا تذلیل؟

اس کے بعد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری بات ارشاد فرمائی کہ جہاں برائیوں سے روکنے میں فتنہ کا قوی اندیشہ ہو، وہاں فتنہ جگانے کی کوشش نہ کی جائے۔ دونوں کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بہت سی مرتبہ آدمی اعلانِ حق اور احقاقِ حق کے نام سے کسی کو لوگوں کے سامنے رسوا کرنے، یا نیچا دکھلانے کے لیے کہتا ہے کہ: تم یوں کر رہے ہو۔ اور دوسری طرف جو اپنے ماتحت؛ اپنا بیٹا، اپنی بیوی وغیرہ برائیوں میں مبتلا ہیں، لیکن محض محبت و تعلق کی وجہ سے ان کو روک ٹوک نہیں کر رہا ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ جو آپ کے ماتحت ہیں ان کو روکو، ان کے معاملہ میں کوئی رکاوٹ ہی نہیں ہے۔ ان کی طرف سے تجارت میں اگر کوئی مالی نقصان ہوتا ہے، آپ کی فیکٹری، دکان میں وہ کوئی گڑبڑ کر دیتے ہیں تو کیا آپ اس کو برداشت کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ گالی دیں گے، برا بھلا کہیں گے، پٹائی کریں گے، آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو سب کچھ کرتے ہیں، اور اسی بیٹے، اسی ماں اور بیوی کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کر رہے ہیں، نماز نہیں پڑھتے، گناہوں میں مبتلا ہیں؛ لیکن وہاں کچھ نہیں کہتے۔ یہ ان کے ساتھ بدخواہی اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ آدمی جہاں برائی سے روکنے پر قدرت رکھتا ہو، اس کے باوجود نہ روکے، تو اللہ تعالیٰ کا عام عذاب آئے گا، پھر اس سے نہ وہ بچ سکیں گے اور نہ یہ اپنے آپ کو بچا سکے گا۔ یہ اہم بات ہے، جس کو یاد رکھنا چاہیے۔

عذابِ الٰہی کو دعوت نہ دیں

خلاصہ یہ ہوا کہ دونوں حالتوں میں آدمی امتیاز کرے، اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں کہ جہاں آدمی کو قدرت حاصل ہوتی ہے، وہاں ہاتھ سے روکنے کا اہتمام کرے، اور جہاں قدرت نہیں ہے، وہاں زبان سے ایسے انداز سے سمجھا دے جس سے کوئی فتنہ نہ ہو۔ اور اگر اس صورت میں بھی خطرہ ہو، تو پھر کم سے کم دل سے برا سمجھنے پر اکتفاء کرے، اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ اس صورت میں پھر چاہے کسی کی طرف سے کتنے ہی طعنے دیئے جاتے رہیں ان کو برداشت کرتا رہے، کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر خاص طور پر تاکید فرمائی ہے کہ اگر ہمت ہو تو ان کے لیے دعاءِ خیر بھی کرے۔ اس بات کو یاد رکھو، یہ بہت اہم چیز ہے۔

آدمی یہ نہ سمجھے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے میں برائیوں سے صَرفِ نظر کرلوں، اس کی شریعت کسی حال میں اجازت نہیں دیتی۔ ہاں! یہ بات ٹھیک ہے کہ کسی اجنبی کو کہنے کی صورت میں اگر اندیشہ ہو تو آدمی نہ کہے، لیکن اپنے ہی لوگ گنا ہوں، بدعملیوں اور برائیوں میں مبتلا ہیں اور ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوتی؛ یہ بڑی خطرناک چیز ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والی ہے۔

یہ آیت شبہ میں نہ ڈالے

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ میں عمل کر رہا ہوں، یہ میرے لیے کافی ہے، چاہے بیوی بچے برائی کے اندر مبتلا ہوں۔ جیسے بعض حضرات اس سلسلہ میں یہ آیت پیش کرتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ

لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ اے ایمان والو! تم اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرو، کوئی آدمی گمراہ ہے تو وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تم کو شبہ میں نہ ڈالے، اس سے مراد یہ نہیں ہے۔ جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہوجاتا ہے وہ اس میں داخل نہیں ہے، ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد بھی وہ اگر اپنی اصلاح نہیں کرتا تو آپ بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی سے آدمی اپنے آپ کو روک لے۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اگر حالات ایسے آ گئے تو آدمی اپنے متعلق غور وفکر کر کے اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے، جیسے حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُّطَاعًا، وَهَوًى مُّتَّبَعًا، وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ، وَدَعْ الْعَوَامَ (سنن ترمذی. بابٌ: ومن سورة المائدة. حدیث رقم: ۳۰۵۸) جب تم دیکھو کہ بخل وحرص کی پیروی کی جارہی ہے، خواہشاتِ نفس کے پیچھے لوگ دوڑ رہے ہیں، دنیا کو ترجیح دی جاری ہے، ہر ذی رائے اپنی رائے پر مست ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے؛ تو ایسے موقع پر تم اپنے آپ کو سنبھال لو اور عوام کی طرف توجہ نہ دو۔ باقی یہ ہے کہ کسی بھی طریقہ سے، نرمی کے ساتھ، محبت کے ساتھ اگر آپ اپنی بات عوام تک پہنچا سکتے ہیں تو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح توفیق عطا فرمائے۔

اَلتَّوَاضُعِ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ

تواضع اختیار کرنا

﴿مجلس ۱﴾

۱۰/جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۹/ستمبر ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا كَثِيۡرًا۔ أما بعد:-

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

ساری خوبیوں کی جڑ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے: تواضع اختیار کرنا اور ایمان والوں کے سامنے اپنے پہلو کو جھکانا۔

تواضع کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہی ساری نیکیوں اور خوبیوں کی جڑ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا، اس لیے کہ تواضع کے مقابلہ میں تکبر ہے جو ساری خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ شیطان جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مردود ہوا اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس نے تکبر کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو شیطان بھی ان کی جماعت میں تھا، اس لیے یہ بھی اس حکم میں داخل تھا، لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟ ﴿خَلَقۡتَنِيۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ﴾ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے اور ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے، آگ اوپر اُٹھنے والی چیز ہے، مٹی پستی میں رہنے والی چیز ہے، اس لیے مٹی کے مقابلہ میں آگ کو فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا شیطان نے انکار کیا، اور اپنی عقل چلائی۔ حالاں کہ اصل تو یہ ہے

کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا تو عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، علامہ اقبال کا ایک شعر ہے: ؎

روزِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ❁ جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام اور شریعت کو عقل کی ترازو میں تولنا شروع کردے گا تو پھر بات ہی ختم ہوجائے گی، پھر تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس کے حکم کی بجاآوری نہیں ہوگی؛ بلکہ اپنی عقل پر چلنا ہوگا۔ اگر یہ سوچتا کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی خالق ہے اور اس کا بھی خالق ہے، وہ میری حقیقت سے بھی واقف ہے اور اس کی حقیقت سے بھی واقف ہے، اس کے باوجود جب اس نے حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو اس کو ماننا چاہیے، لیکن وہ اپنی عقلی دلیل لایا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حجت بازی کرنے لگا۔

حضرت آدم کا امتیازی وصف

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے مقابلہ میں بھی اور شیطان کے مقابلہ میں بھی جو فضیلت حاصل ہوئی، اس کی اصل بنیاد ان کی شانِ عبدیت، شانِ بندگی اور عجز وتواضع ہے، جو شان ایک بندے کی ہونی چاہیے وہی شان ان میں پائی گئی، یہی ایک چیز تھی جس نے ان کو سب کے مقابلہ میں فوقیت دلوائی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اونچے مرتبہ پر پہنچایا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ زمین کے اندر میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، تو سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ آگے کچھ بولنے کی کچھ گنجائش ہی نہیں تھی، اس کے باوجود فرشتوں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿أَتَجْعَلُ

فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ باری تعالیٰ! آپ زمین کے اندر ایک ایسی شخصیت کو بھیج رہے ہیں جو زمین میں فتنہ اور فساد مچائے گی اور خون خرابہ کرے گی؟ ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ہم آپ کی تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کی عبادت کرنے اور پاکیزگی بیان کرنے کے لیے کافی ہیں؛ پھر ان کی کیا ضرورت ہے؟ باری تعالیٰ نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا: ﴿إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں جو چیزیں جانتا ہوں تم وہ نہیں جانتے، فرشتوں نے فوراً عرض کیا: ﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ آپ کی ذات پاک ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے جو آپ نے ہمیں سکھایا، آپ بہت زیادہ جاننے والے حکمت والے ہیں۔ بہر حال! انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن ان کی طرف سے پہلے ایک بات تو پیش ہوئی۔ اس کے بعد جب سجدہ کے لیے کہا گیا تو فرشتے تو فوراً سجدہ ریز ہو گئے لیکن شیطان نے حکم نہیں مانا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، باری تعالیٰ کے سامنے حجت بھی کرنے لگا کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا، میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟ حالاں کہ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کے عشق اور محبت کی ضرورت تھی۔

ایک ''ع'' کی کمی

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیطان میں تین عین تھے۔ بہت بڑا عابد تھا، بہت بڑا عارف تھا اور بہت بڑا عالم بھی تھا۔ اس کے علم کا کیا کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں کا استاذ بنا دیا تھا، تبھی تو معلم الملکوت کہلایا۔ عبادت کا یہ عالم کہ آسمان پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اور عارف یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کو پہچاننے والا بھی تھا، اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے پر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی

بارگاہ سے مردود کیا تو اس نے ایک درخواست پیش کردی کہ قیامت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے تک مجھے مہلت دی جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی بارگاہ سے ہانکا تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض تھا، ایسی ناراضگی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کرنا اس کی معرفت ہی کی علامت ہے کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی چیز سے متأثر نہیں ہوتی۔ ہمارا تمہارا حال تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ابھی مجھ سے بات نہ کرنا، تمہاری کوئی درخواست منظور نہیں ہوگی چوں کہ اس وقت ایک خاص کیفیت ہے۔ لیکن شیطان جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کیفیت سے متأثر ہونے والے نہیں ہیں، وہ تو حاکم ہے، اگر درخواست قابلِ قبول ہے، تو قبول ہوجائے گی، چاہے اس وقت اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ ہیں۔ چناں چہ اسی حالت میں اس نے درخواست پیش کی اور اللہ تعالیٰ نے وہ منظور کرلی کہ جا! تجھے مہلت دی جاتی ہے جب تک کہ پہلا صور پھونکا جائے گا۔ اس نے ہوشیاری سے کام لیا تھا اور کہا تھا کہ دوبارہ جب پیدا کیے جائیں وہاں تک مہلت دی جائے، اس کا مقصد یہ تھا کہ پہلے صور پر سب ختم ہوجائیں گے اور دوسرے صور پر سب دوبارہ پیدا ہوں گے، تو دوبارہ پیدا ہونے تک جب مہلت مانگوں گا تو مجھ پر موت طاری نہیں ہوگی۔ وہ ہوشیاری کرنے گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کی ہوشیاری کہاں چل سکتی ہے؟ لہٰذا باری تعالیٰ نے کہا: تجھے مہلت تو دی جاتی ہے لیکن ایک مقررہ وقت یعنی پہلے صور کے پھونکے جانے تک ہی دی جاتی ہے۔

بہرحال! یہ تین عین اس میں تھیں، لیکن وہ عاشق نہیں تھا، اگر عاشق ہوتا تو باری تعالیٰ کی طرف سے جب حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو فوراً کردیتا۔ یہ نہ دیکھتا کہ میں کیا ہوں اور وہ کیا ہے، اس لیے کہ عاشق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے محبوب و معشوق کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس پر جان چھڑکنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔

محبت جب پیوست ہوجاتی ہے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کا تعلق محبت والا ہونا چاہیے ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ﴾ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے خوب ڈٹ کر محبت کرنے والے ہیں، بلکہ ایمان نام ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا ہے، ایمان کی حقیقت یہی ہے۔ اور محبت کا حال یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ دل میں پیوست ہوجاتی ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتی، اسی لیے تو جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصرِ روم ہرقل کے نام خط لکھا تھا، جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس مبارک نامہ کو کھولنے اور اس کا مضمون پڑھنے سے پہلے ہی ہرقل نے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ کس شخصیت کا خط ہے، بھیجنے والے کون ہیں۔ چناں چہ وہ اس زمانہ میں بیت المقدس کی زیارت کے لیے آیا ہوا تھا۔ مکہ مکرمہ سے بھی قریش کا ایک قافلہ وہاں پہنچا ہوا تھا جس کی سرداری ابوسفیان کر رہے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدِ مقابل کافروں کے سردار تھے، انہی لوگوں کو تحقیق حال کے لیے بلایا گیا، اس نے ان سے بہت سارے سوالات کیے، ان میں ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ جو اس دین کے اندر داخل ہوجاتا ہے؛ تو پھر کیا اس سے ہٹتا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! ایسا تو نہیں ہوتا۔ تو ہرقل نے اس کی وجہ یہی بتائی تھی کہ ایمان کا حال ایسا ہی ہے کہ جب وہ دلوں کی گہرائیوں میں سرایت کرجاتا ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ اصل تو ایمان نام ہی اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے۔

اُمُّ الامراض

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر شیطان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی تو یہ بات ہی پیدا

نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے شیطان کو ہلاک کرنے کا سبب تکبر اور بڑائی ہے۔ تکبر ہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی کے نتیجہ میں غصہ آتا ہے، اسی کے نتیجہ میں حسد پیدا ہوتا ہے، اسی کے نتیجہ میں بغض اور کینہ پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے نتیجہ میں اور بھی بہت ساری خرابیاں جنم لیتی ہیں، اسی لیے اہلِ تصوف کے یہاں اس کا نام ہی ''اُمُّ الامراض'' یعنی ساری بیماریوں کی ماں اور جڑ ہے۔ تو تکبر ساری خرابیوں کی جڑ ہے، اس کے بالمقابل تواضع ہے۔ اس بات سے تواضع کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس آدمی کے اندر تواضع ہوگی وہ تکبر سے پاک صاف ہوگا، تو بہت ساری برائیوں کی جڑ خود بخود ہی کٹ گئی، لہٰذا تواضع بہت ضروری چیز ہے، اسی لیے اس کا حکم وترغیب دی گئی اور قرآن وحدیث میں اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے، خود حضور پاک ﷺ نے اپنے عمل سے اس کو کر کے بتلایا ہے۔

تواضع کی حقیقت

تواضع کی حقیقت کیا ہے؟ تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے، صرف کمتر کہنا کافی نہیں، بلکہ کمتر سمجھنا ضروری ہے۔ آدمی دل سے اپنے آپ کو سب سے کم درجہ سمجھے۔ اگر کوئی آدمی زبان سے اپنے آپ کو حقیر، فقیر، پُرتقصیر اور بندۂ ناچیز کہتا ہے اور دل سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو چاہے ایسے الفاظ کہتا رہے؛ اس کا نام تواضع نہیں ہے۔ بلکہ دل سے اپنے آپ کو سب سے کمتر اور سب سے نکما سمجھتا ہو، اور یہ سوچتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اگر کوئی کام مجھ سے کروا رہا ہے تو یہ محض اس کا فضل وکرم اور اس کی عنایت ہے، باقی ذاتی اعتبار سے اس میں میرا کوئی کمال اور میری اپنی کوئی قابلیت نہیں ہے، میری ذاتی صلاحیت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہی اصل ہے کہ آدمی اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے؛ اسی کا نام تواضع ہے۔

نمائشی تواضع

اپنے آپ کو کمتر کہنے اور بولنے کا نام تواضع نہیں ہے، بلکہ یہ تو تواضع کی نمائش ہے۔ بعض مرتبہ آدمی تواضع کی نمائش کرتا ہے کہ کسی نے کچھ کہا تو کہنے لگتا ہے کہ میں تو بڑا نالائق ہوں، میں کچھ بھی نہیں ہوں، تاکہ سامنے والے کہیں کہ نہیں نہیں حضرت! آپ تو بہت بڑے مقام والے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی زبان سے اپنی بڑائی کہلوانے کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، ان کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب کوئی ان کی تعریف کرتا تھا، تو وہ بالکل چپ اور خاموش رہتے تھے، تردید بھی نہیں کرتے تھے۔ اس سے کوئی آدمی یہ نہ سمجھے کہ شاید ان میں تکبر تھا اس لیے اپنی تعریف سنتے رہتے تھے، حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی، بلکہ وہ خاموش اس لیے رہتے تھے کہ تردید کے اندر بھی کبھی تکبر کا پہلو آجاتا ہے۔

حقیقی تواضع کی ایک علامت

حقیقی تواضع کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ: میں ناچیز، گنہگار، بندۂ حقیر پر تقصیر ہوں، اور سامنے والا جواب میں اگر یہ کہہ دے کہ: ہاں! آپ بالکل ایسے ہی ہیں؛ پھر دیکھئے! اس کا چہرہ متأثر ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا چہرہ اس سے متأثر ہوتا ہے اور اس کی طبیعت پر اس جواب کا اثر ہوتا ہے، تو سمجھ جاؤ کہ حقیقی تواضع نہیں ہے۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو اس صورت میں سمجھا جائے گا کہ حقیقی تواضع سے آراستہ ہے۔

حضورِ پاک ﷺ کی تواضع

حضورِ پاک ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہر جگہ تواضع نظر آئے گی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضورِ پاک ﷺ کی طبیعت میں اتنی زیادہ تواضع تھی کہ مدینہ منورہ کی کوئی بچی بھی کسی کام کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی تو آپ چلے جاتے تھے۔ جس آدمی کے مزاج میں تکبر ہو، وہ بھلا ایسا کرسکتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی حضورِ پاک ﷺ سے مصافحہ کرتا تھا تو جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ ہٹاتا، حضورِ اکرم ﷺ اپنا ہاتھ نہیں ہٹاتے تھے، اور کوئی آپ کی طرف متوجہ ہوکر بات چیت کرتا تو جب تک وہ اپنی بات پوری کر کے اپنا چہرہ نہیں پھیرتا تھا تب تک حضورِ اکرم ﷺ بھی اپنا چہرۂ مبارک نہیں پھیرتے تھے۔

مجبوری کی وجہ سے مسند بنوائی گئی

مجلس میں بھی پہلے یہ ہوتا تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ سب کے ساتھ ملے جلے بیٹھتے تھے، آپ کے لیے کوئی ممتاز نشست نہیں بنائی گئی تھی، اس لیے کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کون ہیں اور صحابہ کون ہیں، اس کی وجہ سے نئے آنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی، کوئی نیا آدمی آتا جو آپ کو پہچانتا نہ ہو، تو اس کو دوسروں سے پوچھنا پڑتا کہ حضورِ پاک ﷺ کون ہیں۔ پھر اگر مجمع زیادہ ہوتا تو دور والے آپ کو دیکھ بھی نہیں پاتے تھے۔ ان ساری دشواریوں کے پیشِ نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضورِ اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے لیے کوئی اونچی بیٹھک بنوائیں، اس لیے کہ نئے آنے والے آپ کو پہچانتے نہیں، ان کو لوگوں

سے پوچھنا پڑتا ہے، اگر آپ کے لیے ممتاز بیٹھک بنائیں گے تو پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ دوسرا یہ ہے کہ جو لوگ دور ہوتے ہیں ان کو آپ دور سے نظر نہیں آتے تو ان کے لیے بھی دشواری کا سبب ہے، اگر آپ اونچائی پر ہوں گے تو ان کو بھی آپ کی زیارت کا موقع ملے گا، ان ساری ضرورتوں کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اونچی بیٹھک بنانے کی اجازت دی پھر حضورِ اکرم ﷺ اس پر تشریف فرما ہوتے تھے۔

آپ جب چلتے تھے تو اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چلیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کے آگے راستہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا کہ راستہ دیا جائے، جیسا کہ بڑوں کے لیے کیا جاتا ہے، آپ کے لیے ایسا نہیں ہوا کرتا تھا، حضورِ اکرم ﷺ اس کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ تواضع کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی دل سے اپنے آپ کو کمتر سمجھے۔

نعمتوں کو عطیۂ خداوندی سمجھے

اب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دے رکھی ہیں؛ ان کا کیا؟ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے علم سے نوازا ہے، تو یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ آدمی یہ سمجھے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، کسی کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے؛ یہاں تواضع کیسے اختیار کی جائے؟ تو کتابوں میں لکھا ہے کہ جو نعمت اس کے پاس ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ، دَین و بخشش سمجھے کہ یہ علم، عہدہ، منصب، مال و دولت، حسن و جمال، یا جو کچھ بھی ہے؛ اس میں میری ذاتی قابلیت و صلاحیت کو دخل نہیں ہے، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمایا ہے۔ ہماری جسمانی نعمتیں تو عطیۂ خداوندی ہی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کیا وہ یہ سب

نعمتیں مانگنے جاتا ہے؟ اس کے اندر تو کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی، اس کو سب کچھ دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اس لیے آدمی یہ سوچے کہ مجھے جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب محض اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما رکھا ہے، اس سے شکر کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باری تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ اگر آپ کہیں تو اُحد پہاڑ کو سونے کا بنا دیا جائے اور آپ کے لیے دولت کی ریل پیل ہو جائے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا: باری تعالیٰ! مجھے یہ منظور نہیں ہے؛ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھانا کھاؤں، ایک روز بھوکا رہوں؛ تاکہ جس روز کھانا کھاؤں اس روز آپ کا شکر ادا کروں اور جس روز بھوکا رہوں اس روز صبر سے کام لوں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی حال میں اپنے لیے کوئی امتیازی حیثیت پسند نہیں فرماتے تھے اور جو اکابرینِ امت گزرے ہیں، ان کا حال بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں یہی تھا۔

خلیفۂ وقت کا سترہ پیوندی کرتہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے، آپ کے جسم پر جو کرتہ تھا اس پر سترہ پیوند لگے ہوئے تھے، جس میں ایک چمڑے کا تھا۔ اپنے زمانہ کا علی الاطلاق حکمران اور ایسا خلیفۂ وقت جن کی سلطنت کی حدود بڑی وسیع تھیں، فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، اس کے باوجود ان کے لباس کا یہ عالم تھا۔ اور آپ کو جہاں نیند آتی تھی وہیں لیٹ جاتے اور سو جاتے تھے۔ کھانے کے معاملہ میں بھی سادگی کا یہی حال تھا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بعد میں بھی یہی سلسلہ رہا۔ تو تواضع کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی دل سے یہ سمجھے کہ میں سب سے کمتر ہوں، کسی قابل نہیں ہوں، اور جو کچھ اپنے پاس ہے

اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور دَین سمجھے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مسلمان سے فی الحال اور ہر کافر سے فی المآل اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہوں۔ مسلمان سے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی نعمت عطا فرما رکھی ہے۔ اور کافر سے احتمال کے درجہ میں کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمائے اور اونچا مرتبہ عطا فرما دے۔ پس یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ آدمی اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کی کیفیت

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (دونوں حضرات حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں سے تھے) سے کہا کہ جب لوگ حضرت کی مجلس میں بیٹھتے ہیں اس وقت پوری مجلس میں دل میں یہی خیال رہتا ہے کہ میں ہی سب سے نکما اور کمتر ہوں۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہی کیفیت میری بھی رہتی ہے۔ پھر ان دونوں نے کہا کہ اچھا! حضرت کے سامنے اس کو عرض کیا جائے، کہیں اس میں ہمارے نفس کا کوئی کید تو نہیں ہے؟ دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا حال عرض کیا، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس وقت مجلس منعقد ہوتی ہے، اس وقت میرا حال یہ ہوتا ہے کہ جتنے مجلس میں بیٹھے ہوتے ہیں، میں اپنے آپ کو ان میں سب سے زیادہ نکما اور کمتر سمجھتا ہوں۔

متکبر کی نقد سزا

عرب میں ایک کہاوت ہے: ''متکبر کا حال ایسا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ پر کھڑا ہو۔'' پہاڑ پر کھڑا رہنے والا آدمی نیچے والوں کو بہت چھوٹا دیکھتا ہے، لیکن دوسروں کا معاملہ بھی اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے یعنی نیچے والے بھی جب اس کو دیکھتے ہیں تو اِن کو وہ چھوٹا ہی نظر آتا ہے، چناں چہ تکبر کرنے والا بھی دوسروں کو بہت کمتر سمجھتا ہے، خود اس کو بھی دوسرے لوگ حقیر ہی سمجھتے ہیں۔ یہ قدرتی اثر ہوتا ہے۔ تکبر کرنے والے کی یہ قدرتی نقد سزا ہے۔ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے تو دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔ چوں کہ اس نے اوپر سے دیکھ کر دوسروں کو چھوٹا سمجھا، تو نیچے والے بھی تو اس کو دیکھ رہے ہیں تو وہ بھی نیچے سے چھوٹا ہی لگ رہا ہے۔

نقشوں کو تم نہ جانچو

اور تکبر میں تحقیر کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور تحقیر کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں۔ مسلم شریف کی روایت ہے: ''بِحَسْبِ امْرِءٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمِ'' کسی مسلمان کی برائی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ لہٰذا کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس کے دل میں ایمان کی جو دولت ہے وہ بہت بڑی دولت ہے، اسی وجہ سے شریعت نے ہر ایمان والے کے احترام کا حکم دیا ہے۔ پھر یہ کہ کس کی ایمانی کیفیت کیسی ہے یہ کون جان سکتا ہے؟ کسی کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا وہ کہ کس درجہ کا ہے؟ آج جتنے بھی لوگ بڑے منصب اور عہدوں پر فائز ہیں، ان کے نام اور ان کے منصب سے جو آدمی واقف نہ ہو، اس کے سامنے ان کو کھڑا کر دیا جائے؛ تو کیا چہرہ دیکھ کر وہ کہہ دے گا کہ یہ صدر جمہوریہ ہیں، اور یہ وزیر اعظم ہیں؟

نہیں کہہ سکے گا۔ کسی کے بھی چہرہ سے اس کے اندر کی حقیقت کا پتہ نہیں چلا کرتا۔ اسی طرح ظاہری حالت کی وجہ سے کسی کے متعلق فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

میں یہ بتارہا تھا کہ تواضع کی صفت بہت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد کے باہر صحن میں حدیث کا درس دے رہے تھے، اسی دوران بارش کے چھینٹے گرنے لگے، تو طلبا فوراً اپنی کتابیں لے کر مسجد کی طرف دوڑے۔ حضرت نے دیکھا کہ سب کے جوتے باہر پڑے ہوئے ہیں تو حضرت سب کے جوتے اٹھا کر ایک جگہ رکھنے لگے، تاکہ بارش سے بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔ طلبا نے جب یہ دیکھا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ حضرت نے یہ نہیں سوچا کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں۔ جو بڑے حضرات ہوتے ہیں ان کی شان یہی ہوتی ہے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس کی تواضع

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے، اونچے پائے کے بزرگ اور بڑے عالم تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی دیہاتی نے آپ کی دعوت کی، اس کا گھر دور تھا، جب دعوت کا وقت آیا تو اس نے سواری بھی نہیں بھیجی۔ حضرت نے سوچا کہ اس کے یہاں دعوت ہے، چلو! چلتے ہیں۔ پیدل پہنچ گئے، اس نے کھانا کھلایا، آم کا موسم تھا، آم بھی کھلائے، اور واپسی میں آم کی ایک پیٹی بھی ساتھ دے دی۔ ایک تو سواری کا انتظام نہیں کیا، اور جب روانہ ہو رہے تھے تو آم بھی دے دیئے۔ حضرت نے انکار نہیں

کیا، بلکہ قبول کر لیے۔ اب پیٹی لے کر چل رہے ہیں اور طبیعت بہت نازک تھی، اتنا وزن اُٹھانے کی عادت بھی نہیں تھی، اس لیے ایک ہاتھ میں تھوڑی دیر اٹھاتے، پھر دوسرے ہاتھ میں اٹھاتے، اسی طرح ہاتھ بدلتے رہے۔ جب دیوبند قریب آیا تو دونوں ہاتھ بالکل شل سے ہو چکے تھے تو اس پیٹی کو سر پر رکھ دیا۔ جب دونوں ہاتھ خالی ہوئے، راحت ملی تو کہنے لگے کہ یہ تجویز پہلے سے کیوں نہیں سوجھی؟ خیر! پھر شہر میں داخل ہوئے، بازار سے گزر رہے تھے تو دکاندار نیچے اتر اتر کر سلام کرنے لگے، لیکن حضرت اس پیٹی کو سر پر اٹھائے ہوئے بے فکر چلے جا رہے تھے، اور سب کے سلام کا جواب بھی دے رہے تھے، دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میں پیٹی اٹھائے ہوئے ہوں۔ تو آدمی کو اپنے اندر تواضع پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دَم نکلنے کے بعد ذائقہ آتا ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عجیب وغریب بات نقل کی ہے۔ حضرت فرماتے تھے: جب پلاؤ پکایا جاتا ہے تو چاول شروع میں بہت اچھلتا اور جوش مارتا ہے، اور جب تک کچا ہوتا ہے اس میں سے آواز آتی رہتی ہے، لیکن جب پکنے کے قریب آتا ہے اور تھوڑی دیر باقی ہوتی ہے تو اس کا دم نکالا جاتا ہے، اس وقت وہ بالکل خاموش پڑا رہتا ہے، اور جہاں اس کا دم نکال دیا گیا تو اس میں سے خوشبو بھی پھوٹتی ہے اور اس کا ذائقہ بھی عمدہ ہو جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ: آدمی میں بھی خوشبو اور ذائقہ اسی وقت آئے گا جب کہ اس کا دم نکال دیا جائے، جب تک اس میں دم رہے گا وہاں تک اچھلتا کودتا رہے گا، اور یہ اس کے کچا رہنے کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ کو تواضع ہی پسند ہے

باری تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم دیا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جو آپ پر ایمان لائے ہیں، ان کے لیے آپ اپنا بازو جھکائیے، آپ ان کے سامنے تواضع اور انکساری سے پیش آئیے۔ اللہ تعالیٰ کو فنائیت، عبدیت اور تواضع ہی پسند ہے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى﴾ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ﴾ اور تم کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ﴿لِتَعَارَفُوْا﴾ محض پہچان کے لیے۔ اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور اس پر تکبر کرنا صحیح نہیں ہے ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اپنے آپ کو گناہوں سے زیادہ بچانے والا ہو۔

……ذرا بندِ قبا دیکھ

باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَا تُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ اے لوگو! اپنی پاکی بیان مت کرو۔ یعنی اپنی خوبیاں ذکر مت کرو کہ میں ایسا پاک ہوں اور ایسی خوبیوں والا ہوں، تم میں کون پاکیزہ ہے یہ تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

قرآن میں ایک اور جگہ سورۂ نور میں فرمایا ہے: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو گناہوں سے بچا نہ پاتا۔ اگر کوئی آدمی گناہوں سے بچ رہا ہے، نیکی کے کام کر رہا ہے، تو اس فخر و غرور میں نہ رہے کہ یہ میرا کمال ہے۔ نہیں بھائی! ایسا بالکل نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی توفیق

ہے، اگر اس کی توفیق ایک لمحہ کے لیے بھی ہٹ جائے تو آدمی کسی بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا ہوسکتا ہے۔قرآنِ پاک میں اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو گناہوں سے بچ رہا ہے وہ اس کو اپنا کمال نہ سمجھے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے، اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی گناہوں سے بچ نہ سکتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اسے بچاتا ہے۔اس لیے اپنی پاکیزگی بیان مت کرو:- ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت ❁ دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

آدمی کو اپنے معاملہ میں پاکیزہ بننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو لوگ ہی فیصلہ کریں گے، یا اللہ تعالیٰ کے یہاں فیصلہ ہوگا۔اس آیت میں ﴿فَلَا تُزَكُّوْا﴾ کہہ کر کبر سے منع کیا گیا اور تواضع اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

کوئی کسی پر فخر نہ کرے

۶۰۲:-عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا، حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِيْ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر وحی بھیجی کہ تم تواضع اختیار کرو (یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھو) یہاں تک کہ تم میں سے کوئی کسی کے اوپر فخر وغرور نہ کرے اور اپنی بڑائی نہ جتلائے۔اور کوئی کسی پر ظلم اور سرکشی نہ کرے۔

افادات:-تکبر ہوگا تو انسانوں پر ظلم سے بھی باز نہیں آئے گا۔جہاں بھی ظلم ہوتا ہے تکبر کے نتیجہ ہی میں ہوتا ہے۔جہاں تواضع ہوگی وہاں ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ وہاں تو جانوروں تک کے ساتھ انصاف اور رحم وکرم کا معاملہ کیا جائے گا

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا اس میں فرمایا تھا:
﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ! کُلُّکُمْ بَنُو اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ﴾ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اس لیے کسی عربی کو عجمی پر، کسی سفید کو کالے پر فخر کرنے اور بڑائی جتلانے کی ضرورت نہیں ہے ﴿إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاکُمْ﴾ تم میں سب سے باعزت اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔ اس لیے ہمیں تو یہی دیکھنا ہے کہ وہاں کیا فیصلہ ہوتا ہے، یہاں دنیا میں کسی نے اگر واہ واہ کردی، یا تعریف کردی، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تواضع اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

(آمین)

اَلتَّوَاضُعِ وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِیْنَ

تواضع اختیار کرنا

﴿مجلس ۲﴾

۱۷؍جمادیٰ الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۶؍ستمبر ۲۰۰۰ء

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تواضع کا بیان چل رہا ہے اور اس کی شریعت میں بڑی تاکید ہے، اس سلسلہ میں بہت کچھ وضاحت گذشتہ مجلس میں آچکی ہے۔ آج کچھ روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا

۶۰۳:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلاَّ عِزّاً، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔ اور معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندہ کی عزت ہی بڑھاتے ہیں۔ اور کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا اور اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے درجہ کو بلند ہی کرتے ہیں۔

افادات:- بعض روایتوں میں حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے کلمات کو قسم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے یعنی حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔ چوں کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کرنے کی وجہ سے مال کم ہو رہا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرماتے ہوئے قسم کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی کہ دیکھنے میں اگرچہ صدقہ کرنے کی وجہ سے آپ کو ایسا نظر آتا ہے کہ مال آپ کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس میں کمی ہو رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدقہ کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ مال میں اضافہ ہی فرماتے ہیں۔

معافی عزت بڑھاتی ہے

"وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلَّا عِزّاً"، اور بندے کے معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت وآبرو میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔ یعنی کسی آدمی نے آپ کی شان میں گستاخی کردی، کوئی ناروا معاملہ اور نامناسب سلوک کردیا، آپ کو گالی دی، لیکن جب آپ اس کو معاف کررہے ہیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے اور ہمارا نفس دھوکہ بھی دیتا ہے کہ تم اس کو معاف کرکے اپنی کمزوری دکھلاتے ہو؟ اس میں تو اپنی بے عزتی ہے اور عام طور پر اسی کی وجہ سے آدمی کو طیش آجاتا ہے، اس کی طبیعت میں غصہ آجاتا ہے، اور انتقام کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی طرف سے آپ کے ساتھ کی گئی اس گستاخی اور نامناسب سلوک کو اگر آپ معاف کردیں گے، تو یوں نہ سمجھئے کہ اس کی وجہ سے آپ کی عزت پر کوئی حرف آگیا اور آپ کی عزت میں کمی ہوگئی، آپ کا ویلیو گھٹ گیا اور بے عزتی ہوگئی۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، بلکہ معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی عزت بڑھائیں گے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاف کرکے آدمی اپنی کمزوری دکھارہا ہے اور عزت گھٹ رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کے نتیجہ میں اس کی عزت کو اور زیادہ بڑھائیں گے، اس میں اور اضافہ کریں گے۔

الیوم یوم المرحمة

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ زندگی بھر جن لوگوں نے ایذا رسانی کا معاملہ کیا، آپ کی عزت کے درپے رہے، آپ کو طرح طرح سے تکلیفیں پہنچائیں، آپ کو جھٹلایا، آپ کو وطن سے بے وطن کیا، یہاں تک کہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بھی آپ کے پیچھے

پڑے رہے، لشکر لے کر حملے کرنے کے لیے آتے رہے۔ ایسا معاملہ کرنے والوں کو آخر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقعہ پر معاف کر دیا۔ جب آپ کعبۃ اللہ سے باہر آئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ مکہ والے تمام کے تمام مسجدِ حرام میں جمع ہیں، تو آپ نے پوچھا: تم لوگ میرے متعلق کیا خیال کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ ان لوگوں نے جواب دیا: "أَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيْمٍ" آپ شریف بھائی ہیں، شریف بھائی کے بیٹے ہیں، ہم آپ سے بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، إِذْهَبُوْا، أَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ" اکثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی معاف کرنے بعد بھی دو ایک جملے تو کہہ ہی دیتا ہے کہ چلو! معاف کر دیا، پھر ایک آدھ بات سنا دیتا ہے، لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، جاؤ! تم سب آزاد ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تو اس کی وجہ سے کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت میں کمی آ گئی؟ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے عزت اور بڑھا دی، آپ کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہوا۔ کوئی آدمی اگر یہ سمجھتا ہو کہ اس کے ساتھ نازیبا، ناروا اور نامناسب سلوک کرنے والے، یا گالی دینے والے، یا ایذائیں اور تکلیفیں پہنچانے والے کو معاف کرنے کی وجہ سے ہماری عزت گھٹتی ہے؛ تو اس کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، اللہ تعالیٰ اس کے نتیجہ میں اس کی عزت کو بڑھاتے ہی ہیں، کر کے تو دیکھو۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب قسم کھا کر ایک بات فرما رہے ہیں تو آدمی تجربہ کر لے، تجربہ کرنے سے آپ ہی آپ اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔

تواضع کی زبردست خاصیت

"وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ" کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے

تواضع اختیار کرتا ہے، اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے درجہ کو بلند ہی کرتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کبریائی و بڑائی اور اس کی عظمت جس کے دل میں سما جائے، اس کی بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے؟ پھر بھلا وہ اپنے آپ کو کہاں اونچا اور بڑا سمجھ سکتا ہے؟ جس کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار ہر وقت ہو، جس کی نگاہوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بڑائی و کبریائی ہو، وہ کبھی اپنی ذات کی طرف نظر کر ہی نہیں سکتا۔

جب عظمت الٰہی جاگزیں ہوتی ہے

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾ دنیا کے بادشاہوں کا دستور یہ ہے کہ جب کسی آبادی یا ملک میں فاتحانہ طور پر داخل ہوتے ہیں تو اس کو زیر کر کے اس کے عزت والے لوگوں اور سرداروں کو قید کر کے رسوا و ذلیل کرتے ہیں؛ تاکہ وہ دوبارہ مقابلہ میں سر اُٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عظمت جب کسی دل میں آجاتی ہے تو پھر نفس کا غرور، اس کا کبر، اس کا حسد اور جتنے بھی بڑے بڑے روگ نفس کے اندر ہیں، سب زیر ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ختم کر دیتا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سربلندی عطا فرماتے ہیں۔ یہ تواضع کی زبردست خاصیت ہے۔

کتے اور سور سے بھی گیا گزرا

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سربلندی عطا فرماتے ہیں "فَهُوَ فِيْ نَفْسِهٖ صَغِيْرٌ وَفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ

عَظِيمٌ "، وہ اپنی نگاہوں میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو آدمی تکبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے رہتا ہے "فَهُوَ فِي أَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيرٌ، وَفِي نَفْسِهِ كَبِيرٌ"، وہ آدمی اپنی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے کہ مجھ جیسا کوئی نہیں "ہم چوں من دیگرے نیست"، بعض لوگوں نے اس میں ترمیم کرتے ہوئے یہ کہا ہے "ہم چوں من ڈنگرے نیست" میرے جیسا کوئی جانور نہیں ہے۔ جب وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا اہم مرتبہ کوئی نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے، لیکن لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتا ہے آگے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "حَتَّى لَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِنْ كَلْبٍ أَوْ خِنْزِيرٍ"، یہاں تک کہ لوگوں کی نگاہوں میں وہ کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوجاتا ہے (شعب الایمان: ۷۷۹۰) وہ آدمی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے، لیکن اس کو معلوم نہیں کہ لوگوں کا میرے متعلق کیا خیال ہے۔

پچھلی مجلس میں عربی کی ایک کہاوت سنائی تھی کہ جو آدمی تکبر کرنے والا ہوتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پہاڑ پر کھڑا ہونے والا آدمی ہوتا ہے، اس کو نیچے والے چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، وہ اپنے تکبر کی وجہ سے دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے، لیکن نیچے والے بھی اس کو چھوٹا ہی دیکھتے ہیں، یعنی نیچے والوں کو بھی وہ بڑا نظر نہیں آتا۔

تواضع کا اعلیٰ نمونہ

۶۰۴:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: أَنَّهُ مَرَّ عَلَى صبيانٍ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ، وقال: كَانَ النبيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يفعله. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کچھ بچوں کے پاس سے گزر ہوا تو

انہوں نے خود ہی بچوں کو سلام کیا، اس کے بعد فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

افادات:- یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو آپ ازخود بچوں کو سلام کرتے تھے۔ اس سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع کا پتہ چلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام تو بہت بلند تھا، اس کے باوجود آپ جب بچوں کے پاس سے گذرتے تھے تو سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ ویسے بھی بعض روایتوں میں ہے: "اَلْبَادِئُ بِالسَّلَامِ بَرِیْئٌ مِنَ الْکِبْرِ (فیض القدیر شرح جامع الصغیر)" جو آدمی سلام میں ابتدا کرتا ہے وہ عام طور پر تکبر سے بری ہوتا ہے۔ اور جس کے دل میں کبر ہوتا ہے وہ عام طور پر سلام میں ابتدا نہیں کرتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے سلام کریں، میں کسی کو سلام کیوں کروں؟ لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ آپ بچوں تک کو اپنی طرف سے سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ اس میں بچوں کی تعلیم وتربیت بھی مقصود ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ایک اور نمونہ

۶۰۵:- وعنه قَالَ: إن كَانَتِ الأَمَةُ مِنْ إمَاءِ المَدِينَةِ لَتَأْخُذُ بِيَدِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَتَنْطَلِقُ بِهِ حَيْثُ شَاءَتْ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ کی باندیوں میں سے کوئی باندی (اور بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ مدینہ کی بچیوں میں سے کوئی بچی) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور جہاں چاہتی لے جاتی تھی۔

افادات:- یعنی آپ اس کے کہنے پر بھی انکار نہیں فرماتے تھے اور وہ آپ کو جہاں لے جانا چاہتی وہاں آپ تشریف لے جاتے تھے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غایتِ تواضع معلوم ہوتی ہے۔

گھر کے نبوی اعمال

۶۰۶:-وعن الأَسْوَدِ بن يَزِيدَ، قَالَ: سُئِلَتْ عائشةُ رضی اللہ عنہا مَا كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَصْنَعُ فِي بَيْتِهِ؟ قالت: كَانَ يَكُونُ في مِهْنَةِ أَهْلِهِ-يعني: خِدمَةَ أهلِه-فإذا حَضَرَتِ الصَّلاَةُ، خَرَجَ إِلَى الصَّلاَةِ. (رواه البخاري)

ترجمہ:-حضرت اُسود بن یزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: حضورِاکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب گھر میں تشریف لاتے تھے تو کیا کرتے تھے؟(یعنی گھر میں رہنے کے درمیان آپ کیا کام کرتے تھے؟) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: گھر والوں کے کام کاج میں رہتے تھے، لیکن جب نماز کا وقت آتا تھا تو فوراً نماز کے لیے نکل جاتے تھے۔

افادات:-یعنی ان کا تعاون کرتے تھے، گھر کے کام کاج میں مدد فرماتے تھے۔ چناں چہ بعض روایتوں میں ہے کہ اگر مَشک پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو اس کو سی لیتے تھے، جھاڑو دیتے تھے، بکری کا دودھ اپنے دستِ مبارک سے دوہتے تھے، اپنے کپڑے میں جوں تلاش کرتے تھے۔ ویسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جوں نہیں ہوتی تھی شرّاح نے لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ جب آدمی دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے تو کسی کی جوں چڑھ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں جا کر ان چھوٹے چھوٹے کاموں کا اہتمام فرماتے تھے۔ گھر والوں کے کام کاج میں اس طرح تعاون اور مدد کرنا، ان کا ہاتھ بٹانا؛ یہ غایتِ تواضع کی علامت ہے۔ متکبر بھلا ایسا کر سکتا ہے؟ وہ تو لیجیے دیجیے ہی میں لگا رہتا ہے۔ ایسا آدمی جب گھر بھی جاتا ہے تو گھر والے اس کی وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کب یہاں سے نکلے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ آدمی کو گھر میں بالکل ہلکا پھلکا رہنا چاہیے، بوجھل بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ یعنی گھر والوں

کے ساتھ آدمی کا معاملہ ایسا رہے کہ گھر والے اس کے وجود کو گھر میں برکت سمجھیں اور یہ سوچیں کہ جتنا زیادہ گھر میں رہے اتنا ہی اچھا ہے، اس کو بوجھ نہ سمجھیں کہ ذرا کسی بچے نے بھی کچھ کہہ دیا تو اس کو طمانچہ مار دیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی اگر گھر میں گئے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ اس نوع کا تھا کہ جب گھر والوں کے درمیان میں ہوتے تو گھر کے کام کاج میں ان کا ساتھ دیتے۔

جس وقت، جو فرض

آگے ایک بات فرمائی کہ جب نماز کا وقت آتا تھا تو فوراً نماز کے لیے نکل جاتے تھے۔ دراصل جس کا جیسا حق ہو اس کو ادا کرتے رہنا چاہیے، جب اللہ تعالیٰ کے حق کا وقت آ گیا تو اس کی ادائیگی میں بھی کوتاہی اور غفلت نہیں ہونی چاہیے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل بتلایا کہ نماز کا وقت آنے پر فوراً نماز کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ گھر میں جا کر گھر والوں کے کام میں ان کا ہاتھ تو بٹاتے ہیں، لیکن اس میں اتنا غلو کر جاتے ہیں کہ نماز کا وقت آتا ہے تو اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں، اُدھر کام میں ذرا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو یہاں تک ہاتھ بٹا رہے ہیں کہ اِدھر جماعت بھی چھوٹ رہی ہے۔ تو یہ طریقہ بھی بالکل غلط اور ناپسندیدہ ہے۔

پردیسی کے ساتھ متواضعانہ سلوک

۶۰۷:- وعن أَبِي رِفَاعَةَ تَمِيمِ بن أُسَيْدٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: انْتَهَيْتُ إِلَى رَسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَهُوَ يخطب، فقلت: يَا رسول الله! رَجُلٌ غَرِيبٌ جَاءَ يَسْأَلُ عن دِينهِ لا يَدْرِي مَا دِينُهُ؟ فَأَقْبَلَ عَلَيَّ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وتَرَكَ خُطْبَتَهُ حَتَّى انْتَهَى

إِلَيَّ، فَأُتِيَ بِكُرْسِيٍّ، فَقَعَدَ عَلَيْهِ، وَجَعَلَ يُعَلِّمُنِي مِمَّا عَلَّمَهُ اللهُ، ثُمَّ أَتَى خُطْبَتَهُ فَأَتَمَّ آخِرَهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابورفاعہ تمیم بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا کہ آپ تقریر فرمارہے تھے۔ میں نے پہنچتے ہی عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایک پردیسی آدمی اپنے دین کے متعلق آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے آیا ہے، اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا دین کیا ہے؟ (کس چیز کا عقیدہ رکھنا چاہیے؟ کس چیز کو عمل میں لانا چاہیے؟ دین کے متعلق اس کو معلومات چاہئیں) وہ صحابی کہتے ہیں کہ میری بات سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا خطبہ اور تقریر چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے یہاں تک کہ منبر سے اتر کر میرے پاس آئے، پھر کرسی لائی گئی تو آپ اس پر بیٹھے اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام بتلائے ہیں وہ مجھے سکھانے لگے۔ جب مجھے بتلا چکے تو پھر واپس منبر پر تشریف لے گئے اور اپنا خطبہ پورا کیا۔

افادات:- ایک پردیسی آدمی کی بات پر تقریر کو درمیان میں چھوڑ دینا غایت درجہ تواضع کی بات ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں آدمی منتظر رہتا ہے کہ یہ کام پورا کرلوں پھر آپ کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اگرچہ کوئی آدمی اپنے کسی کام میں مشغولی کی وجہ اس کو پورا کرنے کے بعد توجہ کرے تو یہ چیز تواضع کے منافی نہیں ہے۔

انگلیاں چاٹنا؛ تواضع کی علامت

۶۰۸:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ إِذَا أَكَلَ طَعَاماً، لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلاثَ. قَالَ: وقال: إِذَا سَقَطَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيُمِطْ عنها الأَذى، وليَأْكُلْها وَلاَيَدَعْهَا لِلشَّيْطان. وأمرَ أن تُسلَتَ القَصْعَةُ، قَالَ: فإِنَّكُمْ لاَتَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَة. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا کھا کر فارغ ہوجاتے تھے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا: کسی کا لقمہ اگر گر جائے تو اس پر جو میل مٹی لگی ہو اس کو دور کرے، پھر اس لقمے کو کھالے، اس کو شیطان کے لیے چھوڑ نہ دے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کر کے چاٹ لیا جائے، اس لیے کہ تم کو یہ پتہ نہیں ہے کہ تمہارے کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے۔

افادات:- عام طور پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ تین انگلیوں - انگوٹھا، انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی - سے کھاتے تھے۔ ان تین انگلیوں ہی سے لقمہ لیتے اور کھانا تناول فرماتے تھے اور جب کھانے سے فارغ ہوجاتے تو ان تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے۔ پہلے درمیانی پھر انگشتِ شہادت پھر انگوٹھا۔ اور انگلیوں کو چاٹنا غایتِ تواضع کی بات ہے، متکبر لوگ بھلا ایسا کہاں کر سکتے ہیں؟

شیطان کو آرام نہ پہنچاؤ

"وَلَا یَدَعْھَا لِلشَّیْطَانِ" اس لقمے کو شیطان کے لیے نہ چھوڑ دے۔ اگر آپ چھوڑ دیں گے تو گویا وہ شیطان کی غذا بنے گی، اور شیطان یہی چاہتا ہے، حالاں کہ شیطان کو تو بھوکا ہی رکھنا چاہیے، اس کو کسی طرح کا آرام نہیں پہنچانا چاہیے۔

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب گھر میں داخل ہو تو اللہ کا نام لے کر داخل ہو، اگر آدمی اللہ کا نام لیے بغیر اور گھر میں داخل ہوتے وقت کی جو دعائیں ہیں وہ پڑھے بغیر داخل ہوتا ہے تو شیطان خوش ہوتا ہے کہ چلو! آج اس گھر میں ہمیں رات کو قیام کا موقع مل گیا۔ اسی طرح کھانا شروع کرتے ہوئے بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تو وہ خوش ہوجاتا ہے کہ چلو! ہم کو کھانے میں شرکت مل گئی۔ اسی لیے شریعت نے ان چیزوں

میں اللہ کا نام سکھایا ہے، اور شیطان ان میں سے اپنا حصہ نکلوانے کے لیے مختلف تدبیریں اپناتا ہے، وہ ایسی کوششیں کرتا ہے کہ کسی بھی طرح کچھ نہ کچھ آپ سے چھین لے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی لوگ ساتھ میں کھانے کے لیے بیٹھے ہیں تو وہ کسی ایسے آدمی کو لے آتا ہے جس نے بسم اللہ نہ پڑھی ہو۔

شیطان لُچّا ہے

ایک مرتبہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک باندی دوڑی ہوئی آئی اور برتن میں ہاتھ ڈالنا ہی چاہتی تھی کہ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی دوران ایک اور دیہاتی آیا اور جلدی سے بسم اللہ پڑھے بغیر ہی ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا، آپ نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، پھر ارشاد فرمایا: دیکھو! شیطان کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں (صحیح مسلم: ۵۳۷۸/ مسند احمد) شیطان یہ چاہتا تھا کہ بسم اللہ پڑھوائے بغیر ان کو کھانا کھلوائے تا کہ اس کے ضمن میں خود اس کو بھی کھانا مل جائے، لیکن میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ معلوم ہوا کہ اس کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے۔

اس طرح کھاتے کھاتے ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لقمہ گر جاتا ہے، تو ہوسکتا ہے کہ شیطان ہی نے آپ کے ہاتھ سے کسی طریقہ سے گروادیا ہو۔ جو لُچّے لوگ ہوتے ہیں نا وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں کہ آپ کوئی چیز کھا رہے ہوں تو ہاتھ مار دیتے ہیں تا کہ گر جائے اور وہ اٹھا کر کھالیں۔ تو شیطان بھی لُچّا ہے، اس کی عادت بھی یہی ہے کہ آپ کے ہاتھ سے لقمہ کسی طرح نیچے گرادے، اگر آپ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں گے تو وہ کھالے گا اور اس کا مقصد حاصل ہوجائے گا، اس لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ آپ اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھالیجیے، تا کہ شیطان کو شرکت کا موقع نہ ملے۔

ایک جزو بھی ضائع نہ جائے

"فَإِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِيْ أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کر کے چاٹ لیا جائے، اس لیے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے۔ یعنی پیالے میں جتنا کھانا ہے وہ اگر آپ پورا کر چکے ہیں لیکن اس کے کناروں کے اوپر کھانے کے تھوڑے اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو چھوڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کو صاف کرلو۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیالے میں ایک کلو کھانا رکھا ہوا ہے وہ سب کھا ہی جاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ضرورت کم ہے، اور کھانے کی مقدار زیادہ ہے، تو وہ دوسرے موقع پر کھالی جائے گی، لیکن کھانے کے جو ذرّات اور دانے اس پیالے اور برتن کے اِدھر اُدھر کونے میں لگے ہوئے ہیں، اگر آپ صاف نہیں کریں گے تو وہ ضائع ہو کر شیطان کا حصہ بنیں گے، اس لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پیالے کو انگلی سے صاف کرلو اور چاٹ لو، پتہ نہیں کہ کھانے کی برکت کون سے حصہ میں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسی کو چاٹ لینے کے نتیجہ میں آدمی کو سیری نصیب ہو جاتی ہے، اور برکت کا مطلب یہی ہے کہ آدمی کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے، ورنہ کھانے کے بعد بھی تقاضا باقی رہ جاتا ہے۔

قدرِ نعمت

ہمارے اکابر تو اس بات کا یہاں تک اہتمام کرتے تھے کہ جو ذرّات منھ میں رہ جاتے وہ بھی ضائع نہ چلے جائیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے

متعلق سنا کہ کھانا کھا چکنے کے بعد کلی کرنے سے پہلے ایک گھونٹ پانی منہ میں گھما کر حلق سے نیچے اتار لیتے تھے، تاکہ کھانے کے وہ ذرّات باہر نہ گر جائیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہیں سے کوئی ہدیہ آیا، اس ٹوکری پر کچھ ذرّات لگے ہوئے تھے تو آپ نے بڑی محنت سے ان کو تلاش کر کے نوش فرمایا تاکہ وہ ضائع نہ جائیں۔ درحقیقت یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، آدمی جب اس بات کو مدِّ نظر رکھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے تو پھر اس کو قدر ہوگی اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کا اہتمام ہوگا۔

حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ اس کی بڑی اچھی مثال دے کر سمجھاتے تھے: کسی بڑے آدمی نے آپ کو کوئی چھوٹی سی چیز- کھانے کے دو چار لقمے، ایک دو پیڑے، یا تھوڑی سی مٹھائی - دی، اس کے سامنے آپ وہ چیز کھا رہے ہیں اور وہ دیکھ بھی رہا ہے، تو اب اس کا کوئی ذرہ بھی نیچے گرے گا تو آپ یہ سوچ کر جلدی سے اس کو اٹھا لیں گے کہ وہ دیکھ رہا ہے، اگر نہیں اٹھاؤں گا تو وہ کیا کہے گا کہ میری دی ہوئی چیز کی اس کے نزدیک کوئی قدر نہیں ہے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہر چیز کو دیکھ ہی رہا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت کی قدردانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی دی چیز کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، اگر کسی نے پانی پیا اور آدھا گلاس بچ گیا، تو اس کو پھینکنے کی اجازت نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ بھائی! اس کو رہنے دو، کوئی دوسرا پی لے گا۔

......تب قدر ہوتی ہے

دراصل ہمارے پاس پانی وافر مقدار میں موجود ہے اس لیے ہمیں قدر نہیں

ہے۔آپ نے سنا ہوگا کہ جہاں پانی نہیں ملتا یا کبھی کوئی ایسا موقع آجاتا ہے کہ پانی کی قلت ہوجاتی ہے؛ تب اس کی قدر ہوتی ہے۔ کنڈلا (گجرات کے ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے) میں جو سمندری طوفان آیا تھا، اس کے بعد وہاں پانی کی قلت ہوگئی تھی، وہاں جانے والوں نے بتایا کہ جو لوگ مدد کی اشیاء لے کر گئے تھے ان کے پاس خود کے پینے کے لیے پانی کی بوتلیں تھیں۔ وہاں کے لوگ ان کے پاس جمع ہوجاتے اور عاجزی کرتے کہ ہم اتنی مدت سے پیاسے ہیں، ہمیں ایک گھونٹ پانی دے دو۔ ایک گھونٹ پانی کی قدر ایسے مواقع پر معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی قیمتی نعمت ہے۔ اس لیے اس کی قدردانی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

اس روایت میں پیالے کو چاٹنے کا حکم ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے، یہ سب تواضع ہی کی چیزیں ہیں۔ جس آدمی کے مزاج میں تکبر ہوگا، وہ بھلا ایسے کام کیسے کرے گا!

وہ ادا بہت پسند آئی

۶۰۹:- وعن أَبِي هـريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: ((مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيّاً إِلاَّ رَعَى الغَنَمَ)) قَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لأَهْلِ مَكَّةَ)) (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس نے بکریاں چرائی۔ صحابۂ کرامؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جی ہاں! مَیں چند قیراط (سکوں) کے بدلہ میں مکہ والوں کی بکریاں چَرایا کرتا تھا۔

افادات:- ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں اور آپ ﷺ کا بھی بکریاں چرانا ثابت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضراتِ انبیاء کی تربیت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بکری ویسے تو بڑا مسکین جانور ہے لیکن جب ضد پر آجاتی ہے اور اپنے اگلے پاؤں چوڑے کرکے کھڑی ہوجاتی ہے، تو اس کو ڈنڈا مارو؛ تب بھی نہیں ہٹتی، اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی لیکن ہٹے گی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تمہیں یاد ہے تم ایک مرتبہ بکریاں چرارہے تھے، ایک بکری بھاگی تو تم اس کے پیچھے دوڑے، وہ برابر دوڑتی جارہی تھی اور تم اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے، یہاں تک کہ جب وہ بھی تھک گئی اور تم بھی تھک گئے، تو وہ تمہارے ہاتھ آگئی۔ تم اس کو گود میں لے کر کہنے لگے: ارے پیاری! تو نے اتنا بھاگ کر اپنے آپ کو بھی تھکایا اور مجھے بھی تھکادیا۔ تمہاری یہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔ پھر اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کلام فرمایا۔

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ بکریوں کے چرانے میں حضراتِ انبیاء کی ایک طرح سے تربیت کی جاتی تھی۔

حضراتِ انبیاء کی تربیت

ایک موقع پر نبی کریم ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں ایک جگہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پیلو کے پھل توڑنے لگے تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کالا دیکھ کر توڑنا۔ پیلو کا پھل جب کچا ہوتا ہے تو سبز ہوتا ہے، پھر اس میں پیلا پن آتا ہے، پھر سرخی آتی ہے اور پھر کالا ہوتا ہے، اور جو کالا ہوتا وہی میٹھا ہوتا ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے بکریاں چرائی ہیں؟ یعنی یہ نکتہ تو اسی آدمی

کومعلوم ہوسکتا ہے جو بکریاں چَرانے کے لیے جنگل میں گیا ہو۔ گھر پر رہے ہوئے آدمی کو یہ بات معلوم نہیں ہوسکتی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! میں نے بکریاں چَرائی ہیں، اور ہر نبی نے بکریاں چَرائی ہیں۔

ایک بات یاد رہے

تو بکریاں چَرانا تواضع کی بات ہے اور تواضع پیدا کرنے والی بھی ہے، لیکن ایک بات یاد رہے کہ جس کو بکریاں پالنے کا شوق ہو وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کے لیے ایذاء کا باعث نہ ہو۔ بعض لوگ شوق میں بکریاں پالتے ہیں، پھر ان کی نگرانی نہیں کرتے تو پڑوسیوں کو اس کی وجہ سے تکلیف ہوجاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس کی وجہ سے جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔

...... تو بھی قبول کرلوں گا

۶۱۰:- وعنہ، عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لَوْ دُعِیتُ إِلَی کُرَاعٍ أَوْ ذِرَاعٍ لأَجَبْتُ، ولو أُهْدِيَ إِلَيَّ ذراعٌ أَوْ كُراعٌ لَقَبِلْتُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی پائے یا دست کا گوشت کھانے کے لیے مجھے بلائے، تو میں اس کی دعوت کو قبول کروں گا۔ یا یہی چیزیں ہدیہ میں دے، تو میں اس کو بھی قبول کرلوں گا۔

افادات:- بکری کا جو اگلا پیر ہوتا ہے اس کو ''ذراع'' کہتے ہیں۔ آپ لوگ کہیں گے کہ پائے تو بہت اچھی چیز ہے، سورت والے ناشتہ میں بارہ ہانڈی اور پائے بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ اُس زمانہ میں پائے ایسے نہیں پکائے جاتے تھے، بلکہ وہ لوگ اس کو آگ پر بھون لیتے تھے، اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بعض

مرتبہ دیر تک کو کر میں پکانے بعد بھی وہ کچے رہ جاتے ہیں اور کھائے نہیں جاسکتے، تو آگ پر بھوننے پر کیسے بنتے ہوں گے۔ پھر پایوں میں کھانے کا حصہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی اگر مجھے اس کے لیے بھی دعوت دے گا تو میں قبول کروں گا اور اس کے گھر پر حاضری دوں گا۔ یا ہدیہ میں بھی دے گا تو میں اس کو قبول کرلوں گا۔ یہ بھی نہایت تواضع کی بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی معمولی یا کم قیمت چیز۔ جس کی قدر و قیمت زیادہ نہ سمجھی جاتی ہو۔ بھی کسی آدمی کو دی جائے، اور وہ اس کو قبول کرلے تو یہ تواضع کی دلیل ہے۔ ورنہ جو آدمی متکبر ہوتا ہے وہ ایسی چیز کو کہاں قبول کرے گا؟ وہ تو طرح طرح کی باتیں بنائے گا کہ یہ کیا چیز دینے آئے ہو؟ کیا میری بے عزتی کر رہے ہو؟

کوئی چیز جب سر اُٹھاتی ہے

۶۱۱:-وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَتْ نَاقَةُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم العَضْبَاءُ لَاتُسْبَقُ أَوْلَا تَكَادُ تُسْبَقُ، فَجَاءَ أَعْرَابِيٌّ عَلَى قَعُودٍ لَهُ، فَسَبَقَهَا، فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ حَتَّى عَرَفَهُ، فَقَالَ: حَقٌّ عَلَى اللهِ أَنْ لَا يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا وَضَعَهُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی عضباء ہمیشہ آگے ہی رہتی تھی، کوئی دوسرا اونٹ اس سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک دیہاتی اپنے نوعمر اونٹ پر آیا، اور اس سے آگے نکل گیا، یہ چیز صحابہ کرامؓ پر بڑی شاق گذری (برداشت نہیں ہوئی) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ان جذبات واحساسات کو ان کے چہروں سے محسوس کیا تو ایک اصول ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ضروری ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اُٹھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس

کو نیچا کر کے رہتے ہیں۔

افادات:۔ ’’عضباء‘‘ آپ ﷺ کی اونٹنی کا نام ہے۔ ’’عضباء‘‘ دراصل ایسی اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا کان کٹا ہوا ہو۔ اس اونٹنی کا کان کٹا ہوا تھا یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ اس کا نام نہیں تھا بلکہ اس کا صرف لقب تھا۔

قدرت کا ایک دستور اور قانون ہے کہ جو سر اٹھائے گا، اس کو نیچا ہونا ہے۔ اس لیے کوئی آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا بنانے کی کوشش نہ کرے، ورنہ ہوتا یہی ہے کہ اس کے لیے قدرت کی طرف سے نیچا ہونے کی شکلیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے مشکوٰۃ شریف کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی تھی کہ جو آدمی تکبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے رہتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آدمی تواضع اختیار کرنے کا اہتمام کرے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق وسعادت نصیب فرمائے

تحریم الکبر والاعجاب

کبر وخود پسندی کی حرمت

۲۴؍جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۲۳؍ستمبر ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

تِلۡکَ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ نَجۡعَلُھَا لِلَّذِیۡنَ لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔

تکبر اور خود پسندی

نیا عنوان قائم کیا ہے: تکبر اور خود پسندی کا حرام ہونا۔

تکبر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے دوسروں کو حقیر سمجھے۔ اور خود پسندی یہ ہے کہ اپنی خوبیوں پر دوسرے کسی کی تحقیر کے بغیر دل ہی دل میں اِترانا۔ یعنی اپنی ذات کے متعلق اچھا گمان ہو، اس میں دوسرے کی تحقیر نہیں ہوتی؛ یہ عجب اور خود پسندی ہے۔

...... جو بڑا بننا نہیں چاہتے

قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿تِلۡکَ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ نَجۡعَلُھَا لِلَّذِیۡنَ لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ﴾ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے جو زمین کے اندر نہ تو بڑا بننا چاہتے ہیں، اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور اچھا انجام متقیوں کے واسطے ہے۔ گویا جب آدمی بڑا بننا چاہتا ہے تو اسی کے

نتیجہ میں بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور زمین میں فساد ہوتا ہے۔ اور جو لوگ زمین میں تواضع کے ساتھ رہتے ہیں، بڑائی نہیں چاہتے وہ فساد بھی نہیں پھیلاتے۔ تو اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے ہی لوگوں کو وہاں کا گھر اور نعمتیں عطا فرمائیں گے۔

زمین میں اکڑ کر مت چلو

ایک اور آیت کا حصہ پیش کیا ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً﴾ زمین میں اکڑ کر مت چلو۔ ”مَرَحٌ“ یعنی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اکڑ کر چلنا۔

سورۂ لقمان کی آیت پیش کی ہے: ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ اپنے رخسار کو تکبر کی وجہ سے لوگوں سے مت پھیرو (متکبر اپنی بڑائی جتلانے کے واسطے لوگوں سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے، منھ موڑ لیتا اور اعراض کرتا ہے) اور زمین میں اترا کر نہ چلو، بیشک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے اترانے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو دشمن رکھتا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنا دشمن بنائیں پھر اس کے لیے دنیا میں کہاں ٹھکانہ رہے گا، اور کون اس کو اونچا لا سکے گا؟

اترانے کا عبرتناک انجام

قارون کے متعلق قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے (تعلق رکھتا) تھا، اپنی قوم کے مقابلہ میں وہ سرکشی اور غرور پر اتر آیا۔ ہم نے اس کو

ایسے خزانے عطا فرمائے تھے جن کی کنجیاں بھی بڑے طاقتور لوگوں کی ایک پوری جماعت اٹھایا کرتی تھی۔ لوگوں نے اس سے کہا: تو مت اِترا، اِترانے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے، (لیکن وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آیا اور ایک روز اسی اتراہٹ کے اندر عمدہ لباس پہنے ہوئے، اپنے بالوں کو سنوارے ہوئے اکڑتے ہوئے چل رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی دولت، خزانوں، مکان واپارٹمنٹ کے ساتھ زمین کے اندر دھنسا دیا اور قیامت تک دھنستا چلا جائے گا)

گویا جو آدمی عجب، خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار اور لعنت برستی ہے، اور ایسا انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب کا حق دار بنتا ہے۔

ذرّہ برابر تکبر کی سزا

۶۱۲:-وعن عبد الله بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لاَ يَدْخُلُ الجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِى قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ !. فَقَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَناً ، وَنَعْلُهُ حَسَنَةً ؟ قَالَ: إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الجَمَالَ، الكِبْرُ: بَطَرُ الحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ. (رواه مسلم)

(بَطَرُ الحَقِّ): دَفْعُهُ وَرَدُّهُ عَلَى قَائِلِهِ. وَ(غَمْطُ النَّاسِ): احْتِقَارُهُمْ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کے دل میں ذرّہ برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کیا: آدمی تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کے جوتے اعلیٰ ہوں (لباس کے معاملہ میں عمدگی کو پسند کرتا ہے؛ تو کیا یہ تکبر کی بات ہے؟) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جمیل وخوبصورت ہے، اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کا انکار کرنا، قبول نہ

کرنا، اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

افادات:- تکبر کو شیطانی گناہ بتلایا گیا ہے، اور ایسے گناہوں پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ یعنی ذرّہ برابر دل میں تکبر ہوگا تو اس کے ہوتے ہوئے وہ آدمی جنت میں نہیں جا سکتا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں ہوتی ہیں، ان کو عربی میں ''ذرّۃٌ'' کہتے ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھڑکی یا دروازہ کے سوراخ سے دھوپ کسی اندھیرے گھر میں آتی ہے تو اس دھوپ کے اندر کچھ اُڑتا ہوا نظر آتا ہے جو عام حالت میں نظر نہیں آتا؛ اسی کو ''ذرّہ'' کہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے ایک روٹی کا وزن کیا اور پھر اس کو کسی جگہ رکھ دیا تو زرد رنگ کی بہت ساری چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں اس پر آ گئیں، اس کے بعد ان تمام چونٹیوں سمیت اس کا وزن کیا، تو وزن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مطلب یہ ہے کہ تکبر کا اتنا کم حصہ کہ جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، اتنا بھی کسی کے دل میں ہے تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ بہت سخت وعید ہے۔

ٹھیک ٹھاک اور ٹیپ ٹاپ

''إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الجَمَالَ'' اللہ تعالیٰ جمیل وخوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ ''جمال'' کا ترجمہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک ٹھاک فرمایا ہے، اور اس کی تشریح یہ فرمائی ہے کہ آدمی کا اپنی حالت کو درست رکھنا۔ ایسی صورت نہ ہو کہ اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر کسی کو نفرت یا دل میں کدورت پیدا ہو۔ بعضوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ ایک پائنچہ اونچا اور دوسرا نیچا ہے، ایک آستین چوڑی،

دوسری تنگ ہے، ٹوپی بھی پھٹی ہوئی ہے، کپڑے میلے کچیلے اور بال بھی بکھرے ہوئے ہیں؛ ایسی ہیئت کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ آدمی کا لباس چاہے معمولی ہو، لیکن صاف ستھرا ہو اور اس کی ہیئت ٹھیک ٹھاک ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک تو ہے ٹھیک ٹھاک، اور ایک ہے ٹیپ ٹاپ۔ ٹیپ ٹاپ یعنی تجمل اور زینت؛ اس کو مردوں کے لیے پسندیدہ قرار نہیں دیا ہے، ہاں! عورتوں کے لیے پسندیدہ ہے جبکہ اپنے شوہر کے لیے کرتی ہوں۔ مرد اپنے آپ کو ایسی چیزوں میں لگائے اس کو پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ ٹھیک ٹھاک تو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، لیکن ٹیپ ٹاپ پسند نہیں ہے۔ گویا ٹھیک ٹھاک ایک درمیانی حالت ہے، اور ٹیپ ٹاپ میں آدمی آگے بڑھتا اور غلو کر جاتا ہے، اس لیے اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ تو آدمی اپنا حال درمیانی رکھے، یہ اچھی چیز ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند بھی کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے؛ یہ تکبر نہیں ہے۔

یہ تکبر نہیں

تو پھر تکبر کیا ہے؟ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی اس کی تشریح فرمائی ہے۔ اچھا لباس پہننا، اچھا جوتا اور اچھی ٹوپی استعمال کرنا؛ اس کا نام تکبر نہیں ہے، بلکہ "اَلْكِبْرُ: بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ" حق کا انکار کرنا، حق قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا؛ یہ تکبر ہے۔ اگر اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہن کر مزاج میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ کوئی آدمی صحیح اور درست بات کہتا ہے، حق بات پیش کرتا ہے؛ تب بھی وہ انکار کر دیتا ہے کہ اس نے مجھے کیوں کہا؟ دیکھتا نہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں؟ تو یہ تکبر ہوا۔ باقی آدمی اپنا لباس عمدہ سے عمدہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ سچائی کو کبھی رد نہیں کرتا، جو حق بات اس کے

سامنے پیش کی جاتی ہے اس کو فوراً قبول کر لیتا ہے؛ تو پھر اس کو تکبر نہیں کہیں گے۔

یہ کبر ہے

اور کوئی آدمی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے لیکن حق بات پیش کی جاتی ہے تو وہ قبول کرنے لیے تیار نہیں ہوتا، انکار کر دیتا ہے؛ تو یہ تکبر کی بات ہے۔ بعض فقراء اس مزاج کے ہوتے ہیں، صاحبِ ثروت ہی متکبر ہو یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ تو دل کی ایک کیفیت ہے۔ چناں چہ وہ فقیر جو متکبر ہو، اس کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ اگر کچھ پاس ہے اور تکبر کرتا ہے تو کوئی بات بھی ہے کہ اس کی وجہ سے تکبر پیدا ہوا، لیکن کوئی آدمی فاقہ مست ہے اور تکبر کرتا ہے؛ تو یہ تو بہت ہی زیادہ بری چیز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ: وہ اپنی دمڑی میں مست اور ہم اپنی چمڑی میں مست۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چمڑی کونسی مستی کی چیز ہے۔

خبثِ باطن

جس کے اندر کسی گناہ کا سبب ہو اور وہ گناہ کا ارتکاب کرے تو کوئی بات بھی ہے۔ جیسے احادیث میں تین آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ، اور تیسرا تکبر کرنے والا فقیر؛ ان تینوں کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مبغوض و ناپسندیدہ رکھتے ہیں۔

بوڑھا زانی: بڑھاپے میں ویسے بھی آدمی کے قویٰ جواب دینے لگتے ہیں، بیوی موجود ہو تب بھی آدمی کو اس کی طرف رغبت اور میلان کم ہو جاتا ہے، اور یہ بوڑھا ہو کر زنا میں مبتلا ہوا۔ یہ تو عمر کی وہ منزل تھی کہ اس زمانہ میں حلال طریقے سے بھی یہ چیز ملتی ہے تو آدمی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، چہ جائیکہ حرام میں مبتلا ہوا۔ گویا یہ اس

کے باطنی خبث پر دلالت کرنے والی چیز ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کو بھی بہت زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ رکھتے ہیں۔

جھوٹا بادشاہ: آدمی عام طور پر جھوٹ اس لیے بولتا ہے کہ وہ کوئی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ سچائی کے ساتھ میں وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکوں گا، لیکن بادشاہ کے پاس تو ساری سلطنت ہے، اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس کا جھوٹ بولنا تو باطن میں خباثت کا پتہ دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کو مبغوض رکھتے ہیں۔

فقیر متکبر: فقر کے ساتھ تکبر کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس کے پاس کچھ ہوتا، ثروت و دولت ہوتی، کوئی منصب وعہدہ ہوتا اور اس کے ساتھ تکبر ہوتا، تو کوئی بات بھی تھی، لیکن فقر کے ساتھ تکبر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ باطنی خبث کی وجہ سے یہ حرکت کر رہا ہے۔

کوئی برا نہیں......

تو تکبر کی ایک علامت حق کا انکار کرنا۔ اور دوسری علامت کسی کو حقیر سمجھنا۔ تحقیر بھی بہت خطرناک چیز ہے، شریعت اس کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی۔ مسلم شریف کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ" کسی آدمی کی برائی کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، اللہ تعالیٰ نے ایک مؤمن کے دل میں ایمان کی جو کیفیت اور دولت پیدا فرمائی ہے اس کی وجہ سے اس کا اکرام کرنے کی اور اس کی تحقیر سے بچنے کی شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے، اس کے پاس بہت بڑی دولت ہے، بلکہ لکھا ہے کہ دوسری مخلوقات کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

عطاء اور بقاء کا مراقبہ

اور سوال یہ ہے کہ آدمی کس بنیاد پر کسی دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے؟ اس لیے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے اس میں اس کے کمال کو کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جب بھی آدمی کو یہ خیال پیدا ہو کہ میرے پاس دولت ہے، علم ہے تقویٰ و بزرگی ہے، عملِ صالح ہے، کوئی منصب وعہدہ ہے، غرض ہر وہ چیز جس کی وجہ سے دل میں تکبر پیدا ہوسکتا ہے، تو اس کے متعلق آدمی یوں سوچے کہ یہ سب مجھے میرے استحقاق کی وجہ سے نہیں ملا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچے کہ اس کا بقا بھی اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہی موقوف ہے، مثلاً: دولت، علم، بزرگی اور تقویٰ؛ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوگا تب ہی باقی رہیں گی، ورنہ آن کی آن میں اللہ تعالیٰ اس کو ختم بھی کرسکتا ہے۔ اگر دماغ پر ذرا سا اثر آ گیا تو ساری عقل غائب، اور سارا علم ختم ہو جاتا ہے کیسا ہی آدمی ہو، وہ لوگوں کے لیے کھلونا بن جاتا ہے، ساری چیزیں اور سارے کمالات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات غور کرتے رہنی چاہیے کہ جو کچھ بھی ہے، محض اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی بخشش ہے، اور اس میں میرے کسی بھی استحقاق کو دخل نہیں ہے، پھر اس کا باقی رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی پر موقوف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں جس کو کمزور سمجھ رہا ہوں، کیا ضروری ہے وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے۔ ابھی اس کے پاس یہ چیز نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ چیز آج جو میرے پاس ہے، کل کو اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ اچھے انداز میں اس کو دیدے۔ مثلاً: ہم اپنے آپ کو اس لیے بڑا سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس دولت ہے، اس کے پاس نہیں ہے، لیکن ہوسکتا

ہے کہ کل اس کے پاس ہم سے ڈبل دولت آجائے۔ دنیا میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں کہ کل جس کے پاس کچھ نہیں تھا، ایک مدت کے بعد اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہوجاتی ہے۔ تو اپنی جس نعمت کی وجہ سے مَیں اپنے آپ کو بڑا اور سامنے والے کو حقیر سمجھ رہا ہوں؛ کیا ضروری ہے کہ میرے پاس وہ نعمت باقی رہے اور کیا ضروری ہے کہ اس کے پاس آئندہ نہ آئے؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مجھ سے زیادہ مقدار میں دیدے۔ آدمی اگر یہ ساری باتیں سوچتا رہے گا تو کبھی کسی کی تحقیر دل میں پیدا نہیں ہوگی۔

اتنی نہ بڑھا……

اور تحقیر ہی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے آدمی محروم ہوجاتا ہے۔ جب یہ کیفیت کسی کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری عطا ہے، تیرے کمال کو اس میں کیا دخل ہے؟ اگر کسی کے پاس علم یا دولت، بزرگی، تقویٰ و پرہیزگاری ہے، اور وہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ تو اس کے بارے میں خود باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی گناہ سے بچ نہیں سکتا تھا۔

﴿مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا﴾ اہلِ علم جانتے ہیں کہ جب نکرہ نفی کے تحت آتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اور باری تعالیٰ پوری تاکید کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اس لیے اگر ہمیں توفیق ملی ہے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے: ﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ﴾ اپنے آپ

کو پاک صاف ظاہر مت کرو، اپنی پا کی پر مت اتراؤ، اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون گناہ سے بچنے والا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت ❁ دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

یعنی آدمی کو خود اپنے حالات پر نظر کرتے رہنا چاہیے، خود آدمی اپنے حالات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہوتا ہے، اس لیے کسی کی تحقیر تو ہونی ہی نہیں چاہیے۔

کبر سے ارتداد تک

پہلے بھی میں نے قصہ سنایا تھا، موقعہ کی مناسبت سے پھر سناتا ہوں۔ اس واقعہ کو ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدانِ عرفات سے روانگی کے لیے تیار تھے، آفتاب غروب ہو چکا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس یمن کے کچھ سردار قسم کے لوگ بھی موجود تھے، وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ ایسا لگ رہا ہے کہ حضور کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں کہ وہ آجائیں تو چلیں، لیکن پتہ نہیں کہ کس کا انتظار ہے؟ اتنے میں ایک نوجوان سانولے رنگ کا، دبلا پتلا، ہونٹ موٹے، چپٹا چہرہ آیا۔ یہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے لاڈلے تھے۔ چہرے مہرے سے خوبصورت نہیں تھے، ان کے والد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورے چٹے تھے، لیکن ان کی والدہ سیاہ فام تھیں، حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اُن کا ہی اثر آیا تھا۔ خیر! ان سردار قسم کے لوگوں نے جب اِن کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ: ان کی وجہ سے ہمیں اتنی دیر یہاں انتظار کروایا گیا؟ گویا ایک قسم کی تحقیر ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ — جو اس

واقعہ کے راوی ہیں-فرماتے ہیں: "فَلِذٰلِكَ كَفَرَ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ أَجَلِ ذَا"، اسی وجہ سے یمن والے کفر وارتداد میں مبتلا ہوئے۔

صاحبِ طبقات محمد بن سعد کہتے ہیں: میں نے اپنے استاذ یزید بن ہارون -جو بڑے محدث ہیں- سے پوچھا کہ حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا فتنہ پھیلا، بہت سے لوگ اسلام چھوڑ کر کافر ہو گئے ان میں یمن کے اسی علاقہ کے لوگ مبتلا ہوئے، اور اس کی وجہ ان کا یہی تحقیر کا جملہ تھا۔ (حیاۃ الصحابۃ۔ جلد: ۲۔ ص: ۵۳۴۔ الاستخفاف بالمسلم واحتقارہ)

دوسرا واقعہ

شیخ ابوعبداللہ اندلسی رحمۃ اللہ علیہ کا عبرت ناک واقعہ ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے پورا قصہ ذکر کیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل رسالہ لکھا ہے، کسی زمانہ میں مَیں نے اس کا گجراتی کیا تھا اور گجراتی میں وہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

ایک بڑے محدث تھے، قراءاتِ سبعہ کے ساتھ قرآنِ پاک کے حافظ، عربی کے بڑے ماہر، اور اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے، ان کی خانقاہیں تھیں، سیکڑوں ان کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ اپنے مریدوں کے ساتھ ایک جگہ سے گزر رہے تھے جو عیسائیوں کی بستی تھی، وہاں سے گذرنے کے دوران ان کے کلیساؤں اور عبادت گاہوں سے ناقوس کی آواز آ رہی تھی اور وہاں سور بھی چر رہے تھے۔ ان کے دل میں ان لوگوں کی تحقیر آئی کہ یہ عجیب قوم ہے، کس چیز کی عبادت کرتے ہیں اور کس دین پر عمل کرتے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ اسی وقت میں نے ایک آواز سنی کہ تمہیں جو کچھ ملا ہے، وہ تو ہماری

عطا ہے، اس میں تمہارے کونسے عمل اور صلاحیت کو دخل ہے؟ اسی بستی سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ اس بستی کے سردار کی نوجوان لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے کے لیے کنویں پر جارہی تھی، جب اس پر نظر پڑی تو ان کا دل اس پر آ گیا، شیخ وہیں کھڑے ہو گئے اور ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ مریدین منتظر ہیں کہ شیخ چلیں تو ہم بھی چلیں۔ کچھ دیر بعد شیخ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اب تو میں یہیں کا ہو گیا ہوں۔ پھر انہوں نے باقاعدہ پیغامِ نکاح بھیجا تو سردار نے کہا: میں اپنی بیٹی ایسے نہیں دے سکتا، بلکہ میری چند شرطیں ہیں: آپ ایک مدت تک یہیں رہیے، ہمارے دین کو اختیار کیجیے، اور اتنے زمانہ تک میرے سور چرائیے؛ تب میں اس کا نکاح آپ سے کروں گا۔ شیخ نے اپنے مریدوں سے اپنا رشتہ توڑ کر کہا: تم لوگ جاؤ، میں تمہارے ساتھ آنے والا نہیں ہوں، وہیں رہ گئے اور ایک لمبی مدت تک اسی حالت میں رہے۔

شیخ کے سب معتقدین پر اس واقعہ کا بڑا اثر تھا کہ اتنا بڑا محدث، اتنا بڑا عالم اور اتنا بڑا شیخِ وقت کس ابتلاء میں پھنس گیا! سب مریدین بیچارے رو رو کر دعا کرتے تھے کہ: اے اللہ! ہمارے شیخ کو اس ابتلاء وآزمائش سے نکال دے۔ کچھ مدت کے بعد مریدین شیخ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے واپس آئے، تو دیکھا کہ سر پر نصاریٰ کی ٹوپی ہے، کمر پر زنار باندھا ہوا ہے، اور اسی عصا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں جس کا سہارا لے کر اپنے مریدین کی تربیت کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے رہتے تھے، اور سوروں کو چَرا رہے ہیں۔ حضرت شبلیؒ اور حضرت جنیدؒ بھی اس قافلہ میں تھے، حضرت شبلی نے شیخ سے کچھ سوالات کیے کہ آپ کو تو پورا قرآنِ پاک قراءاتِ سبعہ کے ساتھ یاد تھا؛ اب بھی اس کی کوئی آیت یاد ہے؟ شیخ نے کہا: دو آیت کے سوا کچھ یاد نہیں، ایک تو یہ ہے: ﴿وَمَن يُّهِنِ اللهُ فَمَالَهُ مِن مُّكْرِمٍ إِنَّ اللهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ جس کو اللہ تعالیٰ ذلیل کرتا

ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور دوسری یہ ہے: ﴿وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ جس نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا تحقیق وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہوگیا۔ پھر پوچھا: آپ کو تو ہزاروں حدیثیں یاد تھیں، اب بھی کوئی یاد ہے؟ کہا: صرف ایک حدیث یاد ہے: "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ" جو آدمی اپنا دین بدل دے اس کو قتل کر دو۔

خیر! بعد میں پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، توبہ کر کے دوبارہ ایمان میں آئے، اور پھر وہی سارا علم اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عطا فرمایا۔ یہ سب ہو چکنے کے بعد میں انہوں نے اپنے اس ابتلاء و آزمائش کی جو وجہ بتلائی وہ یہی تھی کہ میرے دل میں اس بستی والوں کے متعلق حقارت کا جذبہ آیا تھا، اسی کی وجہ سے اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ طرف سے ڈالا گیا۔ (نوٹ:- یہ قصہ مفصل آپ بیتی نمبر ۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب۔)

دینی کام کرنے والوں سے

بہت سی مرتبہ دین کے کام میں لگے ہوئے لوگ اس قسم کی آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس کے پیچھے بھی عام طور پر یہی چیز کارفرما ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو دینی کام کی توفیق عطا فرمائی ہے، علمی، تصنیفی، تبلیغی، یا کسی بھی لائن سے؛ تو کبھی کسی بندۂ خدا کی تحقیر دل میں نہیں آنی چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ہر مسلمان کو حالاً اور کافر کو مآلاً اپنے سے بہتر و افضل سمجھتا ہوں۔ مسلمان کو اس لیے کہ ایمان جیسی نعمت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے، اور ہو سکتا ہے اس کی کوئی خوبی اور وصف ایسا ہو جو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو میرے مقابلہ میں زیادہ مقام دلانے کا باعث ہو؛ اس لیے میں اس کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔ اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا

ہوں، ہوسکتا ہے کہ کل کو وہ اسلام لے آئے، اور مدار تو خاتمہ پر ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کس کا خاتمہ کس حال پر ہوتا ہے، کسی کافر کے متعلق بھی ہم گارنٹی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کفر پر ہی مرے گا، کل کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دیدی، اور دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو وہ تو کامیاب ہوگیا، اور کسی مؤمن کے متعلق گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ ایمان کے ساتھ ہی دنیا سے جائے، نعوذ باللہ کہیں محرومی کی نوبت آئی اور ایمان سے محروم ہوکر گیا تو وہ ناکام ہوا۔ اس لیے آدمی کے دل میں کسی کی بھی تحقیر نہیں آنی چاہیے، اس سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، اس کے نتیجہ میں آدمی بہت ساری آزمائشوں میں مبتلا ہوتا ہے، اسی کو ''غَمْطُ النَّاس'' کہا گیا ہے۔

...... پھر کبھی ہاتھ نہ اٹھا سکا

۶۱۳:- وعن سلمة بن الأكوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنّ رَجُلاً أَكَلَ عِنْدَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشمالِهِ، فَقَالَ: كُلْ بيَمِينِكَ. قَالَ: لاَ أَسْتَطِيعُ! قَالَ: لاَ اسْتَطَعْتَ. مَا مَنَعَهُ إلاَّ الكِبْرُ. قَالَ: فما رفعها إلَى فِيهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھاؤ (تو حق بات کو قبول نہ کرتے ہوئے) اس نے کہا: میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا (حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے کھا سکتا تھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا، اور بات نہیں مانی) تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب نہیں کھا سکو گے (حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں) اس کے بعد کبھی وہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا ہی نہیں سکا (ہمیشہ کے لیے اس کا دایاں ہاتھ بیکار ہوگیا۔)

افادات:- بہت سی مرتبہ کسی آدمی کو بھلائی کے کام کے لیے یا کسی برائی سے بچنے کے لیے کہا جاتا ہے، تو اس بات کو رد کر دیتا ہے، حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ جو بات مجھے کہی جارہی ہے وہ بالکل درست ہے، لیکن کبر کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کرتا، تو پھر اس کو اسی طرح کی تکلیفیں بھگتنی پڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

پھر جنت کے قابل بنے گا

۶۱۴:-وعن حارثة بن وهبٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: ألا أُخْبِرُكُمْ بأَهْلِ النَّار: كلُّ عُتُلٍ جوّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ. (متفقٌ علَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: میں تمہیں جہنمیوں کے متعلق نہ بتاؤں (کہ کون لوگ جہنم میں جائیں گے؟) ہر بدمزاج، منھ پھٹ، غرور کرنے اور اترانے والا۔

افادات:- اگر مؤمن ہے تب بھی تکبر کے ہوتے ہوئے جنت میں نہیں جاسکتا۔ جہنم کی بھٹی میں ڈال کر تکبر سے پاک صاف کریں گے، پھر جنت میں جانے کے قابل بنے گا۔

جنت ودوزخ کا مناظرہ

۶۱۵:-وعن أَبي سعيدٍ الخدري رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: احْتَجّتِ الجَنّةُ وَالنَّارُ، فَقَالَت النَّارُ: فيَّ الجَبّارُونَ والمُتَكَبِّرُونَ. وقالتِ الجَنّةُ: فيَّ ضُعفاءُ الناسِ ومساكينُهُم، فقضى اللهُ بَينهُما: إنكِ الجنّةُ رَحْمَتِي، أرْحَمُ بِكِ مَنْ أشَاءُ، وَإنَّكِ النَّارُ عَذَابِي أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أشَاءُ، وَلِكِلَيْكُمَا عَلَيَّ مِلْؤُهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشادفرمایا: جنت اوردوذخ میں آپس میں دلیل بازی ہوئی (یعنی دونوں میں سے ہرایک نے اپنی فوقیت جتانے کے لیے دلیلیں پیش کیں، دونوں میں مناظرہ ہوا) جہنم کہنےلگی: میرے اندرتوبڑے بڑے سرکش اورتکبرکرنے والے ہیں (دنیامیں جو بڑے سمجھے جاتے تھے، جیسے: فرعون، ہامان، قارون وشداد) اورجنت کہنےلگی: میرے اندرتو کمزور مسکین قسم کےلوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان فیصلہ کیا (کہ لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے) جنت سے کہا: تو میری رحمت کا مظہرہے، مَیں جس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا چاہتاہوں، اس کوتیرے اندر بھیج دیتاہوں۔ اورجہنم سے کہا: تو میری سزادینے کاذریعہ ہے، تیرے ذریعہ مَیں جس کو چاہتاہوں سزادیتاہوں۔ اورتم میں سے ہرایک کے لیے میرے پاس بھراواہے (یعنی تمہاری ضرورت اورمانگ پوری کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ جنت کوبھی میں اس کے مناسب لوگوں سے بھروں گا۔ اورجہنم کوبھی میں اس کے مناسب لوگوں سے بھروں گا)

جوچھوٹوں کوبڑابنادے

افادات:- بظاہراشکال ہوتاہے کہ جہنم کے مقابلہ میں جنت نے کیادلیل پیش کی؟ وہ تویوں کہہ رہی ہے کہ میرے اندرکمزوراورمسکین لوگ ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: وہ یہ بتلاناچاہتی ہے کہ جودنیامیں کمزوراورناقابلِ توجہ سمجھے جاتے تھے، میرے اندرآنے کے بعدآج وہ بادشاہ بن گئےاوربڑے شمارہونے لگے۔ تو جو چھوٹوں کوبڑابنادے، اس کے کمال کاکیاکہنا۔ دراصل جنت کی بات میں بھی اس کے اندرجانے والےلوگوں کی صفات کااثرظاہرہوگیا، اصل میں جنت یہی کہناچاہتی ہے، لیکن اس چیزکووہ تواضع والےانداز میں بیان کررہی ہے۔ چوں کہ جنت متواضعین کی

جگہ تھی، اس لیے اس کلام کے پیش کرنے میں بھی تواضع کا اثر آ گیا۔ اور جہنم متکبرین کی جگہ ہے اس لیے اس کو اس نے اسی انداز میں پیش کیا۔

جنت اور جہنم کا بھراوا

جنتی اور جہنمی جب اپنی اپنی جگہ پہنچ جائیں گے تو باری تعالیٰ جہنم سے پوچھیں گے: "هَلِ امْتَلَأْتِ؟" کیا تو بھر گئی؟ تو وہ کہے گی: "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" اور کچھ ہے؟ اس کے اس مطالبے کو ختم کرنے کے لیے باری تعالیٰ (اپنی شایانِ شان) اپنا قدم اس میں رکھ دیں گے جس کی وجہ سے جہنم کی طغیانی ختم ہو جائے گی، اس کو بھرنے کے لیے کوئی الگ مخلوق پیدا نہیں کی جائے گی۔ اور جنت کے اندر جنتیوں کو بھیجنے کے بعد بھی بہت سی جگہ خالی رہ جائے گی، حالاں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو دنیا کا دس گنا عطا کیا جائے گا اور اعلیٰ کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوگا۔ غرض سب کو سب کچھ دے چکنے کے بعد بھی جنت میں بہت سی جگہ خالی رہ جائے گی تو اس کو بھرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے، اس کے ذریعہ سے جنت کے خالی حصوں کو بھریں گے تا کہ وہ آباد ہو جائے۔

نظرِ رحمت سے محروم

۶۱۶:-وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه أنّ رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم قال: لاَ يَنْظُرُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَراً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے جو اپنی لنگی اور پائجامہ (یعنی وہ کپڑا جو نیچے پہنا جاتا ہے) تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے تک لٹکائے۔

افادات:- کوئی بھی لباس جو تکبر کی وجہ ٹخنے ڈھانپ دیتا ہو، وہ اس میں

داخل ہے، چاہے وہ پائجامہ ہو، پتلون ہو، لنگی ہو یا عربی کرتہ؛ سب اس میں داخل ہیں۔ دیکھو! کتنی سخت وعید ہے کہ تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔

تین مبغوض ترین

۶۱۷:- وعنه، قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ثَلاَثَةٌ لاَ يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَلاَ يُزَكِّيهِمْ، وَلاَ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ. (رواہ مسلم) ((العَائِلُ)): الفَقِيرُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے گا، نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھے گا (بلکہ) ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ، اور تکبر کرنے والا فقیر۔ **(تشریح پہلے آچکی ہے)**

متکبر کو شدید دھمکی

۶۱۸:- وعنه قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: قَالَ الله -عز وجل-: العِزُّ إِزَارِي وَالْكِبْرِيَاءُ رِدائي، فَمَنْ يُنَازِعُنِي فِي وَاحِدٍ منهما فَقَدْ عَذَّبْتُهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: عزت میری ازار اور کبریائی میری چادر ہے، جو ان کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا، میں اس کو عذاب دوں گا۔

افادات:- بعض روایتوں میں "قَصَمْتُهُ" کا لفظ ہے، میں اس کی گردن

توڑ دوں گا۔ آدمی اپنے جسم کا نچلا حصہ جس لباس سے ڈھانکتا ہے اس کو عربی میں ''ازار'' کہتے ہیں، چاہے وہ پائجامہ ہو یا لنگی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آدمی بڑائی اختیار کرنا چاہے گا، مَیں اس کو سزا دوں گا اور دنیا ہی میں اس کو رسوا کر دوں گا۔

خود پسندی کی نقد سزا

۶۱۹:- وعنه: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي فِي حُلَّةٍ تُعْجِبُهُ نَفْسُهُ، مُرَجِّلٌ رَأْسَهُ، يَخْتَالُ فِي مِشْيَتِهِ، إِذْ خَسَفَ اللهُ بِهِ، فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِي الأَرْضِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

((مُرَجِّلٌ رَأْسَهُ)): أَيْ مُمَشِّطُهُ، ((يَتَجَلْجَلُ)) بالجيمين: أَيْ يَغُوصُ وَيَنْزِلُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ ایک آدمی ایک جوڑا پہنے جا رہا تھا، خود پسندی میں مبتلا تھا، بالوں میں کنگھی کیے ہوئے تھا، چال میں اکڑ پیدا ہوگئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا، اب وہ قیامت تک زمین میں اترتا رہے گا۔

متکبر لکھ دیا جاتا ہے

۶۲۰:- وعن سَلَمَةَ بنِ الأَكْوَعِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ حَتَّى يُكْتَبَ فِي الْجَبَّارِينَ، فَيُصِيبَهُ مَا أَصَابَهُمْ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن) ((يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ)) أَيْ: يَرْتَفِعُ وَيَتَكَبَّرُ.

ترجمہ:- حضرت سلمہ بن اُکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی برابر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جو بڑے بڑے متکبرین گزرے ہیں

ان میں اس کو بھی لکھ دیا جاتا ہے، اوران کو اللہ تعالیٰ کا جو عذاب پہنچا تھا، وہی عذاب اس کو بھی پہنچتا ہے۔

افادات:- حالاں کہ اس کے اندر اور کوئی برائی نہیں ہے، صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہے، بس اس کی وجہ سے ان کے ساتھ شمار کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تکبر اور خود پسندی سے محفوظ رکھے اور تمام رذائل سے ہمیں پاک وصاف فرمادے۔

بَابُ حُسْنِ الْخُلُقِ

اچھے اخلاق

یکم رجب المرجب ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۳۰/ستمبر ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

وَإِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ. وَالۡکَاظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ

صرف یہ اخلاق نہیں

نیا عنوان قائم کیا ہے: اچھے اخلاق کا بیان۔

اخلاق سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر ہمارے یہاں اس لفظ کو جب استعمال کرتے ہیں تو مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ کوئی آدمی بوقتِ ملاقات اگر خندہ پیشانی سے ہنس مکھ طریقہ سے، یا نرمی سے پیش آتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کے اخلاق بہت اونچے اور اچھے ہیں، لیکن شریعت کی اصطلاح میں صرف اتنی بات کو اخلاق نہیں کہتے، اگرچہ شریعت کی نگاہ میں یہ بھی ایک پسندیدہ طریقہ ہے، جو آدمی با اخلاق ہوگا اس میں یہ بات بھی پائی جائے گی، لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا لفظ جب قرآن اور حدیث میں بولا جاتا ہے، تو اس کا ایک مخصوص مفہوم و معنٰی مراد لیا جاتا ہے۔ دیکھو! اخلاق کی درستگی کی طرف شریعت نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا ہے، اگر اخلاق درست ہوں گے؛ تب ہی عبادات، معاملات اور معاشرت بھی ٹھیک ہوں گے۔ اگر اخلاق بگڑے ہوئے ہیں تو عبادات، معاملات اور معاشرت بھی ٹھیک نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن جاتے ہیں۔ اس لیے اخلاق کی درستگی کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا گیا ہے۔

جسم کی قدر رُوح سے ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، ایک اس کا جسم ہے، اور ایک روح ہے۔ ویسے بھی صرف جسم کا نام انسان نہیں ہے جب تک کہ اس میں روح موجود نہ ہو۔ بغیر روح کے خالی جسم کو کوئی بھی انسان سے تعبیر نہیں کرتا۔ اگر جسم کے اندر سے روح نکال لی جائے تو کوئی جسم اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا، حالاں کہ اس کا پورا جسم ویسا ہی موجود ہے جیسا روح نکلنے سے پہلے تھا۔ کان، ناک، زبان، ہونٹ، ہاتھ، پاؤں، جسم کے دوسرے سارے اعضاء اپنی حالت پر موجود ہیں، اس کے باوجود کوئی اس کو انسان سے تعبیر نہیں کرتا، بلکہ اب اس کو ''لاش'' کہا جاتا ہے، جو دراصل لاشئی ہے، یعنی کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس کو ''لاش'' سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ جب تک اس میں روح تھی لوگ اس کے ساتھ محبت واکرام کا معاملہ کرتے تھے، اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے تھے، اگر وہ کوئی بڑا آدمی تھا تو اس کی اطاعت کو اپنے لیے عزت سمجھتے تھے، اس کی چشم و ابرو کے منتظر رہتے تھے، لیکن جب اس کے جسم میں سے روح نکل جاتی ہے، تو اب اس کی اطاعت ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے، وہ ساری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جب تک وہ زندہ تھا اس میں مالک بننے کی صلاحیت تھی، چیزیں اس کی ملکیت میں آ سکتی تھیں، لیکن اب موت کی وجہ سے مالک بننے کی صلاحیت بھی ختم ہوگئی۔ جب تک وہ زندہ تھا، اپنی بیوی کا شوہر تھا، لیکن جب انتقال ہو گیا تو نکاح کا رشتہ بھی ختم ہو گیا، اگرچہ دوسرے رشتے ختم نہیں ہوتے، لیکن زندگی میں اس کے ساتھ جو تعلق رہتا ہے، موت کے بعد وہ باقی نہیں رہتا، کتنی ہی محبت و تعلق ہو، اس کی عزت واحترام دل میں ہو، لیکن روح نکل چکنے کے بعد اس کے جسم کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو گھر میں بھی رکھیں، بلکہ کوشش

یہ کی جاتی ہے کہ پہلی فرصت میں اس کو نہلا کر، کفن پہنا کر دفن کا انتظام کیا جائے۔ اولاد چاہے کتنی ہی محبت کرنے والی ہو، لیکن جب باپ کے جسم سے روح نکل جائے، پھر ان سے کوئی کہے کہ اس جسم کو گھر ہی میں رہنے دو، تو اولاد اس کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ جسم کی جو بھی قدر و قیمت ہے وہ روح کی وجہ سے ہے۔

روح سے متعلق بھی احکام

روح بھی انسان کا ایک جزو ہے، اس کے متعلق بھی کچھ خاص خاص ہدایتیں شریعت نے دی ہیں، جسم کے اوپر جیسے مختلف حالات طاری ہوتے ہیں، مثلاً جسم تندرست ہوتا ہے، بیمار بھی ہوتا ہے، توانا و طاقتور ہوتا ہے، کمزور و نحیف بھی ہوتا ہے خوبصورت اور بدصورت ہوتا ہے۔ اسی طریقہ سے روح صحت منداور بیمار ہوسکتی ہے، طاقتور اور نحیف ہوسکتی ہے، خوبصورت اور بدصورت ہوسکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو حالات جسم پر طاری ہوتے ہیں، وہی حالات روح پر بھی طاری ہوسکتے ہیں۔ اور روح کے متعلق بھی شریعت نے ہمیں خاص طور پر ہدایتیں دی ہیں، اور یہی آدمی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جسمانی اعمال میں فرائض

ظاہری اعمال کا تعلق آدمی کے اعضاء سے ہے۔ مثلاً: نماز میں قیام، رکوع سجدہ، قعدہ، قراءت وغیرہ ارکان ہیں، یا تسبیحات، ثناء، تشہد اور درود پڑھتے ہیں؛ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی اپنے اعضاء کے ذریعہ انجام دیتا ہے، اور یہ جسمانی عبادت ہے۔

روزہ بھی جسمانی عمل ہے، جو شریعت نے ہم پر فرض کیا ہے۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اس میں بھی آدمی کے بدن کا کچھ حصہ لگتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو ادا کرتا ہے۔ حج میں پہنچنے کے لیے مال کو کام میں لایا جاتا ہے، وہاں پہنچنے کے بعد جو

مناسک وافعال ادا کئے جاتے ہیں وہ بھی تمام جسم ہی کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں تو جسمانی اعمال میں بہت سارے اعمال فرض وواجب کا درجہ رکھتے ہیں، اور شریعت کی طرف سے ان کو فرائض کی حیثیت دی گئی ہے جن کو بجالانا ضروری ہے۔

اسی طرح جسمانی اعمال میں بعض ایسے ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، مثلاً: شراب پینا، چوری کرنا، زنا کرنا، اور بھی بہت سارے کام ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اگر کوئی آدمی وہ کام کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

روحانی اعمال میں فرائض ومحرمات

اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی کچھ اعمال ایسے ہیں جن کو انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اور وہ فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔ تواضع فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ شکر فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ صبر فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طریقہ سے اور بھی باطنی صفات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتی ہیں، جیسے: زہد، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے اوپر توکل واعتماد رکھنا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے رجاء اور امید قائم رکھنا، اللہ تعالیٰ کا خوف اور ڈر؛ یہ سب وہ روحانی صفات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتی ہیں، اور ان کا حاصل کرنا آدمی کے لیے ضروری ہے۔

اسی طریقہ سے روحانی کچھ صفات ایسی ہیں جو ذمیمہ اور بری کہلاتی ہیں، ان سے بچنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح زنا، چوری، شراب نوشی اور دیگر برے افعال سے بچنا ضروری ہے، جیسے یہ حرام کام ہیں، اسی طرح حسد حرام ہے، تکبر حرام ہے، کینہ وبغض رکھنا حرام ہے، دنیا کی محبت رکھنا حرام ہے، مال اور جاہ کی محبت حرام ہے، اسی طرح بقیہ صفاتِ ذمیمہ جتنے بھی ہیں ان تمام کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ سب ''اخلاق'' کہلاتے ہیں جن کا تعلق روح اور دل سے ہے، ظاہری جسم سے یہ کام انجام نہیں دیئے جاسکتے، بلکہ یہ سب اندرونی چیزیں ہیں۔ یعنی آدمی تواضع جسم سے

انجام نہیں دے سکتا۔ تواضع کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی صرف سر کو جھکا دے، یا اپنے سینے کو کسی کے سامنے موڑ دے، یا ہم جس کو خاطر تواضع سے تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی مہمان آیا ہو، تو اس کی خدمت کرلی جائے؛ یہ تواضع نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ پہلے بتلا دیا تھا کہ آدمی اپنے آپ کو کم درجہ اور کمتر سمجھے؛ اس کا نام تواضع ہے، اور اس کا تعلق دل سے ہے، ظاہری اعضاء سے نہیں ہے۔

اسی طریقہ سے شکر ہے، تو دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے صبر، زہد و توکل ہے، امید رکھنا، اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا؛ یہ ساری چیزیں آدمی کے ظاہری جسم سے تعلق نہیں رکھتی ہیں، بلکہ ان سب کا تعلق دل سے ہے۔ اسی طرح اخلاص بھی دل اور روح سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، اعضاء سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو آدمی کے جتنے بھی ظاہری اعمال ہیں، ان کے اندر بھی اخلاص کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ نماز، روزہ وغیرہ بڑی بڑی عبادتوں میں بھی اگر اخلاص نہیں ہے تو اس صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہ سب قبول تو کیا ہوتیں، ان پر ثواب تو کیا ملتا؛ اُلٹا ان کی وجہ سے سزا ہوگی اور جہنم میں بھیجا جائے گا۔

لینے کے دینے

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے تین آدمیوں کو بلایا جائے گا، ایک شہید، دوسرا قاری اور تیسرا وہ آدمی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا تھا۔ اور ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں یہ نعمتیں دی تھیں، ان میں تم نے کیا کیا؟ ہر ایک اپنا عمل بتلائیں گے۔ مالدار کہے گا: نیکی کا کوئی کام اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں مَیں نے خرچ نہ کیا ہو۔ اس سے کہا جائے گا: ٹھیک ہے، لیکن تمہاری نیت یہ تھی کہ لوگ سخی کہیں، دل کے اندر

شہرت کی نیت تھی، تم چاہتے تھے کہ تمہاری شہرت اور نیک نامی ہو۔

شہید سے کہا جائے گا: ہم نے تمہیں جسمانی صحت وقوت دی تھی، شجاعت و بہادری دی تھی، اس کو تم نے کہاں استعمال کیا؟ وہ کہے گا: باری تعالیٰ! تیرے راستہ میں تیرے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑتا رہا، یہاں تک کہ جان تک قربان کردی۔ اس سے بھی یہی کہا جائے گا: یہ سب تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ تیری تعریف کریں کہ بڑا بہادر تھا۔

قاری اور عالم سے پوچھا جائے گا: ہم نے علم جیسی نعمت دی تھی، اس میں کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے علم پھیلایا، پڑھا اور پڑھایا۔ اس سے بھی کہا جائے گا کہ یہ سب اس لیے کیا تھا، تاکہ لوگ بڑا عالم کہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اخلاص نہیں تھا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ سب سے پہلے انہیں کو جہنم کے اندر بھیجا جائے گا۔

تو دیکھو! اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوئے، بلکہ ان کے اوپر سزا کا فیصلہ ہوا۔

حاصلِ کلام

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ تمام باطنی اعمال روح وقلب سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو ''اخلاق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جب تک یہ درست نہ ہوں گے، وہاں تک ظاہری اعمال کے اندر بھی جان نہیں آئے گی۔ ظاہری اعمال کی قبولیت اور ان کا درست ہونا، ان کے اندر اثر کا پیدا ہونا؛ یہ ساری چیزیں باطنی اخلاق پر موقوف ہیں، اگر وہ اچھے ہوں گے تو ظاہری اعمال بھی اچھے ہوں گے، اور اگر وہ بگڑ گئے تو ظاہری اعمال بھی بگڑ جائیں گے۔ اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

خُلقِ عظیم

ایک آیت پیش کی ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو باری تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ کو عظیم اخلاق پر پیدا کیا گیا ہے، یعنی کسی انسان میں اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق جتنے بھی ہو سکتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اعلیٰ اخلاق سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے، اور آپ کی ذات کو دنیا والوں کے لیے نمونہ بنایا ہے۔

غصہ پینا، معاف کرنا

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ غصہ کو پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ عفو و درگزر یعنی کسی کو معاف کر دینے کا جذبہ ہونا اور غصہ کو پی جانا؛ یہ دل کے اندر ہوتا ہے۔ غصہ دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، لیکن اس کے ظاہری آثار ہوتے ہیں کہ آدمی کو جب غصہ آئے گا تو اس کا چہرہ سرخ ہو جائے گا، رگیں پھول جائیں گی، بکواس کرنا شروع کر دے گا، کبھی ہاتھ بھی اٹھا دے گا، آگ بگولہ ہو جائے گا؛ یہ سب اس کے آثار اور نشانیاں ہیں۔ اصل چیز تو دل کے اندر ہے یعنی غصہ۔ اور غصہ کو بڑی بری چیز قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر گیا کہ ایک آدمی نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا: "لَا تَغْضَبْ"، غصہ مت کرنا۔ دوبارہ پوچھا تو بھی یہی تاکید فرمائی۔ تیسری مرتبہ پوچھا تو پھر یہی تاکید فرمائی۔ (بخاری شریف: ۶۱۱۶، باب الْحَذَرِ مِنَ الْغَضَبِ)

ازالہ نہیں، امالہ

غصہ ان چیزوں میں سے ہے جن کا تعلق انسان کے باطن سے ہے، اور کوئی آدمی اگر غصہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ جن اوصاف کو اللہ تعالیٰ نے آدمی

کے اندر فطرتاً پیدا کیے ہیں ان کے بارے میں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ ان کا امالہ کر دیا جائے یعنی ان کو صحیح رخ پر موڑ دیا جائے، ان کا ازالہ مقصود نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کی طبیعت میں غصہ نہیں ہوگا تو کافروں کے ساتھ مقابلہ کیسے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاد کا حکم دیا ہے، وہاں بات کیسے بنے گی؟ برائی کے کاموں سے روکنے کے لیے بھی غصہ کی ضرورت رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ صفت آدمی کے اندر ہونی چاہیے، البتہ اس کا رخ صحیح کر دیا جائے، اپنی ذات کے لیے اس کو استعمال کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی آدمی بدسلوکی کرتا تھا تو حضور ﷺ کبھی بدلہ اور انتقام نہیں لیتے تھے، لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جا رہا ہوتا تو حضورِ اکرم ﷺ کو ایسا غصہ آتا تھا کہ کوئی بھی سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ غصہ کا بھی صحیح مصرف ہے۔

اسی طرح آدمی کے اندر خرچ کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے، اب وہ آدمی اگر اس جذبہ کو فضول خرچی میں استعمال کرے گا، تو گنہگار ہوگا۔ اس لیے خرچ کرنے والی اس صفت کو اگر وہ آدمی نیکی کے کاموں میں استعمال کرلے تو کارآمد ہے۔

یا خرچ نہ کرنا جس کو بخل کہا جاتا ہے وہ بھی طبیعت کے اندر کا ایک جذبہ ہے جو انسان کو خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ اگر انسان اسی جذبہ کو اس طرح استعمال کرے کہ گناہ کے کاموں میں خرچ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے رکھے، تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہاں! نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے روکے گا؛ تو یہ بری چیز ہے۔

اسی طرح آدمی کے دل میں ایک چیز شہوت رکھی گئی ہے۔ اگر شہوت ہی نہ ہو تو بیوی کا حق کیسے ادا کرے گا؟ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کے اندر ہونا چاہیے، لیکن اگر اس کو غلط جگہ استعمال کرتا ہے تو گناہ میں مبتلا ہوگا، اس لیے اس کے رخ کو صحیح طرف پھیر

دیا جائے؛ اسی کو امالہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اچھی چیزیں ہیں ان کو اچھے مصارف میں استعمال کرے۔ اور جو بری چیزیں ہیں ان کا رخ بھی اچھے مصارف کی طرف موڑ دے، اور آدمی صحیح طریقہ سے ان کو استعمال کرنا سیکھ جائے۔ امالہ کا مطلب ہی یہ ہے: رخ کو صحیح کر دینا، اور اس صلاحیت کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا، غلط جگہ استعمال کرنے سے بچا لینا۔ کسی بھی صفت کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ مقصود ہے۔

نفس پر قابو پانے کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی کوئی بات کہی، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آ گیا، اس کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا تو اس نے لیٹے ہی لیٹے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرہ پر تھوک دیا، تو وہ فوراً اس کے سینے سے اتر گئے۔ کسی نے کہا: اس نے جب آپ پر تھوک دیا تو یہ تو اس سے انتقام لینے کا اور زیادہ موقع تھا، آپ نے اس کو چھوڑ کیوں دیا؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: پہلے جب اس کو میں نے پچھاڑا تھا وہ اس لیے کہ اس نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی بات کہی تھی، لیکن جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرا نفس طیش میں آ گیا، اب اگر میں اس کے ساتھ کچھ کرتا تو گویا میں اپنی ذات کے لیے انتقام لیتا، اور شریعت اس بات کی تعلیم نہیں دیتی، شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ تمہاری ذات کا معاملہ ہو تو درگزر کر دو۔

اچھے اخلاق کی تکمیل

۶۲۱:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: كَانَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أحسنَ النّاس خُلُقاً۔

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اخلاق کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے بہتر تھے۔

افادات:- بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو دنیا کو اخلاق سکھانے ہی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: "بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ" میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں۔ اچھے اخلاق کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ ہوسکتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت کے سامنے پیش کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اوصاف واخلاق

۶۲۲:- وعنه، قَالَ: مَا مَسِسْتُ دِيبَاجاً وَلاَ حَرِيراً أَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رسولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، وَلاَ شَمَمْتُ رَائِحَةً قَطُّ أَطْيَبَ مِنْ رَائِحَةِ رسولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم. وَلَقَدْ خدمتُ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عَشْرَ سنين، فما قَالَ لی قَطُّ: أُفٍّ، وَلاَ قَالَ لِشَيءٍ فَعَلْتُهُ: لِمَ فَعَلْتَه؟ وَلاَ لشَيءٍ لَمْ أفعله: ألاَ فَعَلْتَ كَذا؟ (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی طرح کا ریشم، نہ موٹا، نہ مطلق ریشم؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہتھیلی سے زیادہ نرم نہیں چھویا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خوشبو سے زیادہ اچھی خوشبو میں نے کبھی نہیں سونگھی۔ اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دس سال تک خدمت کی، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے اُف نہیں فرمایا۔ اور نہ کرنے جیسا کوئی کام کیا ہو تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا۔ اور جو کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور نہیں کیا، تو اس پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں نہیں کیا۔

افادات:- آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہتھیلی ریشم سے بھی زیادہ نرم وگداز تھی۔ ویسے آپ کا جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا، اس کے باوجود اس میں نرمی تھی، چھونے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریشم سے زیادہ نرم ہے۔

مجسم خوشبو

قدرتی طور پر آپ ﷺ کے جسمِ مبارک میں سے خوشبو مہکتی تھی۔ حضورِ اکرم ﷺ خوشبو کا استعمال بھی کثرت سے فرماتے تھے، لیکن قدرتی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے پسینے کے اندر خوشبو رکھی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ دوپہر کے وقت حضور ﷺ میرے یہاں ایک چمڑے پر لیٹے ہوئے تھے، آپ کا پسینہ نکلا، مَیں اس کو ایک بوتل میں جمع کرنے لگی، حضورِ اکرم ﷺ کی آنکھ مبارک کھلی تو مجھ سے پوچھا: یہ کیا کر رہی ہو؟ مَیں نے عرض کیا: آپ کا پسینہ جمع کر رہی ہوں، اس سے زیادہ اچھی خوشبو اور کوئی نہیں ہے، اور اس کو ہم اپنی خوشبوؤں میں ملاتے ہیں۔ آدمی کے پاس کم درجہ کی خوشبو ہو، پھر اعلیٰ درجہ کی کوئی خوشبو مل جائے تو وہ اس کو اپنی خوشبو کے اندر ملا لیتا ہے، اور اس طرح اپنی کم درجہ کی خوشبو کو بھی اعلیٰ درجہ کی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کے جسمِ اطہر میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قدرتی طور پر خوشبو پیدا فرمائی تھی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آپ ﷺ جب کسی گلی سے گزر جاتے، تو بعد میں وہاں سے گزرنے والا اس خوشبو سے جان لیتا تھا کہ حضور پاک ﷺ یہاں سے گزرے ہیں۔ کسی بچے کے سر پر اگر آپ ہاتھ پھیر دیتے، تو دن بھر اس کے سر سے خوشبو آتی تھی۔ کسی سے مصافحہ کر لیتے تھے تو اس کے ہاتھوں سے خوشبو آتی رہتی تھی۔ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر میں اللہ تعالیٰ نے ایسی عمدہ خوشبو رکھی تھی۔

خادمِ خاص کا تجربہ

حضورِ اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے - جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے ہیں - کہا کہ کوئی

چھوٹا بچہ ہوتو اس کو ہمارے حوالہ کردو کہ ہمارے گھر کے کام کاج میں مدد کرے اور خدمت کر دیا کرے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میری عمر دس سال تھی، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے اپنے پیچھے اونٹ پر سوار کر کے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپ کے حوالہ کیا کہ یہ ہمارا بچہ ہے، آپ اس کو اپنی خدمت کے لیے قبول فرمالیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبول فرمالیا۔

بچوں کی عادت تو سب جانتے ہی ہیں کہ ان کا جو کام ہوتا ہے وہ ازخود تو کرتے نہیں ہیں، بڑوں کو دیکھ بھال اور نگرانی کر کے کام کروانا پڑتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے، خود حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میری والدہ، نانی اور خالہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے یہاں خدمت کے لیے جانے کی مجھ سے پابندی کرواتی تھیں اور یاد دلا کر مجھے بھیجتی تھیں، جیسے گھر والے بچوں کو مدرسہ اور اسکول بھیجتے ہیں۔ گویا ان کی والدہ، نانی، خالہ وغیرہ تاکید کے ساتھ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے یہاں بھیجتی تھیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دس سال کی عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں لگے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات تک (یعنی دس سال) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت کی۔ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر بیس سال تھی، اور ظاہر ہے کہ دس سال کا بچہ خدمت کرنے میں کوتاہی تو ضرور کرے گا۔ جب بڑی عمر والے کوتاہی کرتے ہیں تو پھر چھوٹوں سے کیوں نہیں ہوگی۔ لیکن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ان دس سالوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی مجھے اُف نہیں فرمایا۔ نہ کرنے کا کام کیا ہو؛ تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ''یہ کام کیوں کیا''۔ اور جو کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور نہیں کیا؛ تو اس پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''ایسا کیوں نہیں کیا''۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس میں دراصل حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کے اخلاق کو بتلانا

مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس عمر میں آپ کی خدمت کر رہے تھے، اس میں یہ بات قرینِ قیاس، بلکہ ضروری ہے کہ ان سے کوتاہی ہوئی ہی ہوگی۔ بلکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ کبھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کسی کام کے لیے بھیجتے تھے، تو مَیں راستہ میں کھیل یا کوئی چیز دیکھنے کے لیے کھڑا ہو جاتا اور دیکھنے میں مشغول ہو جاتا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے سے آ کر میرا کان پکڑ کر فرماتے کہ تم کو تو وہاں بھیجا تھا، یہاں کیوں کھڑے ہو؟ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کبھی بچپن کی وجہ سے میں یوں کہہ دیتا: میں وہاں نہیں جاؤں گا، حالاں کہ دل میں ہوتا کہ جاؤں گا، تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ نہیں فرماتے تھے۔ یہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق تھے، حالاں کہ عام طور پر اپنے خادم کے ساتھ مخدوم کا جو معاملہ ہوتا ہے وہ سب جانتے ہیں۔

اخلاق کی بلندی

۶۲۳:- وعن الصعب بن جَثَّامَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: أهديتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حِمَاراً وَحْشِيّاً، فَرَدَّهُ عَلَيَّ، فَلَمَّا رأى مَا في وجهي، قَالَ: إنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إلَّا لأنَّا حُرُمٌ.

ترجمہ:- حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نے ایک جنگلی گدھا (زندہ شکار کر کے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول نہیں فرمایا (حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے میرے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہوئے) جب میرے چہرے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا اثر دیکھا تو فرمایا: ہم حالتِ احرام میں ہیں، اس لیے ہم نے اس کو واپس کیا ہے (اور کوئی وجہ نہیں ہے)

افادات:- پالتو گدھا کھانا تو حرام ہے، لیکن جنگلی گدھا کھانا حلال ہے، اور چوں کہ جو آدمی حالتِ احرام میں ہوتا ہے وہ نہ تو شکار کر سکتا ہے اور نہ شکار کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اور کسی بڑے آدمی کے پاس بڑی محبت کے ساتھ کوئی ہدیہ لے کر

جائیں اور وہاں قبول نہ ہو، تو دل پر اثر ہوتا ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ہدیہ کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت پر کچھ ناگواری محسوس کی تو بطورِ معذرت کے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہم حالتِ احرام میں ہیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بلندی کی بات ہے۔ جو آدمی بااخلاق ہوتا ہے اس کو سامنے والے کی ذرا سی بات کا بھی فوری طور پر احساس ہوتا ہے، اور اگر اپنی طرف سے اس کو کوئی ایسی بات پیش آئی ہو تو پھر وہ اپنے اخلاق کے ذریعہ سے اس کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

نیکی اور گناہ کیا ہے؟

۶۲۴:- وعن النَّوَاس بنِ سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سألتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن البِرِّ وَالإِثم، فَقَالَ: البِرُّ: حُسنُ الخُلقِ. والإِثمُ: مَا حاكَ في صدرِكَ، وكَرِهتَ أن يَطَّلِعَ عَلَيهِ النَّاسُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق ہیں۔ اور گناہ جو تمہارے دل میں کھٹکے، اور تم یہ ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو۔

افادات:- جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اچھے اخلاق کا تعلق آدمی کے دل سے ہے، جب کسی کے دل میں اچھی صفات ہوں گی تو اس کے اعمال میں بھی ان کا ظہور ہوگا۔ گویا اچھے اخلاق ہی نیکی کی جڑ ہیں، اسی لیے اخلاقِ فاضلہ اعمالِ صالحہ سے بھی مقدم ہیں، جب تک اخلاق صحیح نہیں ہوں گے تب تک اعمال میں صلاح اور درستگی نہیں آسکتی۔ اگر ان کے بغیر ظاہری طور پر اچھے اعمال کرتا بھی ہے، اور دیکھنے والوں کو اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں؛ تب بھی اخلاق کے نادرست ہونے کی وجہ سے وہ سارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل نہیں کرتے۔

اور دوسری بات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو تمہارے دل کے اندر کھٹکے، اور جس کام کے متعلق تم یہ ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو؛ وہ گناہ ہے۔ گویا تمہارے دل کے اندر کسی کام کے چھپانے کا خیال پیدا ہونا، اور دل کی کھٹک اس کے گناہ ہونے کی علامت ہے۔

بہترین لوگ

۶۲۵:- عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ: لَمْ یکن رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَاحِشاً وَلاَ مُتَفَحِّشاً، وکان یَقُولُ: إنَّ مِنْ خِیَارِکُمْ أحْسَنَکُمْ أخْلاَقاً.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو فحش گو تھے، اور نہ بہ تکلف فحش گوئی کرنے والے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں۔

افادات:- "فَاحِش" یعنی طبعی وفطری طور پر آدمی کا مزاج ہی فحش باتیں بولنے کا ہو۔ اور "مُتَفَحِّش" یعنی فطری طور پر تو اس کے مزاج اور طبیعت میں فحش گوئی نہیں ہے، لیکن کبھی دوستوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی کوئی بات زبان سے نکال دیتا ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو طبعی طور پر فحش گو تھے اور نہ کبھی بہ تکلف فحش گوئی کرتے تھے۔

اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں

۶۲۶:- وعن أَبی الدرداءِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: مَا مِنْ شَیْءٍ أثْقَلُ فی مِیزَانِ العبدِ المُؤْمِنِ یَوْمَ القِیَامَةِ مِنْ حُسْنِ الخُلُقِ، وَإنَّ اللہ یُبْغِضُ الفَاحِشَ البَذِیَّ. ((البَذِیُّ)): هُوَ الَّذِی یتکلَّمُ بِالفُحْشِ وردیء الکلامِ.

ترجمہ:- حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز آدمی کے ترازو میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ فحش گوئی کرنے والے بدزبان آدمی کو پسند نہیں کرتا۔

افادات:- جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اعمال میں بھی وزن اور قبولیت اخلاق ہی سے آتی ہے، اور اخلاق میں سے ایک صفت اخلاص بھی ہے کہ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتا۔ تو اچھے اخلاق آدمی کے ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز ثابت ہوں گے۔

دو جنتی عمل

۶۲۷:- وعن أَبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سُئِلَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَنْ أَكثرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: تَقْوَى اللهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ. وَسُئِلَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ؟ فَقَالَ: الفَمُ وَالفَرْجُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: وہ کونسی چیز ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں لے جائے گی؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: گناہوں سے بچنا اور اچھے اخلاق۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: لوگوں کو سب سے زیادہ جہنم میں لے جانے والی چیز کونسی ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: منھ اور شرمگاہ۔

افادات:- تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا ڈر- جس کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائے- اور اچھے اخلاق؛ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو کثرت سے آدمی کو جنت میں لے جائے گی۔

منھ میں زبان کی بے احتیاطیاں بھی آجاتی ہیں، کھانے پینے کے معاملہ میں جو

بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، وہ بھی اس میں آجاتی ہیں۔ دوسری چیز شرمگاہ؛ ان دو اعضاء کی بے احتیاطی کی وجہ سے عموماً آدمی جہنم میں جاتا ہے۔ اسی لیے بخاری شریف کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "مَن یَّضمَن لِی مَا بَینَ لَحیَیہِ وَمَا بَینَ رِجلَیہِ أَضمَن لَهُ الجَنَّة" جو آدمی مجھے اپنے اس عضو کی جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور جو دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہے (یعنی شرمگاہ) کی گارنٹی دے (کہ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کرے گا) تو میں ایسے آدمی کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں (بخاری شریف، باب حفظ اللسان: ۶۴۷۴) حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ لوگوں کو کثرت سے جہنم میں لے جانے کا ذریعہ زبان ہی کی کاٹی ہوئی کھیتیاں بنیں گی۔ (ترمذی) منھ سے مراد زبان بھی ہوسکتی ہے، اور دوسری بے احتیاطیاں بھی اس میں آجاتی ہیں۔

کامل ایمان والے

۶۲۸:- وعنه قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أكمَلُ المُؤمنينَ إيمَاناً أحسَنُهُم خُلُقاً، وَخِيَارُكُم خِيَارُكُم لِنِسَائِهِم. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان والوں میں مکمل ایمان والے لوگ وہ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہوں، اور تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہیں۔

افادات:- آدمی کے اخلاق کا سب سے بڑا ظہور بیویوں کے معاملہ میں ہوتا ہے، اس لیے کہ ان سے چوبیس گھنٹے واسطہ پڑتا ہے، اور جس سے زیادہ واسطہ پڑتا ہو، اسی کے سامنے آدمی کی خوبیاں اور برائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ جن سے واسطہ کم پڑتا ہے، ان کے سامنے یہ چیزیں اتنی زیادہ نہیں آتیں، اسی لیے جو لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے زیادہ اچھے ہیں وہ لوگوں میں بھی سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ اگر آدمی

کے اخلاق کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہو، لیکن اس کے گھر والوں کو شکایت ہو؛ تو ایسے اخلاق کس کام کے؟ جیسے: کسی آدمی کی سخاوت کی دنیا میں دھوم مچی ہو اور اس کے گھر والے بھوکے مرتے ہوں، تو لوگ کیا کہیں گے کہ ساری دنیا اس کے دسترخوان پر کھاتی ہے تو کیا ہوا، خود اس کے گھر والے تو محروم ہیں۔ اسی طرح اگر تمہارے اخلاق سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، آپ کی تعریف کر رہے ہیں، لیکن تمہارے گھر والوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچتا؛ تو پھر بات کیسے بنے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ تم میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھے وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھائی سے پیش آتے ہیں۔ اور بیوی کی طرف سے ناگوار باتیں کثرت سے پیش آتی رہتی ہیں، اس لیے جو آدمی اخلاق کے اعتبار سے زیادہ کامل ہوگا، وہی اس محاذ پر فاتح بن سکے گا۔

اچھے اخلاق والوں کا مقام

۶۲۹:- **وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: سَمِعْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: إنَّ المُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ القَائِمِ.** (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ایمان والا اپنے اچھے اخلاق کے ذریعہ؛ ہمیشہ روزہ رکھنے والے اور رات بھر قیام کرنے والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

افادات:- آدمی مسلسل روزے رکھ کر اور رات بھر قیام کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر وثواب حاصل کرتا ہے، وہی اجر وثواب، وہی مقام ومرتبہ اچھے اخلاق سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔

تین آدمی، تین گارنٹی

۶۳۰:- **وعن أَبي أُمَامَةَ الباهِلِيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَنَا**

زَعِيمٌ ببَيتٍ فى رَبَض الجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ المِرَاءَ، وَإِنْ كَانَ مُحِقّاً . وَببَيْتٍ فى وَسَطِ الجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الكَذِبَ، وَإِنْ كَانَ مَازِحاً . وَببَيْتٍ فى أعلَى الجَنَّةِ لِمَنْ حَسُنَ خُلُقُهُ. (حديث صحيح، رواه أبو داود بإسناد صحيح) ((الزَّعِيمُ)): الضَّامِنُ.

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے؛ مَیں اس کو جنت کے کنارے پر ایک مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اور جو شخص جھوٹ کو چھوڑ دے، چاہے مذاق ہی میں کیوں نہ ہو؛ مَیں اس کو جنت کے بیچ میں مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اور جس کے اخلاق اچھے ہوں؛ مَیں اس کے لیے جنت کے اونچے درجہ پر مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔

افادات:- جہاں بھی کوئی معاملہ ہوتا ہے، اس میں ایک آدمی حق پر ہوتا ہے۔ دوسرا ناحق اس سے جھگڑتا ہے۔ حق پر ہونے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ مقدمہ بازی کر کے بھی اپنا حق وصول کرے، اس کے باوجود وہ جھگڑا چھوڑ دے، اپنا حق جانے دے؛ ایسے آدمی کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت کے کنارے پر مکان دلانے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں میں محبوب اور قریب جگہ پانے والے

۶۳۱:- وعن جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ أنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إنَّ مِنْ أحَبِّكُمْ إلَيَّ، وَأقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِساً يَوْمَ القِيَامَةِ، أحَاسِنَكُم أخْلاَقاً . وَإنَّ أبْغَضَكُمْ إلَيَّ وَأبْعَدَكُمْ مِنِّي يَوْمَ القِيَامَةِ، الثَّرْثَارُونَ وَالمُتَشَدِّقُونَ وَالمُتَفَيْهِقُونَ. قالوا: يَارسول الله! قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُونَ وَالمُتَشَدِّقُونَ، فَمَا المُتَفَيْهِقُونَ؟ قَالَ: المُتَكَبِّرُونَ. (رواه الترمذي)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ اور میری نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ ہیں جو بہ تکلّف بہت زیادہ بولنے والے، لوگوں پر اپنی باتوں کے زور سے چڑھ بیٹھنے والے اور زیادتی کرنے والے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! "ثَرْثَارُوْن" اور "مُتَشَدِّقُوْن" کو تو ہم جانتے ہیں؛ لیکن "مُتَفَيْهِقُوْن" کون لوگ ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تکبر کرنے والے۔

افادات:- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں میں محبوب اور قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب جس کو جگہ ملے گی؛ وہ اچھے اخلاق والے ہیں اور تکبر کرنے والا اپنی باتوں میں بڑے بڑے الفاظ استعمال کر کے لوگوں پر اپنی دھونس جمانا اور رعب بٹھانا چاہتا ہے، ایسے لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہیں، اور قیامت کے روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ دور ہوں گے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے حسنِ خلق کی تفسیر یہ نقل کی گئی ہے: "طلاقة الوجه، وبذل المعروف، و كف الأذىٰ" مسکراتا ہوا چہرہ، اچھی چیز خرچ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا۔

باب الحلم والاناءۃ والرفق

حلم، وقار اور نرمی

﴿مجلس ۱﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حلم، وقار، نرمی

باب کا عنوان قائم کیا ہے: ''حلم'' یعنی بردباری وتحمل۔ اور ''اِناءۃ'' یعنی سنجیدگی ووقار۔ اور ''رِفْق'' یعنی نرمی۔

''حلم'' کا مطلب یہ ہے کہ خلافِ مزاج کوئی بات پیش آئے تو بجائے غصہ ہونے کے اس کو برداشت کر جانا، سامنے والے کے ساتھ غصہ والا معاملہ کرنے کے بجائے برداشت کر کے بھلائی والا معاملہ کرنا۔ خلافِ مزاج چیز برداشت کرنے کو عربی میں ''حلم'' اور اردو میں ''بردباری'' کہتے ہیں۔

''اِناءۃ'' کا مطلب ہے: کسی بھی کام کو اطمینان کے ساتھ انجام دینا، جلد بازی سے کام نہ لینا، جس کو گجراتی میں (Wi&rj) کہتے ہیں۔

اور ''رفق'' کا معنیٰ ''نرمی'' ہے۔

یہ تین اوصاف ہیں۔ عام طور پر آدمی جب غصہ میں آتا ہے تو ان تینوں کے خلاف باتیں وجود پذیر ہوتی ہیں، اس لیے اصل تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو غصہ سے بچائے۔ اس سلسلے میں آگے روایتیں بھی آئیں گی، پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کچھ ارشادات ذکر کئے ہیں۔

سب سے عمدہ گھونٹ

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔ جب آدمی کو غصہ آئے تو اس کے تقاضہ کو پورا کرنے کے بجائے اس کو

دبائے اور غصہ پی جائے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ سب سے عمدہ گھونٹ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، وہ غصہ کو پینا ہے۔ تو غصہ کو پینا، دبانا اور لوگوں سے درگزر کرنا؛ یہ بہت عمدہ اوصاف ہیں۔ اس لیے کہ غصہ آدمی کو انتقام اور بدلہ لینے پر آمادہ کرتا ہے، اور معاف کر دینا بلکہ معاف کر دینے کے بعد مزید اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا؛ یہ بہت ہی اونچی صفت ہے۔

جا! تجھے آزاد کیا

حضرت امام زین العابدین علی بن حسین بن علی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دسترخوان پر تشریف فرما تھے، غلام کھانے کی کوئی گرم گرم چیز لے کر آیا، اس کے ہاتھ سے وہ برتن چھوٹا اور وہ ان کے ایک بچے کے اوپر گرا، وہ جل گیا، انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے غلام کی طرف دیکھا، تو غلام نے فوراً پڑھا: ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ یہ سن کر انہوں نے نگاہیں جھکالیں۔ اس نے آگے پڑھا: ﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ انہوں نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اس نے آگے پڑھا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ انہوں نے فرمایا جا! مَیں نے تجھے آزاد کر دیا۔

یہ حضرات کیسے اونچے اوصاف کے حامل تھے! قرآن وحدیث کی تعلیمات کی اصل چیز جو ہم لوگوں کے سمجھنے اور اختیار کرنے کی ہے؛ وہ یہی ہے۔ حضراتِ صحابہ تابعین اور اسلاف کرام رحمہم اللہ کے سامنے ایسے مواقع پر جب کوئی نصیحت، یا قرآن وحدیث کے حوالہ سے کوئی بات پیش کی جاتی تو وہ اپنے نفس کے تقاضوں کو اسی وقت چھوڑ دیتے تھے اور فوراً اس پر عمل کرتے تھے، اپنی طبیعت ومزاج کے خلاف فوراً ان چیزوں کے اوپر عمل کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایسے بے شمار واقعات حضراتِ صحابہ

کرامؓ کی زندگی میں ملیں گے کہ کسی بات پر ناراض ہوکر۔ چاہے وہ ناراضگی حق بجانب ہی ہو۔ انہوں نے کوئی اقدام کیا، لیکن جب اس پر متنبہ کیا گیا تو وہ فوراً باز آ گئے۔

کوئی بااعتدال، کوئی بدحال

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پہلے بھی گزرا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو آپؓ کی صاحبزادی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لاڈلی زوجۂ مطہرہ تھیں، ان پر جب منافقین نے تہمت لگائی، اس پروپیگنڈے میں کچھ مخلص مؤمنین بھی پھنس کر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے، انہیں میں حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، جن کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ حضرت مسطحؓ غریب تھے، رشتہ دار تھے، مہاجری تھے، نیز غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ ان کا سارا خرچہ برداشت کرتے تھے۔

ان حضرات کی انصاف پسندی اور مزاج کا اعتدال دیکھئے! جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت والا معاملہ پیش آیا تو جن حضرات کا اس میں ابتلاء و آزمائش ہوئی تھی ان کے ساتھ انہوں نے کیا معاملہ کیا اور کب کیا؟ حصہ لینے والی بات تو پہلے ہو چکی تھی لیکن محض ان کے حصہ لینے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کوئی اقدام نہیں کیا اور کوئی ایکشن نہیں لیا، جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں حضرت صدیقہؓ کی براءت اور ان کا اس تہمت سے پاک ہونا نازل ہوا، اور بات صاف ہوگئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جو باتیں چلائی گئی تھیں وہ تہمت اور پروپیگنڈہ تھا، اب ان لوگوں کا مجرم ہونا بالکل واضح ہو گیا، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان پر ایکشن لیا۔

اس لیے کہ کوئی آدمی اگر کسی کے متعلق کوئی بات کہتا ہے تو اس میں دونوں پہلو

ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ اگر سچا ہو تو غلطی کی اصلاح ہونی چاہیے، لیکن جھوٹا ہونا ثابت ہو جانے کے بعد تو کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اور ہم لوگوں کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ سچا ہو تب بھی ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ پہلے ہی کر لیتے ہیں یعنی اس نے جو بات کہی ہے وہ سچی ہے تب بھی ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اپنی اصلاح نہیں کرتے، بلکہ اسی کے خلاف ایکشن لیتے ہیں۔ یہاں غور کیجئے کہ محض اس معاملہ کے پیش آنے پر حضرت ابوبکر صدیق نے کچھ نہیں کیا، بلکہ ان پر خرچ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا، جب قرآنِ پاک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کی آیتیں نازل ہوئیں اور بات صاف ہو چکی کہ جو لوگ اس میں حصہ لینے والے تھے، سب بہتان تراش تھے، ان کی طرف سے یہ غلط حرکت ہوئی ہے، تب حضرت ابوبکر صدیق نے قسم کھائی کہ میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔

اس موقع پر علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پر خرچ نہ کرنے کی جو قسم کھائی اس میں بظاہر دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی صاحبزادی تھیں، اور دوسری یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ تھیں، اور ان کے نہ خرچ کرنے کی قسم کھانے کی دراصل علت یہی تھی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ کے ساتھ انہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا۔ خیر! ان کا خرچہ بند کر دیا اور قسم کھالی کہ آئندہ ان پر خرچ نہیں کروں گا، اس پر قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ تم میں جو فضیلت اور وسعت والے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کو باطنی کمالات سے نواز رکھا ہے اور مالی وسعت بھی دے رکھی ہے) وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، غریبوں، اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے

والوں پر خرچ نہیں کریں گے۔ حضرت مسطح رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ تینوں باتیں تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رشتہ دار بھی تھے کہ خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، غریب اور محتاج بھی تھے، اللہ کے راستہ میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے تینوں اوصاف کو ذکر کیا گیا۔ گویا ان میں سے کوئی ایک بات بھی ہوتی تو کافی تھی، چہ جائیکہ یہ تینوں چیزیں ہیں ایسے لوگوں پر خرچ نہ کرنے کی قسم نہ کھائیں۔

دیکھو! قرآنِ پاک میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے ''أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ'' کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بلکہ آگے فرمایا: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا﴾ معاف کریں اور درگزر کریں ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟

سفارش بھی، تنبیہ بھی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی کیسا پیارا انداز اختیار فرمایا! حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تنبیہ بھی کی جارہی ہے اور حضرت مسطح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش بھی کی جارہی ہے۔ حضراتِ صحابہ کا مقام بھی دیکھئے کہ ان کی طرف سے کوئی فروگذاشت ہورہی ہے تو اللہ تعالیٰ بڑے پیارے انداز سے اصلاح فرمارہے ہیں۔ اِدھر ان سے بھی قصور ہوا تھا، وہ اپنے قصور پر نادم بھی تھے، ان پر حد بھی جاری ہوئی تھی اور معافی بھی ہوگئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سفارش کردی۔ جب کسی سے نادانی میں جرم ہوگیا، وہ معافی مانگ رہا ہے اور اس کو اس کے جرم کی سزا جو شریعت کی مقرر کی ہوئی ہے وہ بھی دی جاچکی

ہے، تو معاملہ ختم ہوگیا، اب اور کیا رہ جاتا ہے۔ ہم لوگوں کا معاملہ تو ایسا ہے کہ گویا زندگی بھر کے لیے ایسا کھونٹا لگا دیا کہ اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالاں کہ اسلام کی تعلیم دیکھئے کہ وہ دونوں طرف کیا سکھاتا ہے۔ ان سے قصور ہوا اور قصور بھی معمولی نہیں تھا، بلکہ بہت بڑا قصور تھا۔ نبی کریم ﷺ پر اس تہمت والے واقعہ کی وجہ سے ایک طویل زمانہ تک بڑا اثر رہا، آپ ﷺ کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی تھی، سارے مسلمان اس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا رہے، لیکن پھر بھی ان سے تو نادانستگی میں ہوا تھا جس کی سزا بھی مل گئی، اس پر نادم بھی ہوئے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً وحی اتری۔

اب معاملہ صاف کر لیجئے

گویا اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے اہلِ ایمان کی تربیت فرما رہے ہیں کہ ان کے اندر کیسے اوصاف ہونے چاہئیں؟ ایسی کوئی بات ہوجائے تو اہلِ ایمان کا مزاج کیا ہونا چاہیے؟ اس لیے کہ معاشرہ، سماج اور سوسائٹی میں کسی سے قصور اور کوتاہی ہوجاتی ہے اس کے بعد اگر وہ اپنے قصور و کوتاہی پر نادم بھی ہے اور شریعت کی طرف سے مقررہ سزا بھی دی جاچکی ہے، تو اب آئندہ کے لیے معاملہ صاف کر لیجئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ خود سفارش فرما رہے ہیں: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلاکر ان کے سامنے تلاوت فرمائی۔ آپ تلاوت فرما کر فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بَلٰى أُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لِي“ کیوں نہیں! مَیں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کردے۔ اسی وقت جو وظیفہ اور خرچہ بند کردیا تھا، وہ جاری کردیا اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی بند نہیں کروں گا اور اب تک جو باقی تھا وہ بھی دے دیا۔

ہمارا مزاج؟ خدا کی پناہ!

حضراتِ صحابہ کا مزاج قرآنی تعلیمات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے معاملہ میں یہی تھا۔ بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ جملہ ہے: ”کَانَ وَقَّافاً عِنْدَ کِتَابِ اللہ“ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن کی کوئی بات سامنے آجائے تو فوراً رُک جانے والے تھے۔ قرآن کے مقابلہ میں اپنے نفس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور ہم لوگوں نے اپنا مزاج اتنا زیادہ بگاڑ رکھا ہے کہ خدا کی پناہ! کوئی آدمی ہمارے سامنے قرآنِ کریم کی ایک آیت تو کیا، بیسیوں آیتیں پیش کردے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیکڑوں حدیثیں پڑھ دے، اور ہمارا دل کہہ رہا ہو کہ یہ سب صحیح کہہ رہے ہیں؛ پھر بھی ہم تاویلیں کریں گے کہ اس میں تو یوں ہے اور فلاں ہے۔ کہیں آپس میں صلح کے لیے کوئی بات کہنے کے بعد کہا جائے کہ اتنی ساری حدیثیں سنائی گئیں، اب تو معاف کر دیجیے، تب بھی کہتے ہیں: آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں، لیکن اس کو تو دیکھو! کیسا نالائق ہے، یہ تو معاف کرنے کے لائق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو معاف نہیں کیا جانا چاہیے، اگر ایسا ہوتا تو حدیث میں بتلا دیا جاتا، حالاں کہ ایسا کہیں نہیں آیا ہے۔ درحقیقت ہم لوگوں کا مزاج بگڑ گیا ہے۔

اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اللہ اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ کردیں، ان کے سامنے سرنڈر ہو جائیں ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً﴾ ”سِلْمٌ“ یعنی اپنے آپ کو حوالہ کر دینا، ہمارا کوئی ارادہ وخواہش نہیں، ہمارا کوئی تقاضہ نہیں، ہمارا جی مانے یا نہ مانے، ہمارے مزاج کے موافق ہو یا مخالف، ہم کو بظاہر اس سے کچھ فائدہ ہو یا نقصان؛ اُدھر سے جو فیصلہ ہو جائے اور جو کہا جائے، بس! ہم تو

اسی میں راضی ہیں۔ دراصل اسلام یہی چاہتا ہے کہ ہر چیز میں اپنے آپ کو پورے طور پر خدا اور رسول کے حوالے کر دیجئے۔ جیسا کٹھ پتلی کا حال ہوتا ہے، اور جیسے کسی کے پاس ایک مشین ہوتی ہے، جس طرح وہ چاہتا ہے اس کو چلاتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی کرنا ہے؛ تب ہی بات ہے۔ شریعت ہمارا مزاج اسی طرح کا بنانا چاہتی ہے۔

......اور کوڑا رکھ دیا

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ بناؤ۔ جو لوگ تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والے ہیں ان کو معاف کرنے کا آپ کا مزاج ہونا چاہیے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور بھلی بات کا حکم دیجئے ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ اور جو آپ کے ساتھ جہالت کا سلوک، نامناسب برتاؤ کرنے والے ہیں، آپ ان سے صرفِ نظر اور چشم پوشی کیجئے، یعنی انتقام نہ لیجئے۔

بخاری شریف میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لیے جو مجلسِ شوریٰ بنائی تھی (جن سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہم امور اور معاملات میں مشورہ لیتے تھے) وہ تمام کے تمام قراء، اہلِ علم اور قرآن کے علماء تھے۔ حر بن قیس رضی اللہ عنہ بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ان کے چچا عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی تھے، لیکن دیہات کے رہنے والے تھے، ان کے مزاج میں اکھڑ پن تھا۔ ایک مرتبہ وہ مدینہ منورہ آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ میرے بھتیجے کا امیر المؤمنین کے یہاں خاص مقام ہے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے حر بن قیس رضی اللہ عنہ سے کہا: امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا خاص مقام اور عزت ہے، میرے لیے بھی ان کے یہاں خصوصی اوقات میں حاضری کی اجازت لے لیجئے، ویسے تو وہاں ایسا کچھ

نہیں تھا، جو آدمی جب ملنا چاہتا مل سکتا تھا، لیکن کچھ خصوصی اوقات ہوتے تھے جن میں ہر ایک کو آنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا، صرف اہلِ مشورہ وہی وہاں موجود ہوتے تھے، اس لیے انہوں نے خاص اوقات میں اپنے لیے حاضری کی اجازت طلب کرنے کی درخواست کی۔ اور چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے، اس لیے چچا کی اس خواہش کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے حر بن قیسؓ نے امیر المؤمنین سے اجازت طلب کی کہ میرے چچا میرے گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ میں جب یہاں آؤں تو وہ بھی ساتھ آئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت دیدی (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں تو کوئی بھی غلط بات کرتا تو فوراً اس کو سزا دی جاتی تھی، اس میں دیر نہیں لگتی تھی۔ خیر!) جب وہ آئے تو مجلس میں بیٹھتے ہی عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بے تکی بات کردی۔ کہا: "هِيَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! فَوَاللهِ، مَا تُعْطِينَا الْجَزْلَ، وَلَا تَحْكُمُ بَيْنَنَا بِالْعَدْلِ" اے ابن الخطاب! آپ انصاف سے فیصلہ نہیں کرتے، اور برابر ہم کو بخشش اور عطیے بھی نہیں دیتے۔ (حالاں کہ ظاہر ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں تو سارا نظام مرتب تھا، ہر ایک کے وظائف مقرر تھے جو سب کو ملتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانہ میں حکومت کے سارے نظامات با قاعدہ مرتب کئے گئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے الفاروق میں اس کی پوری تفصیل ذکر کی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عدل وانصاف تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ فوراً کوڑے پر گیا۔ حر بن قیس نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چچا کی خبر لے ڈالیں گے اور سارا مزہ کِرکِرا ہوجائے گا۔ انہوں نے موقعہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً یہ آیت پڑھی: امیر المؤمنین! باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اپنے پاک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ بنائیے،

بھلی بات کا حکم کیجئے اور نادانوں سے چشم پوشی، اعراض وصرفِ نظر کیجئے "وَاِنَّ هٰذَا مِنَ الْجَاهِلِيْنَ"، اور یہ بھی ایسے ہی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزاج فوراً اعتدال پر آ گیا، اسی وقت کوڑے سے ہاتھ ہٹالیا۔ اسی موقعہ پر بخاری شریف میں یہ جملہ ہے: "وَكَانَ وَقَّافاً عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى"، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سامنے اپنے آپ کو روکنے والے تھے یعنی جہاں کوئی اس کی بات پیش ہوئی فوراً اس سے رک گئے۔

(بخاری شریف: ۴۶۴۲، باب [خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلين])

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شریعت ہم سے یہی مزاج چاہتی ہے، جیسے کبھی رشتہ داروں سے ناچاقی اور خلافِ مزاج بات پیش آجاتی ہے، لیکن شریعت ہمیں کہتی ہے کہ ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، تو بس ہمیں کرنا ہے، وہاں پھر تاویلات بھول جائیے، جب ہر چیز کی تفصیل شریعت میں موجود ہے، تو پھر ہم اس میں تاویلیں کرتے رہیں اور اس میں غلطی نکالتے رہیں کہ یوں ہے اور فلاں ہے؛ یہ تمام باتیں ہمارے نفس کی دھوکہ بازی ہے۔ شیطان آدمی کو اللہ ورسول کے ارشادات، ہدایات اور حکموں پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔

اگر یہ طریقہ اپنائیں......

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ﴾ نیکی اور برائی، اچھا اور برا سلوک دونوں برابر نہیں ہو سکتے ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ (سامنے والے کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آجائے تو آپ اس کا) جواب ایسے طریقہ سے دیجئے جو اچھا ہو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب اس آیت کو لے کر نازل ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اچھا سلوک کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ''صِلْ مَنْ قَطَعَكَ'' جو رشتہ دار آپ سے قطع رحمی کرے، رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرے، آپ اس کے حقوق ادا کیجئے۔ "وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ"، اور جو

آپ پر زیادتی کرے آپ اس کو معاف کیجئے۔ "وَأَحْسِنْ إِلَىٰ مَنْ أَسَآءَ إِلَيْكَ" اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے، آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے۔ بھلے طریقہ سے جو اب دینے کا مطلب یہی ہے۔ جب یہ طریقہ آپ اپنائیں گے تو وہ آپ کا پکا دوست بن جائے گا یعنی ہمیشہ کا ٹینشن ختم ہو جائے گا۔

لیک بعد از خرابیٔ بسیار

دراصل ٹینشن تو ہم لوگ خود بڑھاتے رہتے ہیں، کسی نے ہمارے ساتھ برا سلوک کیا، اس کے جواب میں ہم بھی ویسا ہی سلوک کرتے ہیں، تو اب کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جب یہ سلسلہ آگے بڑھے گا تو ٹینشن بھی بڑھتا ہی جائے گا۔ آخر کسی وقت تو اس کو ختم کرنا ہے، یا اس کو ہمیشہ چلاتے ہی رہنا ہے؟ تھوڑے زمانہ کے بعد پھر کہتے ہیں کہ چلو! اب صلح کر لیں:

آں چہ کند دانا کند ناداں ❁ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

عقلمند آدمی جو کام کرتا ہے، نادان آدمی بھی وہ کام کرتا ہے، لیکن بہت نقصان ہو جانے کے بعد۔ عقلمند وہی کام پہلی فرصت میں کر لیتا ہے۔ اتنے سارے کیس لڑے، اتنے سارے پیسے خرچ کیے، اتنی ساری لڑائیاں کیں، کاروبار کا نقصان کیا، ساری دنیا میں جگ ہنسائی اور بدنامی ہوئی، اس کے بعد صلح کی سوجھی۔ یہی کام پہلے روز کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا! اتنے نقصانات جو اٹھائے، اتنے سارے پیسے خرچ کیے، اگر اس کا پاؤ حصہ بھی اس کو دے دیا ہوتا، تو وہ آپ کا غلام بن جاتا۔

وہ سکتہ میں آگیا

ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا، آپ کو برا بھلا کہا اور

خوب گالیاں دیں، آپ سر جھکا کر سنتے رہے، جب وہ سب کہہ چکا تو حضرت ابن عباس ؓ نے عکرمہ سے کہا: اے عکرمہ! ان سے پوچھ لیجیے کہ ان کی کوئی حاجت ہے جو ہم پوری کر سکتے ہیں؟ یہ سن کر وہ آدمی بالکل خاموش ہو گیا اور سکتہ میں آ گیا۔ اس کے بجائے کچھ اور سلوک کیا جاتا تو کیا یہ ممکن تھا؟۔

ہمت کا کام

اس لیے شریعت کا بتلایا ہوا طریقہ ہی آسان ہے ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ اسی آیت میں آگے فرمایا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ دنیا میں یہ ہوگا کہ جو تمہارا دشمن ہے وہ پکا دوست بن جائے گا۔ اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لوگ دوست بنانے کے لیے معلوم نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ آپ اگر اتنا ہی کر لیں، اور تھوڑا تحمل سے کام لیں، تھوڑی بردباری اپنائیں، تو بہت آسانی کے ساتھ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آدمی کی آزمائش کا موقع یہی ہوتا ہے، اس وقت آدمی اپنے نفس کے اوپر کنٹرول کرے ضبط رکھے اور غصہ پیئے۔

آگے فرمایا ہے: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ اس کی توفیق نہیں ہوتی مگر انہی لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں ﴿وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ جس کو اس کی توفیق دے وہ بڑے نصیبے والا ہے۔ اس کی توفیق ہی سے یہ چیز ہو سکتی ہے؛ ورنہ اتنا آسان کام نہیں ہے، لیکن آدمی اگر کوشش کرے تو دھیرے دھیرے یہ چیز اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾ جو آدمی صبر سے کام لے اور معاف کر دے؛ تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

دو پسندیدہ خوبیاں

۶۳۲:-وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَشَجِّ عَبْدِ الْقَيْسِ إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ: الْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اَشَجِّ عبدالقیس سے فرمایا: تمہارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں (اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ وزیر اعظم یا صدرِ مملکت اس خوبی کو بہت پسند کرتے ہیں، تو ہم اپنے اندر اس خوبی کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ جس خوبی کو پسند کرتے ہیں ہمیں اپنے اندر وہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے) ایک تو بردباری اور دوسری اطمینان وسکون کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔

افادات:- عبدالقیس عرب کا ایک قبیلہ ہے جو بحرین کے علاقہ میں آباد تھا، ان کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بڑی شخصیت کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو دل میں بڑے جذبات اور بڑی تمنائیں ہوتی ہیں کہ جب جا کر ملیں گے تو پہلی فرصت میں ان سے نیاز حاصل کریں گے، یہاں بھی یہی ہوا کہ جب قافلہ والے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو نبی کریم ﷺ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے، آپ کو دیکھتے ہی قافلے والے اونٹوں سے اترے اور ان کو باندھے بغیر ہی بھاگے، اور ملاقات کے واسطے سیدھے حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے، ان میں ایک آدمی منذر نامی تھے جن کا لقب اَشَجّ تھا۔ انہوں نے سب کے اونٹوں کو باندھا اور چوں کہ سفر سے آئے ہوئے تھے اس لیے کپڑے بھی میلے ہو چکے تھے، تو اپنا سامان کھولا اور اس میں سے دھلے ہوئے کپڑے نکالے اور بدلے، پھر نبی کریم ﷺ

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ سارا منظر حضور اکرم ﷺ دیکھ رہے تھے۔ دوسرے لوگ تو پہلے سے خدمت میں پہنچ چکے تھے اور گویا انہوں نے اپنے زعم میں ان سے سبقت حاصل کرلی تھی، لیکن جب یہ اس طرح تیاری کرکے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور بہت خوش ہوئے اور ان سے فرمایا: تمہارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں؛ ایک تو بردباری اور دوسری اطمینان وسکون کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔ عام طور پر ایسے موقع پر طبیعت عجلت اور جلدی بازی کو چاہتی ہے، لیکن انہوں نے عجلت نہیں کی تو اس پر نبی کریم ﷺ نے ان کی تعریف فرمائی اور ان کی اس عادت کو پسند فرمایا۔

غصہ مت کرو

تو حلم اور بردباری بہت عمدہ صفت ہے، اس لیے کہ سب کام غصہ میں خراب ہوجاتے ہیں۔ غصہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس میں انتقام کے لیے آدمی کا خون کھولنے لگتا ہے، اور اس کا اثر پورے جسم پر نمایاں ہوتا ہے، یہاں تک کہ ظاہری اعضا پر بھی اثر پڑتا ہے، جیسے چہرہ سرخ ہوجاتا ہے، رگیں پھول جاتی ہیں، آنکھیں لال ہوجاتی ہیں اور زبان پر اثر یہ ہوتا ہے کہ اول فول بکنے لگتا ہے، گالیاں دیتا ہے، تہمت لگاتا ہے، اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا ہے۔ ہاتھ اور اعضاء پر اثر یہ پڑتا ہے کہ سامنے والے پر حملہ آور ہوتا ہے اور پٹائی یا قتل کرنے یا اس کے کپڑے پھاڑ دینے یا اس کو نوچنے کے درپے ہوجاتا ہے۔ اور اگر وہ ہاتھ میں نہیں آتا تو جو چیز ہاتھ میں آگئی اسی کو اٹھا کر پھینک دیتا ہے، اور توڑ ڈالتا ہے۔ گویا آدمی کی عقل ہی جاتی رہتی ہے، اور عقل اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی چیز دے رکھی ہے، وہ جب جاتی ہے تو یہ سب کارنامے انجام دیتا ہے۔ اسی آدمی کو بعد میں

جب بتایا جائے کہ آپ نے یہ سب کیا ہے، تو وہ خود پچھتاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی آدمی غصہ ہوا ہو، اور بعد میں پچھتایا نہ ہو، ہر غصہ ہونے والے کو بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سب سے خطرناک چیز غصہ ہے، اس پر کنٹرول کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے کہ غصہ مت کرو۔

قصور گاہک کا، سزا بیوی کو!

اور غصہ کی وجہ سے بعض ایسے نقصانات پہنچ جاتے ہیں کہ زندگی بھر آدمی پچھتاتا رہتا ہے۔ جیسے بہت سے لوگ طلاق دیتے ہیں۔ جھگڑا کسی کے ساتھ ہوا ہے اور اس کو بیوی پر اتارتے ہیں۔ طلاق دینے کے بعد آکر کہتے ہیں کہ مفتی صاحب! میرا طلاق دینے کا ارادہ نہیں تھا، بس! غصہ میں دے دی۔ جب میرے پاس ایسے طلاق والے آتے ہیں تو مجھے ان کے اوپر بہت تعجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب ان سے پوچھتے ہیں کہ ہوا کیا تھا؟ تو کہتے ہیں کہ بیوی کے بھائی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، بیوی کے ابا کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، بلکہ بعض مرتبہ تو جس سے لڑائی ہوئی وہ بیوی کا رشتہ دار بھی نہیں ہوتا۔ یا کسی گاہک پر غصہ آ گیا تھا، اسی غصہ میں میاں صاحب گھر پہنچے اور بیوی کو طلاق دے ڈالی۔ عجیب وغریب معاملہ ہے! تو میں عرض کر رہا تھا کہ غصہ آدمی کی عقل ختم کر دیتا ہے۔

جب وہ غصہ میں ہوتا ہے

شیطان سے کسی نے پوچھا کہ تم کو انسان کے اوپر سب سے زیادہ قابو کون سے وقت ملتا ہے؟ اس نے کہا: جب وہ غصہ میں ہوتا ہے اس وقت مجھے اس پر پورا کنٹرول ہو جاتا ہے، اس وقت اس کی پوری لگام میرے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور میں جو چاہتا ہوں؛ کرواتا ہوں۔ اس لیے شیطان چاہتا ہی ہے، اس کی خواہش یہی ہوتی ہے

کہ آدمی غصہ میں آجائے۔

مناظرہ میں کامیابی کا گُر

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: مناظرہ اور علمی بحثوں میں کامیاب ہونے کا سب سے بڑا گُر یہی ہے کہ آپ کوئی ایسا کام کر دیجئے کہ جس سے سامنے والے کو غصہ آجائے۔ بس! ایک مرتبہ وہ غصہ میں آگیا تو اس کا سارا علم، سارے دلائل، اور اس کا سارا حافظہ غائب ہو جائے گا، پھر آپ جس طرح چاہیں اس پر قابو حاصل کر لیجئے۔ مناظرہ میں کامیابی کا یہ بہت ہی آسان نسخہ ہے۔

خوبیاں وہبی یا کسبی؟

پھر حضرت منذر ائشجِّ عبد القیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ دو چیزیں میں نے حاصل کی ہیں، یا اللہ تعالیٰ نے مجھے ان خصلتوں پر پیدا کیا ہے؟ (یعنی یہ خوبیاں قدرتی ہیں یا میں نے محنت، ریاضت اور مجاہدہ کر کے حاصل کی ہیں؟ کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو آدمی محنت، ریاضت اور مجاہدہ کر کے حاصل کرتا ہے اور کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ فطری طور پر آدمی کے اندر ودیعت فرماتے ہیں) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم کو اسی پر پیدا کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسی دو خصلتوں پر پیدا کیا، جن کو وہ پسند کرتا ہے

دونوں راہیں بتلا دیں

یہ بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے قلب میں ہر طرح کی صفات کی جڑیں اور بیج رکھے ہیں۔ آدمی جیسے ماحول میں پرورش پاتا ہے اور جو راہ خود اپنے لیے اختیار

کرتا ہے، اسی کے مطابق ترقی کرتا ہے ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ نے دونوں راہیں بتلادی ہیں۔ کس چیز میں کیا فائدہ ہے اور کس چیز میں کیا نقصان ہے؛ وہ بھی بتلا دیا ہے۔ تو حلم کا مادہ آدمی میں ہوتا ہی ہے، لیکن آدمی ریاضت اور مجاہدہ کر کے اس کو ترقی دیتا ہے۔ ایسے ہی جتنی بھی خوبیاں ہیں ان کے بیج اللہ تعالیٰ نے تمام انسانی دلوں میں ڈال رکھے ہیں، بری صفات کے بیج بھی ہوتے ہیں، اب آپ کس کو پانی دیتے ہیں اس پر ساری بنیاد ہے۔ اچھے اوصاف کے مناسب پانی اہل اللہ، اہلِ تقویٰ اور اچھے اخلاق والوں کی صحبت اور ان سے استفادہ ہے۔ اور برے اوصاف کے مناسب پانی بری صحبت ہے۔ اگر بری صحبت میں رہ کر ان کو پانی پلائیں گے؛ تو وہی بڑھیں گے اور پھر ان کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔

باب الحلم والاناءة والرفق

حلم، وقار اور نرمی

﴿مجلس ۲﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گذشتہ مجلس میں عنوان شروع ہوا تھا: بردباری اور اناءۃ؛ اطمینان وسکون سے کام کو انجام دینا، اور نرمی؛ ان تین چیزوں کی تفصیل بھی بتلادی تھی۔ اسی سلسلہ میں روایات چل رہی ہے۔

نرمی کا جادو

۶۳۳:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّ اللهَ رفيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الأَمْرِ كُلِّه. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نرم ہیں، اور ہر چیز میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔

افادات:- نرمی کی عادت ہر کام میں خوبی پیدا کردیتی ہے، اور سختی کی وجہ سے اس کام کی خوبی گھٹتی، اور کبھی تو بالکل ختم ہی ہوجاتی ہے۔ آپ کبھی کسی کو تنبیہ کرنا چاہیں، تو تنبیہ کی بات بھی اگر نرمی کے ساتھ کریں گے تو اس کی وجہ سے سامنے والے پر جو اثر ہوگا، سختی کے ساتھ کہنے میں وہ اثر نہیں ہوگا۔ اس لیے نرمی بھی ایسی چیز ہے جس کی شریعت میں تاکید آئی ہے اور اس کو ساری خوبیوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔

اگر طویل المیعاد فائدہ حاصل کرنا ہے!

۶۳۴:- وعنها: أَنَّ النبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفقِ، مَا لاَ يُعْطِي عَلَى العُنْفِ، وَمَا لاَ يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نرم ہیں، نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ اور نرمی پر وہ چیز دیتے ہیں جو سختی پر نہیں دیا کرتے، اور

کسی بات پر وہ نعمت نہیں عطا فرماتے جو نرمی پر عطا فرماتے ہیں۔

افادات:- کسی بھی کام کو آپ انجام دینا چاہیں تو اس کے لیے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں، یا تو سختی والا پہلو اپنا کر اس کام کو انجام دیں، یا نرمی اختیار کر کے انجام دیں۔ مثلاً کسی آدمی کو کسی برائی سے روکنا ہے، یا کسی بھلے کام کی تاکید کرنی ہے تو آپ سختی والا رویہ اختیار کریں یا نرم طریقہ اختیار کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں یہ ہدایت فرما رہے ہیں کہ بھائی! نرمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ پسند فرماتے ہیں، اس لیے مؤمن کو نرمی والا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔

پھر آگے یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نرمی پر وہ عطا فرماتے ہیں جو سختی پر نہیں دیا کرتے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ نرمی کے نتیجہ میں جو اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں، سختی کے نتیجہ میں وہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ سختی کی وجہ سے کوئی فائدہ ہو بھی گیا تو وہ وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے، طویل زمانہ کے اعتبار سے وہ مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس سے کوئی طویل المیعاد فائدہ حاصل ہوا ہو۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ مؤمن کو چاہیے کہ وہ نرمی والا طریقہ اختیار کرے۔ اس زمانہ میں عام طور پر تعلیم وتربیت کے ذمہ دار حضرات، عصری تعلیم گاہوں کے سربراہان نفسیاتی اور دوسرے انداز سے لوگوں کی اصلاح کے، اور برائی سے روکنے کے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، ان میں بھی اسی بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ نرمی والا پہلو اختیار کیا جائے۔ ہمیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تعلیم ہے کہ نرمی اختیار کرو۔ اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل کیا تھا وہ آگے آنے والا ہے۔

اس کام میں رونق آ جاتی ہے

۶۳۵:- وعنها أَنَّ النبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنَّ الرِّفْقَ لاَ يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلاَّ زَانَهُ

،وَلاَ یُنْزَعُ مِنْ شَیْءٍ إِلاَّ شَانَهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نرمی جس چیز میں بھی ہوگی، اس کو زینت اور خوبی عطا کرے گی۔ اور جس چیز میں سے نکال دی جائے گی، اس کو عیب دار بنا دے گی۔

افادات:- آپ جس کام میں بھی نرمی اپنائیں گے اس میں خوبی نمایاں ہوگی، نرمی اس کام کو مزید مزین کرے گی، اس کی زینت اور خوبصورتی کو بڑھائے گی۔ جس کام میں نرمی والا پہلو اختیار کیا جائے گا، اس میں رونق آجائے گی، زینت اور خوبی پیدا ہو جائے گی۔ اور اس میں سے اگر نرمی نکال دی جاتی ہے تو وہ کام عیب دار ہو جاتا ہے، اس میں ویسی خوبی، رونق اور زینت باقی نہیں رہتی جو نرمی سے حاصل ہو سکتی تھی۔

تم آسانی کرنے والا بنا کر بھیجے گئے ہو

۶۳۶:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: بَالَ أَعْرَابِيٌّ في المسجدِ، فَقَامَ النَّاسُ إِلَيْهِ لِيَقَعُوا فِيهِ، فَقَالَ النبيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: دَعُوهُ وَأَرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ سَجلاً مِنْ مَاءٍ، أَوْ (قال) ذَنُوباً مِنْ مَاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَم تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دیہات کا رہنے والا ایک نیا آدمی (آیا، مسلمان ہوا، اور) مسجدِ نبوی ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے تاکہ اس کو تنبیہ کریں (یعنی اس کو روکیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، پیشاب کر لینے دو، اور پانی سے بھرا ہوا ایک ڈول لا کر اس پر بہا دو۔ تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری اور مشکلی پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اَلْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ

افادات:- دوسری روایت میں ہے کہ پہلے تو اس نے نماز پڑھی اور اس میں ایک دعا کی: أَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا، وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا. اے اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کیجیے اور کسی دوسرے پر رحم نہ کیجیے۔ نماز کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا"، اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی کشادہ اور وسیع ہے، تم نے صرف اپنے اور میرے لیے رحمت کی دعا مانگ کر اس کو تنگ کر دیا۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ کیجیے۔ تو ایک کام تو اس نے یہ کیا (صحیح البخاری، باب رَحْمَةِ النَّاسِ وَالْبَهَائِمِ: ۶۰۱۰)

پھر اس نے حضور ﷺ سے سوال کیا: "مَتَى السَّاعَةُ؟" قیامت کب آئے گی؟ حضور اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: "مَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟" تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے جو قیامت کا سوال کرتا ہے؟ جیسے کوئی آدمی پوچھے کہ امتحان کب ہے؟ تو آپ اس سے کہیں گے کہ تم نے کیا تیاری کی ہے کہ امتحان کا سوال کر رہے ہو؟ اسی طرح قیامت کب آئے گی جو تم پوچھ رہے ہو، تو تم نے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے کہا: "مَا أَعْدَدْتُ لَهَا كَثِيْرَ صَلٰوةٍ وَصَوْمٍ وَصَدَقَةٍ"، اے اللہ کے رسول! میں نے اس کے لیے کوئی زیادہ نماز، روزوں کا اہتمام تو نہیں کیا ہے، بس! فرائض پر اکتفا کرتا ہوں، لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ"، آدمی اسی کے ساتھ رہے گا جس سے وہ محبت رکھتا ہے (صحیح البخاری، باب عَلَامَةِ حُبِّ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ جواب سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنے خوش ہوئے کہ اس سے پہلے کسی چیز سے اتنے خوش نہیں ہوئے تھے۔ (سنن الترمذی: ۲۳۸۵) اس لیے کہ ان کو تو حضورِ اکرم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی اور یہ جواب تو گویا ان کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔

پھر اس دیہاتی نے تیسرا کام یہ کیا کہ جب اس کو پیشاب کا تقاضا ہوا تو مسجدِ نبوی ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ اس کے نزدیک باہر اور اندر کا کوئی فرق تو تھا نہیں۔ اس دیہاتی کے متعلق شرّاح ایک جملہ لکھتے ہیں: "اَلْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ" وہ قائل یعنی دعا کرنے والا تھا۔ سائل یعنی سوال کرنے والا تھا۔ اور بائل یعنی پیشاب کرنے والا تھا۔

ویسے بھی اُس زمانہ میں مسجدوں میں فرش فروش یا پتھر اور ٹائلس وغیرہ لگے ہوئے نہیں ہوتے تھے، کچی ریت بچھی ہوئی ہوتی تھی اس لیے جو پیشاب گر رہی تھی وہ زمین میں جذب ہو رہی تھی۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ زمین پر پیشاب گری ہو اور سوکھ جائے تو اس سے بھی زمین پاک ہو جاتی ہے، لیکن چوں کہ مسجد کا معاملہ تھا، ہو سکتا ہے کہ سوکھنے میں دیر لگے اور دوسری نماز کا وقت قریب ہو، اگر اس سے پہلے سوکھی نہیں تو وہ جگہ ناپاک رہے گی، یا سوکھ تو گئی لیکن بدبو کا اثر رہ سکتا ہے اس لیے بھی فوری طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر پانی کا ایک ڈول بہادو۔ یہ تو اس کی پیشاب سے مسجد کے فرش پر جو اثر ہوا تھا اس کو دور کرنے کی تدبیر بتائی۔

روایت کا سبق

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک نصیحت فرمائی: تم لوگ آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری اور مشکل کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ اسی سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا، پھر آپ اپنی اُمّت کو یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت کے جتنے احکام نازل فرمائے ہیں ان کو آگے پہنچانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔

یہاں حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حلم و بردباری کا سبق دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حرکت کرتا ہوا دیکھ کر آدمی کو فوری طور پر غصہ آتا ہے، لیکن آپ ﷺ نے ان کو روک دیا کہ شاید غصہ کی حالت میں کوئی کچھ کر ڈالے۔ اور ایک تدبیر بھی بتلادی جو خطرے سے خالی تھی کہ اس کو پیشاب کر لینے دیا جائے، اس کے بعد اس پر پانی بہادیا جائے، اس میں کچھ نقصان نہیں تھا۔ اور اس کو روکنے میں دو میں سے ایک نقصان لازمی تھا۔ اگر وہ فوری طور پر رک جائے تو اس کو جسمانی نقصان ہوگا، اور اگر نہیں رو کے گا اور اُٹھ کر بھاگے گا تو مزید فرش ناپاک ہوگا۔ گویا حضورِ اکرم ﷺ نے ان کو بتلادیا کہ اگر تم اس پر غصہ کروگے اور اس کو روکوگے تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے، بلکہ نقصان ہی ہوگا۔ زمین پر پیشاب کا کچھ حصہ گر ہی چکا ہے، وہ تو ختم ہونے والا نہیں، اس کی پاکی کے لیے تو تدبیر کرنی ہی ہے، اب اس کو وہیں پورا پیشاب کر لینے دو، بعد میں اس حصہ کو دھو دیا جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غصہ کی حالت میں کوئی اقدام اور تدبیر پورے طور پر نافع نہیں ہوتی، اس میں کچھ نہ کچھ قصور، کمی وکوتاہی رہ ہی جاتی ہے، جس کی طرف اس وقت غصہ کی وجہ سے آدمی کا دھیان نہیں جاتا، بعد میں اس کو بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کے بجائے فلاں تدبیر کی ہوتی تو اچھا تھا، اس میں یہ نقصان نہ ہوتا۔ اور آئندہ کے لیے یہ بھی بتلادیا گیا کہ تمہارے مزاج میں آسانی ہونی چاہیے، سختی نہیں ہونی چاہیے۔ گویا امت کے لیے یہی ایک چیز اصولی ہے کہ آدمی آسانی والے طریقہ کو اپنائے۔

آسانی کو ترجیح دیجیے

۶۳۷:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبیِ ﷺ قَالَ: يَسِّرُوا وَلاَ تُعَسِّرُوا،

وَبَشِّرُوا وَلاَ تُنَفِّرُوا. (متفقٌ عَلَيۡهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کے لیے آسانی کرو، دشواری نہ کرو۔ لوگوں کو بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

افادات:- یہ خطاب مختلف طریقوں سے آچکا ہے کہ دین میں جو آسان پہلو ہو، اس کو شریعت نے ترجیح دی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جہاں صراحتاً حرمت ہو وہاں بھی کوئی آدمی اس روایت کو پیش کر کے آسانی کا مطالبہ کرے، جیسے: کوئی کہنے لگے: مولوی صاحب! اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ سود سے بچنا مشکل ہو گیا ہے، اس لیے آپ اجازت دے دو۔ ارے بھائی! مولوی صاحب سود کی اجازت کہاں سے دیں گے جبکہ قرآن وحدیث میں صاف صاف اس کی حرمت آئی ہے؟ بلکہ آسانی کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ کام جس میں شرعی اعتبار سے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں، ان میں جو آسان پہلو ہو، وہ اختیار کرنا چاہیے، دشواری والا پہلو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ یا حکمران طبقہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطاب کر رہے ہیں کہ اپنے عوام اور پبلک سے جو معاملہ پڑے، اور اس میں ان کے لیے دونوں پہلو ہوں، تو آسانی والا پہلو اختیار کرو۔ چناں چہ بعض حضرات جیسے حضرت معاذ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کی طرف حاکم بنا کر بھیجا، تو ان کو خاص تاکید فرمائی تھی: "يَسِّرَا وَلاَ تُعَسِّرَا" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ کو بھی خطاب کیا گیا ہے کہ تمہاری طرف سے عوام کی معاشرت سے متعلق جو احکام جاری کیے جائیں، جو آرڈیننس جاری ہوں، ان میں نرمی کا پہلو اختیار کرنا، سختی والا نہیں۔

متنفر مت کرو

"بَشِّرُوا وَلاَ تُنَفِّرُوا" لوگوں کو بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔ "لاَ تُنَفِّرُوا" کا

مقابل "أَنِّسُوْا" ہونا چاہئے تھا، یعنی لوگوں کو مانوس کرو۔ مانوس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ ملاؤ، جیسے بچہ جب بدکتا ہے تو اس کو مانوس کیا جاتا ہے۔ تو لوگوں کو بدکاؤ مت، اور نفرت نہ دلاؤ۔ یعنی آپ ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کیجئے جس کی وجہ سے لوگ آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ آپ اگر دین کا کام کر رہے ہیں تو کوئی ایسا طریقہ نہ اپنائیے جس کی وجہ سے لوگ بجائے اس کے کہ آپ سے قریب ہوں، وہ طریقہ ان کو دور کرنے کا ذریعہ بنے، اور آپ کی ذات سے جو فیض و فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ نہ پہنچے۔

جامع ترین نبوی اصول

زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق یہ وہ بنیادی اصول ہیں جو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو دیئے۔ یعنی آسانی والا معاملہ ہونا چاہیے، سختی نہیں ہونی چاہیے۔ دھمکیاں دے کر کام لینے کے بجائے بشارت اور خوش خبری سنا کر کام لینا، لوگوں کو بِدکا کر کام لینے کے بجائے مانوس کر کے کام لینا چاہیے۔ چاہے بیوی کے ساتھ معاملہ ہو، چاہے اولاد کے ساتھ معاملہ ہو، اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملہ ہو، ملازمین کے ساتھ معاملہ ہو، یا کسی دوسرے کے ساتھ معاملہ ہو؛ ہر شعبے میں آپ یہ اصول اپنا سکتے ہیں۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کی جامع تعلیمات میں سے ہے۔ آپ کے اشادات تو جوامع الکلم کے قبیل سے ہوا کرتے تھے، یعنی ایسی ہدایت جو زندگی کے ہر شعبے میں آدمی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ گویا یہ وہ ہدایت اور زندگی کا ایک بہت بڑا بنیادی اصول ہے جس سے آپ ہر جگہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بعض لوگ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی امت کو زندگی کے ہر شعبے میں اختیار کرنے کے واسطے ایسا اونچا اصول بتلا دیا ہے کہ کوئی آدمی اگر اس ایک اصول

کو اپنالے، تو وہ اپنی زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔ بس آپ بھی کر کے دیکھ لیجئے!

جو نرمی سے محروم کر دیا گیا......

۶۳۸:- وعن جرير بنِ عبدِ اللهِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقولُ: مَنْ يُحْرَمِ الرِفْقَ، يُحْرَمِ الخَيْرَ كلَّهُ. (رواه مسلم.)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی نرمی سے محروم کر دیا گیا، وہ ہر بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔

افادات:- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نرمی کی اہمیت کو بتلانے کے لیے کتنی بلیغ تعبیر اختیار فرمائی۔ گویا یہ ایک ایسی صفت ہے کہ اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صفت وخوبی نہیں ملی ہے اور اس کے مزاج میں یہ بات نہیں ہے، تو سمجھو کہ وہ بہت ساری خیر سے محروم رہ جاتا ہے۔

چناں چہ ایسا ہی ہوتا ہے؛ جس کے مزاج میں درشتی، سختی اور اکھڑ پن ہوتا ہے تو غیر تو غیر؛ اپنے بھی اس سے دور بھاگتے ہیں۔ تمام ہی یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کا سامنا نہ ہو تو اچھا ہے۔ وہ اگر گھر میں آجائے تو گھر والے بھی ہر وقت دل سے دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں کہ یہ بلا جتنی جلدی ٹلے، اتنا ہی اچھا ہے۔ سب لوگ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کب یہ گھر سے جائے۔ بلکہ اگر وہ گھر میں آئے تو دوسرے لوگ موقع نکال کر اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں کہ جناب تنہا ہی تشریف رکھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختصر ترین نصیحت

۶۳۹:- عن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنَّ رَجُلاً قَالَ للنبيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَوْصِني. قَالَ:

لَا تَغْضَبْ. فَرَدَّدَ مِرَاراً، قَالَ: لَا تَغْضَبْ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک آدمی نے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! مجھے نصیحت کیجئے (دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا: "أَوْصِنِيْ، وَأَوْجِزْ"، نصیحت کیجئے اور مختصر نصیحت کیجئے) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غصہ مت کرنا۔ اس نے بار بار یہی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی فرمایا: غصہ مت کرنا۔

افادات:- گویا اس نے کم وقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی کارآمد بات کی نصیحت کرنے کی درخواست کی، اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اگر اس طرح کی درخواست کرے؛ تو خلافِ ادب نہیں ہے۔ اگر کوئی آپ سے ایسا کہے تو یہ مت سوچئے کہ عجیب آدمی ہے، نصیحت بھی چاہ رہا ہے، اور اوپر سے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ مختصر کیجئے۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کسی آدمی کے پاس وقت کم ہوتا ہے، وہ آپ کے پاس فیض حاصل کرنے کے لیے آیا، ملاقات کر کے اس کو گاڑی پکڑنی ہے، یا کسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے، اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ آپ سے کچھ فائدہ پہنچ جائے، اس لیے کہتا ہے کہ کوئی مختصر سی نصیحت کر دیجئے۔ اگر آپ لمبی چوڑی تقریر شروع کریں گے تو وہ سوچتا رہے گا کہ میں نے یہ بلا اپنے سر کہاں لے لی؟ اور یہی چیز کبھی لوگوں کو متنفر کرنے کا باعث بنتی ہے۔

ایک زرّیں نصیحت

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ آپ نے اعلان کیا کہ نماز کے بعد پانچ منٹ کے لیے بیٹھ جائیں، دین کی بات ہوگی۔ تو پانچ منٹ ہی وعظ کہئے؛ چھٹا منٹ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ نے جو وقت دیا ہے کہ پندرہ منٹ

بات ہوگی، تو پندرہ منٹ میں آپ بات نمٹا دیجیے۔ اس لیے کہ اگر آج آپ نے اس پر عمل نہیں کیا تو دوسرے موقع پر اگر آپ دو منٹ کا بھی اعلان کریں گے، تب بھی کوئی نہیں بیٹھے گا کہ فلاں صاحب نے پانچ منٹ کا کہا تھا اور پندرہ منٹ لگائے تھے، اور یہ طریقہ لوگوں کو دین کی بات سننے سے روکتا ہے۔ سیدھی سادی بات ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ویسے بھی یہ ایک وعدہ ہے، اور وعدہ کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور پھر وہ وعدہ جو مسجد میں، اللہ کے گھر میں، منبر کے پاس، اتنے سارے آدمیوں کے سامنے کیا گیا ہو؛ اور وہ پورا نہ کیا جائے، تو کتنی بری بات ہے! حالاں کہ جو ایسے ویسے لوگ ہوتے ہیں ان کو بھی منبر کے پاس لا کر سچی بات بلوانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور آپ تو دیندار آدمی ہو کر منبر کے پاس کیا ہوا وعدہ پورا نہ کریں؛ تو پھر کیسے بات بنے گی؟۔

یہ بھی حکمت ہے

بمبئی جامع مسجد میں حضرت مولانا شوکت علی صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ میں جب بھی بمبئی جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اتنا بڑا شہر ہے اور اتنا مشغولی والا مجمع ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنے ایک ایک منٹ کو وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنا سب کاروبار چھوڑ کر جمعہ پڑھنے آتا ہے، اس کے باوجود جمعہ کی نماز کے بعد اس روز کا جو خطبہ ہوتا ہے، حضرت مولانا اس کی مختصر سی تشریح فرماتے ہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ مولانا کا معمول یہ ہے کہ پانچ سات منٹ میں معاملہ نمٹا دیتے ہیں، تو کوئی بھی وہ بیان سنے بغیر نہیں جاتا، بلکہ جو لوگ اوپر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نیچے آ کر بیٹھتے ہیں اور مولانا کی بات سن کر جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کون بیٹھتا؟ اس لیے صحیح بات تو یہی ہے

کہ یہ بھی حکمت کا ایک طریقہ ہے۔ اگر ہماری مساجد میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ جمعہ کی نماز کے بعد بیان ہوگا تو کتنے لوگ بیٹھیں گے؟ میں آپ کو یقین سے بتا دوں کہ ایک بھی نہیں بیٹھے گا۔

تقریرِ رسول حجت ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی نے یہ کہا کہ نصیحت کیجئے اور مختصر نصیحت کیجئے، تو اس کی یہ بات خلافِ ادب نہیں ہے۔ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اس پر کوئی تنبیہ نہیں فرمائی کہ تو عجیب آدمی ہے، ایک تو نصیحت کا مطالبہ کرتا ہے، اور ساتھ میں یہ بھی کہتا ہے کہ مختصر ہو۔ اگر اس کا یہ مطالبہ اور یہ درخواست غلط ہوتی تو نبی کریم ﷺ ضرور نکیر فرماتے کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ آپ ﷺ تو امت کی اصلاح کے لیے ہی بھیجے گئے تھے، اس لیے کسی غلط بات کو آپ باقی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور حضورِ اکرم ﷺ کا کسی بات پر خاموشی اختیار کرنا اور تردید نہ کرنا، اس بارے میں تمام علماء بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ یہ اس چیز کے جائز اور درست ہونے کی علامت ہے۔ اہلِ علم موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ تقریرِ رسول حجت ہے۔

خیر! آپ ﷺ نے بھی اس کی بات مانتے ہوئے صرف ایک لفظ میں بہت مختصر نصیحت فرمائی: ’’غصہ مت کرنا‘‘۔ جس نے مختصر نصیحت کی درخواست کی تھی وہ بھی حیرت میں پڑ گیا کہ اتنی مختصر نصیحت ارشاد فرمائی، حالاں کہ میرے پاس تو ابھی وقت ہے، اس لیے اس نے پھر وہی درخواست کی، تو آپ ﷺ نے پھر یہی فرمایا: غصہ مت کرنا۔

دیکھو! آپ ﷺ نے کیسی عجیب نصیحت فرمائی۔ اس لیے کہ غصہ نہیں کریں گے تو اس کے لیے بردباری اور حلم لازم ہی ہے۔ جب کوئی بات غصہ پیدا کرنے والی سامنے آئے تو آپ کو غصہ نہیں کرنا ہے۔ تو پھر کیا کرنا ہے؟ بردباری اختیار کرنی ہے اور برداشت کرنا ہے۔ باب قائم کیا تھا کہ بردباری سے کام لو، وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

گناہ کے دو محرکات

یہ درحقیقت بہت مختصر سی نصیحت ہے لیکن آدمی کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب لانے والی ہے۔ اس لیے کہ علماء فرماتے ہیں کہ انسان کی طبیعت کے اندر گناہ کے محرکات دو ہیں: ایک غصہ اور دوسرا شہوت۔ عام طور پر آدمی جب گناہ کرتا ہے تو یا تو شہوت اور خواہشِ نفس کی وجہ سے کرتا ہے، جیسے کسی چیز کی کھانے کی خواہش ہوئی اور وہ مل رہی ہے، لیکن پیسے نہیں ہیں تو آدمی چوری کرتا ہے۔ یا کوئی غلط خواہش پیدا ہوئی، اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو زنا، چوری اور اس قسم کے جتنے بھی گناہ ہیں جن کو نفسانی گناہوں سے تعبیر کیا گیا ہے، آدمی وہ سب گناہ خواہش کے نتیجہ ہی میں کرتا ہے۔

شہوت و غصہ میں ایک فرق

تو خواہش و شہوت کی وجہ سے جو گناہ ہوتے ہیں ان میں عام طور پر اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ لیکن غصہ کے نتیجہ میں عام طور پر بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اس لیے کہ غصہ کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ جس پر غصہ آیا ہے، وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ آپ کا ماتحت ہے اور آپ سے کمزور ہے۔ اگر آپ کا ماتحت اور آپ سے کمزور ہے تو غصہ میں آپ اس کی پٹائی کریں گے، اس کا چہرہ نوچیں گے، گالیاں دیں گے، برا بھلا کہیں گے، اور پتہ نہیں کیا کیا کریں گے، ایسے موقع پر آدمی اپنے ماتحتوں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے، وہ سب آپ کریں گے۔

ویسے آدمی کے مزاج میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے غصہ رکھا ہے، اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بری چیز بھی نہیں ہے، بلکہ غصہ ایک خاص مقصد کے لیے رکھا گیا ہے کہ کسی آدمی کی جان پر حملہ ہو، اس کی عزت و آبرو پر حملہ ہو، اس کے مال پر حملہ ہو،

اس کے دین پر حملہ ہو؛ تو اس کا دفاع کر سکے۔ اگر آدمی کی طبیعت میں غصہ نہیں ہوگا تو وہ کبھی دفاع نہیں کر سکے گا۔ آدمی کے اندر جو ''ڈفینس'' (Defence) کا جذبہ ابھرتا ہے، وہ اسی غصہ کے نتیجے میں ابھرتا ہے۔ آپ ستون کو کتنا ہی مار لیجیے، کچھ نہیں کرے گا، وہ آپ سے کوئی بدلہ نہیں لے گا، اس لیے کہ ستون کے اندر غصہ ہے ہی نہیں۔ معلوم ہوا کہ غصہ بھی ضروری ہے، انسان کی طبیعت میں غصہ تو ہونا ہی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر رکھا ہے، لیکن اس غصہ کو جہاں استعمال کرنا چاہیے، وہیں استعمال کیا جائے دوسری جگہ پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے پچھلی مجلس میں بھی کہا تھا کہ غصہ کے نتیجہ میں آدمی کی عقل مغلوب اور ختم ہو جاتی ہے، جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو وہ عقل سے کام نہیں لیتا۔ اور عقل سے کام نہ لینے کی میں نے کچھ مثالیں بھی دی تھیں۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر

اور ایک بات یاد رہے کہ شریعت نے غصہ تو اپنے اوپر آنے والے نقصان کو دور کرنے کے لیے رکھا ہے، اگر کسی کی حرکت سے آپ کو کوئی نقصان ہوا ہے تو اس نقصان کو دور کرنے کے لیے جتنی مقدار غصہ کی ضروری ہے، وہ کیجیے۔ مثلاً: آپ کی بنیادی ضرورت کی کوئی چیز تھی، اس میں اس نے نقصان پہنچا دیا، آپ کا کھانا چھین لیا، آپ کا مال چھین لیا، تو آپ اس سے واپس لیجیے۔ شریعت نے بدلہ اور انتقام کی جوابی کاروائی کی اتنی اجازت دی ہے جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ اگر تمہیں بدلہ ہی لینا ہے، تو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لو، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دی گئی ہے، ورنہ ظلم اور زیادتی ہوگی۔

تو اگر ہمارا کسی ایسی چیز کا نقصان ہوا جس کی وجہ سے ہماری جان، ہمارے

مال یا ہماری بنیادی ضرورتوں پر زد پڑتی ہے؛ تو غصہ کے ذریعہ سے اپنا دفاع کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر کسی بنیادی ضرورت پر زد نہیں پڑتی، بلکہ کسی نے کچھ ایسا کیا جس کی وجہ سے آپ کے جاہ پر اثر پڑا۔ مثلاً: اس نے گالی دی، تو اس سے آپ کا کیا نقصان ہوا؟ آپ جس منصب پر ہیں، کیا آپ اس منصب سے نیچے آ گئے؟ یا آپ کا عہدہ چھن گیا؟ نہیں۔ آپ اگر وزیر اعظم ہیں اور کوئی آدمی سو گالیاں دے، تب بھی آپ کی وزارتِ عظمٰی کی کرسی پر کوئی خطرہ نہیں آئے گا، وہ جوں کی توں باقی رہے گی۔ یا اس نے گالی دی تو آپ کا مال گھٹ گیا؟ آپ کی فیکٹری بند ہوگئی؟ آپ کی تجارت کے اندر جو منافعہ ہوتا تھا، وہ گھٹ گیا؟ اس کے گالی دینے سے آخر نقصان کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو اگر کسی نے گالی دی، تو یوں سوچ لیجئے کہ اس کی وجہ سے جب میرا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا تو پھر جانے دو، اس نے گالی دی تو دی، اس سے کیوں الجھنا۔ ویسے شریعت نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی برا لفظ کہے تو آپ برا لفظ کہہ سکتے ہیں، لیکن حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف اور اخلاق بیان کئے گئے ہیں کہ دنیا کی کسی چیز کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غصہ نہیں آتا تھا۔ جیسے آپ کے بچے کے ہاتھ سے گلاس گر گیا اور ٹوٹ گیا، تو وہ ٹوٹنے والا تھا، ٹوٹ گیا، اب آپ اس پر غصہ کیوں کرتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا آپ کے غصہ کے بعد وہ گلاس ٹھیک ہو جائے گا؟ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس کی تلافی ہونے والی نہیں ہے۔ اس لیے آدمی اگر یہ سوچ لے تو بہت سی چیزوں میں اپنے آپ کو غصہ سے بچا سکتا ہے۔

غصہ کے شاخسانے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ گناہ کے محرکات دو ہیں، ایک شہوت اور دوسرا غصہ۔ اور ان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں

نے بتلایا تھا کہ غصہ کے نتیجہ میں سامنے والا اگر ماتحت ہے تو آپ اس پر زیادتی کریں گے، گالی دیں گے۔ زبان سے زیادتی ہوگی، ہاتھ سے زیادتی ہوگی، اور ہوسکتا ہے کہ اس کا وظیفہ بند کردیں، یا پیسے دیتے تھے، وہ نہیں دیں گے، اس کو کپڑے دیے تھے، وہ واپس لے لیں گے، یہ سب آپ کریں گے؛ تو اس طرح آپ نے بندوں کو تکلیف پہنچائی۔

اور اگر وہ آپ سے اونچا آدمی ہے، قوت والا ہے کہ وہاں آپ دم نہیں مار سکتے تو "خشم درویش بہ جان درویش" والا معاملہ ہوگا، وہاں تو آپ کچھ کر نہیں سکتے اور طبیعت میں غصہ ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ غائبانہ اس کی غیبت کریں گے، اپنا غصہ اتارنے اور دل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس پر الزامات لگائیں گے۔ اس کے متعلق جھوٹی باتیں لوگوں کے اندر پھیلائیں گے کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے۔ اس بیان بازی میں اگر واقعہ بیان کریں؛ تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ عیوب اس میں نہیں ہیں تو بہتان ہے؛ اور دونوں کبیرہ گناہ ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو آپ اس کی وجہ سے اپنی طبیعت میں گھٹن محسوس کریں گے؛ اسی کو کینہ اور بغض کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب اس کو تکلیف پہنچے گی تو آپ خوش ہوں گے، لوگوں سے کہیں گے کہ اس کے ساتھ ایسا ہوا تو برا بر ہی ہے، یہ اسی کا حقدار تھا۔

اس نے تو آپ کو ایک گالی دی تھی، لیکن ساری دنیا آ کر اس کو مار رہی ہے تو آپ خوش ہو رہے ہیں، حالاں کہ وہ بھی مسلمان ہے اور آپ بھی مسلمان ہیں، اور مسلمان بھائی ہونے کی حیثیت سے آپ کو اس کا بچاؤ کرنا چاہیے، اور اس کی امداد کرنی چاہیے، لیکن آپ نہیں کر رہے ہیں۔ تو غور کرو کہ اس غصہ نے ہم کو کتنی نچلی سطح پر لا کر ڈال دیا کہ اسلامی اخوت و بھائی چارگی کی نسبت سے نبی کریم ﷺ نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں، ان کا بھی ہمیں خیال نہیں رہا "اَلْمُسْلِمُ أَخُ الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ

وَلَا یَحْقِرُہٗ"، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر زیادتی نہیں کرتا، اور اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے، تو اس کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا، اور اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔ لیکن یہاں یہ سب ہو رہا ہے۔

پھر مزید یہ ہوگا کہ جب اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت پہنچے گی؛ مثلاً: اس کے لیے ترقی کے اسباب پیدا ہوں گے تو اس غصہ کی وجہ سے آپ کو وہ بھی اچھے نہیں لگیں گے، آپ یہ تمنا کریں گے کہ اس کو یہ عہدہ کہاں مل گیا؟ جلدی سے چھن جانا چاہیے؛ اسی کا نام حسد ہے۔ تو دیکھو! ایک غصہ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ اور پھر اس حسد اور بغض کے نتیجہ میں آدمی کیا کیا کرتا ہے تو صرف ایک غصہ نے کتنے بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا کروا دیا!

اور شہوت و خواہشِ نفس کی وجہ سے ہونے والے اکثر گناہ تو وہ تھے جن کا تعلق حقوق اللہ سے تھا کہ حرام لقمہ کھالیا، کوئی حرام کام کرلیا، زنا کرلیا، لیکن غصہ کی وجہ سے عام طور پر جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اس کے نتیجہ میں بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔

بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں کبر کے بیان میں بڑے اہتمام سے اس چیز کو بیان کیا ہے کہ شیطانی گناہ آدمی کے لیے بڑے خطرناک ہیں، لیکن اگر کسی روز اپنی پچھلی زندگی کے متعلق رونے دھونے اور توبہ کی توفیق ہوئی اور آدمی نے سوچا کہ ہائے! میں نے کیا کیا کر ڈالا، اور پھر رات کی تنہائیوں اور اندھیریوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور دو آنسو بہا دیے؛ تو سارا معاملہ نمٹ گیا۔ لیکن اگر کسی کی پٹائی کی تھی، گالیاں دی تھی، چہرہ نوچا تھا، کپڑے پھاڑے تھے، اس کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا

تھا، اس کی غیبت کی تھی اور اس پر تہمت لگائی تھی، اور پتہ نہیں کیا کیا کیا تھا؛ اب اگر احساس ہوا تو چاہے ہمیں دس رمضانوں تک دس شب قدر بھی مل جائے، اور کوئی اللہ کا بندہ بالیقین بتادے کہ آج شب قدر ہے، اور آپ رات بھر جاگتے رہیں اور دعائیں کرتے رہیں اور توبہ کرتے رہیں؛ تب بھی وہ گناہ معاف ہونے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ جس کا حق ہے اسی سے معاف کرالو۔ اسی لیے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی کی بار بار کی درخواست پر نصیحت فرمائی: غصہ مت کرنا۔ اگر اس ایک چیز ہی کو آدمی اپنالے؛ تو اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے۔

ہر کام اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے

۶۴۰:- وعن أَبي يعلى شَدَّاد بن أوسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنَّ اللهَ كَتَبَ الإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُم فَأَحْسِنُوا القِتْلَة، وَإِذَا ذَبَحْتُم فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَه، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو یعلی شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اچھا سلوک ہر چیز پر لازم کردیا ہے، جب تم کسی کو قصاص میں قتل کرو یا جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، اور اپنی چھری کو تیز کرکے اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

افادات:- دیکھو! شریعت میں جن گناہوں کی وجہ سے قتل کی سزا مقرر ہوئی ہے، جیسے قصاص کے طور پر کسی کو قتل کیا جائے؛ تو وہاں پر بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ جان لینے کا جو معاملہ کیا جائے اس میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو تکلیف پہنچا پہنچا کر جان لی جائے، بلکہ ایک دفعہ میں معاملہ ختم کردینا چاہیے، اس نے کسی کو قتل کیا تھا اس کے بدلہ میں اس کو قتل کیا جارہا ہے، تو اس نے چاہے کسی بھی

طریقہ سے قتل کیا ہو، گھٹا گھٹا کر جان لی ہو، لیکن اس کو تو آپ ایک جھٹکے ہی میں ختم کر دو۔

اسی طرح اگر جانور ذبح کر رہے ہیں تو اچھی طرح ذبح کرو۔ اسی لیے یہ تعلیم ہے کہ چھری کو اچھی طرح تیز کر لو۔ دیکھو! اپنی ضرورت کی وجہ سے آدمی جانور ذبح کرتا ہے لیکن اس میں بھی اچھا سلوک اور بھلائی والا طریقہ اپنانے کا حکم دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی چھری کو تیز کر کے اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ، یعنی اس طرح ذبح کیجیے کہ وہ جلدی سے ذبح ہو جائے۔ گویا اس میں بھی اچھا طریقہ یہی تھا اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی۔ تو ہر کام کو اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔

بندہ بن کر رہے

۶۴۱:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: مَا خُيِّرَ رسول الله ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلاَّ أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا، مَا لَمْ يَكُنْ إِثْماً، فَإِنْ كَانَ إِثْماً، كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ. وَمَا انْتَقَمَ رسول الله ﷺ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ قَطُّ، إِلاَّ أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ الله، فَيَنْتَقِمَ لِلّٰهِ تَعَالَى.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب کبھی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان و سہولت والی ہوتی تھی اسی کو اختیار فرماتے تھے، جب تک کہ اس میں نافرمانی نہ ہو۔ اگر کسی کام میں گناہ کا پہلو ہوتا تو اس سے آپ لوگوں میں سب سے زیادہ دور رہتے تھے۔ اور آپ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ ہاں! البتہ اگر اللہ پاک کا کوئی حکم توڑا جاتا تو آپ بدلہ لیتے تھے (اس میں آپ معاف نہیں کرتے تھے۔)

افادات:- آسانی والی بات کو اختیار کرنے میں اپنی عبدیت کا اظہار ہے، اسی لیے حدیثِ پاک میں آیا ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس طرح

یہ چاہتے ہیں کہ عزیمت والی چیز کو اختیار کیا جائے، وہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں کہ رخصت پر عمل کیا جائے۔ (شعب الایمان:۳۶۰۶)

شریعت کے احکام میں دو پہلو ہوتے ہیں: عزیمت اور پختگی والا اعلیٰ پہلو، اور دوسرا سہولت والا پہلو۔ جیسے آپ رمضان کے مہینہ میں سفر میں ہیں، تو آپ کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے، پھر بھی آپ رکھیں تو یہ عزیمت ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان سہولتوں والے احکام کو اسی طرح اختیار کیا جائے جیسے عزیمت والے احکام کو اختیار کیا جاتا ہے۔ شریعت کی دی گئی سہولت کو اختیار نہ کرنے میں گویا اپنی بہادری دکھلانا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ بندہ تو بندہ بن کر رہے یہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب بیمار ہوتے تو بہت چلّاتے تھے۔ کوئی کہتا: حضرت! اتنا کیوں چلّاتے ہیں؟ تو فرماتے: بھائی! اللہ تعالیٰ نے بیماری دی ہی اس لیے ہے کہ اس کو ہمارا چلّانا پسند ہے؛ لہٰذا چلّاؤ۔ ہم اپنی بہادری نہیں دکھلاتے کہ میں بہت برداشت کرسکتا ہوں۔ یہ حضرت کے مزاج کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے پہلو کو غلط بتلانا چاہتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پہلو عبدیت والا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ دو کاموں میں سے جو آسان ہوتا تھا اسی کو اختیار فرماتے تھے، البتہ وہ گناہ نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارا مزاج برعکس ہوگیا

اور نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جارہا ہو تو آپ بدلہ لیتے تھے، اس میں آپ معاف نہیں کرتے

تھے۔ایک مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے۔آج ہمارا مزاج اس کے برعکس ہوگیا ہے،شریعت کے احکام توڑے جارہے ہیں، جیسے بیٹا نماز نہیں پڑھتا، گناہوں کے کام کرتا رہتا ہے، باپ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے،لیکن کبھی اس کو غصہ نہیں آتا، اوراس کو روکنے کی کوشش نہیں کرتا،لیکن اگر یہی بیٹا دوکان پر حاضری نہ دے تجارت میں نقصان کردے،کوئی ایسا فیصلہ کرلے جس سے فیکٹری پر آنچ آجائے،تو فوراً غصہ بھڑک اُٹھتا ہے۔بیوی نماز نہیں پڑھتی، بے پردہ رہتی ہے، دوسرے گناہوں میں مبتلا ہے،لیکن کبھی نرمی سے بھی نہیں روکتے ،لیکن اگر کھانے میں نمک مرچ زیادہ ہوجائے، پلیٹ توڑ دے، یا کچھ اور نقصان پہنچادے؛تو میاں صاحب بڑے غصہ میں آجاتے ہیں۔ جہاں معاف کرنا تھا وہاں غصہ کرتے ہیں اور جہاں معاف نہیں کرنا تھا وہاں معاف کر رہے ہیں۔ ہر جگہ ہمارا یہی حال ہوچکا ہے۔

جب مذہب پر حملہ ہو

اس وقت ہمارے اس ملک میں اسلام کے تعلق سے غیروں کی طرف سے جو اسکیمیں بنائی جارہی ہیں، جیسے کہ اسکولوں میں ایسا نظام لایا جارہا ہے کہ بچے اسلام سے محروم ہوجائیں۔ یا وندے ماترم کہو۔ یا سرسوتی دیوی کی وندنا کرو، جو قانون یوپی میں لازماً لایا گیا تھا،اسی طرح کی اور چیزیں جو ان کی طرف سے لائی جاتی ہیں تو ایسے موقعوں پر اجتماعی طور پر اپنے دین کی حفاظت کے لیے، اللہ کے خاطر اس کا دفاع کرنا سب پر فرض اور لازم ہوجاتا ہے،لیکن وہاں کوئی نہیں بولتا۔اور جب قومی فسادات ہوتے ہیں تو چوں کہ اس میں اپنی جان پر آتی ہے، اپنا کاروبار لٹتا ہے،تو جواب دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔حالاں کہ دفاع یہاں پر بھی کرنا ہے۔ میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس وقت

ابتداء دینی امور سے ہوتی ہے، اس وقت ہم خاموش رہتے ہیں، اور پھر جب یہی معاملہ آگے بڑھتے بڑھتے ہماری جانوں، ہمارے کاروبار اور ہماری متعلقہ چیزوں تک آتا ہے تو ہم شور مچاتے ہیں۔ اگر یہی شور ہم نے پہلے دن مچایا ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نوبت آنے ہی نہ دی جاتی۔

اس لیے ہر جگہ اس کا اہتمام ضروری ہے کہ دین کا جہاں معاملہ ہو وہاں آدمی خاموش نہ رہے، وہاں غصے کا اظہار ہونا چاہیے، اور اپنی ذات کے لیے درگزر، عفو وصفح سے کام لینا چاہیے، یہی سیر چشمی اور اعلیٰ ظرفی کہلاتی ہے کہ اپنا معاملہ ہو تو آدمی معاف کردے۔ لیکن اگر دین کا معاملہ ہو تو وہاں معاف کرنا سیر چشمی نہیں کہلاتی۔

جنتیوں کی چند صفات

۶۴۲:- وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ؟ أَوْ بِمَنْ تَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارُ؟ تَحْرُمُ عَلَى كُلِّ قَرِيبٍ، هَيِّنٍ، لَيِّنٍ، سَهْلٍ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں وہ آدمی نہ بتلاؤں جو جہنم پر حرام ہے یا جہنم اس پر حرام ہے؟ پوچھا گیا: کون؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جہنم ہر اس آدمی پر حرام ہے جو لوگوں سے قریب ہو، طبیعت کا نرم ہو، اور سہولت پیدا کرنے والا ہو۔

افادات:- حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو بلائیں گے اور تمام اوّلین وآخرین کے سامنے فرشتوں سے پوچھیں گے کہ اس کے اعمال نامہ میں کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ تو سب جانتے ہیں پھر بھی پوچھیں گے۔ فرشتے کہیں گے

کہ کوئی زیادہ نماز روزے تو ہیں نہیں، البتہ اس کے ساتھ جب کوئی زیادتی کرتا تھا تو یہ معاف کر دیتا تھا۔ اور اس کے جو مالی مطالبے لوگوں پر ہوتے تھے، جیسے کسی کو بطورِ قرض پیسے دے رکھے ہیں، اس سے وصولی کرنی ہے اور سامنے والا کہتا کہ بھائی! ابھی میرے پاس گنجائش نہیں ہے، تو وہ اپنے آدمیوں سے کہتا تھا کہ اس کے ساتھ نرمی کرو۔ باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ بندہ اور مخلوق ہو کر ایسا کرتا تھا تو میں تو اور زیادہ اس بات کا حقدار ہوں اور سب کے سامنے اس کا اعزاز کیا جائے گا اور اس کے لیے جنت کا فیصلہ ہوگا۔ (بخاری: باب مَا ذُکِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ. حدیث: ۳۴۵۱/مسلم: باب فَضْلِ إِنْظَارِ الْمُعْسِرِ.)

تو حقیقت یہ ہے کہ بردباری، غصہ کو روکنا اور نرمی کا معاملہ کرنا؛ یہ شریعت کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔ اگر آدمی اپنی زندگی میں اس ایک اصول کو اپنا لے اور حضور اکرم ﷺ کی اس ایک ہدایت کو اختیار کر لے تو ہر اعتبار سے کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

باب العفو والاعراض عن الجاھلین

نادانوں کو معاف کرنا
اور
چشم پوشی سے کام لینا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چشم پوشی سے کام لینا

پچھلے دو تین عنوانات جو گزرے ان میں صبر اور بردباری کا بیان تھا۔ اب ایک ذیلی اور ضمنی عنوان قائم کیا ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے ہیں، اور جو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہیے، ویسا رویہ اور سلوک اختیار کرنے کے بجائے، ناروا اور غلط سلوک کرتے ہیں، ایسوں سے صَرفِ نظر کرنا، چشم پوشی سے کام لینا، ان کو معاف کر دینا اور درگزر کرنا۔

صبر اور تحمل کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کو برداشت کرلیا، اب آگے کا درجہ یہ ہے کہ آپ اس کے اس غلط رویہ کا انتقام لے سکتے ہیں، آپ میں اس کی طاقت بھی ہے اور کوئی ایسی صورت بھی ہے جہاں شریعت نے آپ کو اس سے اتنا بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، جتنی زیادتی اس نے آپ کے ساتھ کی ہے، اس کے باوجود آپ چھوڑ دیں اور اس کو معاف کر دیں؛ تو یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ اس صفت کو اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اسی سے متعلق کچھ چیزیں یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

آیتیں تو تقریباً وہی ہیں جو پچھلے ابواب میں گذر چکیں، پہلی آیت ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ اور عادت بنایئے، اور بھلی بات کا لوگوں کو حکم دیجیے، اور جو لوگ آپ کے ساتھ جہالت کا سلوک کریں ان سے چشم پوشی اور اعراض کیجیے۔

سورۂ نور کی یہ آیت بھی پہلے گزر چکی ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ درگزر سے کام لیں اور معاف کر دیں۔ کیا تم اس بات کو

پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پہلے بھی گزرا کہ انہوں نے اپنی خالہ زاد بہن کے بیٹے حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نفقہ اور خرچہ بند کر دیا تھا، جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان والے قصہ میں نادانستہ حصہ لیا تھا، اور آئندہ نہ دینے کی قسم کھالی تھی، جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ قصہ پہلے کئی مرتبہ تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ یہ آیت بھی پہلے گزری ہے کہ جو لوگوں سے درگزر کرنے اور معاف کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکار لوگوں کو پسند کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾ جو آدمی صبر سے کام لے اور معاف کردے، تو یہ بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عفو

۶۴۳:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا أنها قالت للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: هَلْ أَتَى عَلَيْكَ يَوْمٌ كَانَ أَشَدَّ مِنْ يَوْمِ أُحُدٍ؟ قَالَ: لَقَدْ لَقِيْتُ مِنْ قَوْمِكِ، وَكَانَ أَشَدُّ مَا لَقِيْتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ، إِذْ عَرَضْتُ نَفْسِي عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالِيْلَ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ، فَلَمْ يُجِبْنِي إِلَى مَا أَرَدْتُ، فَانْطَلَقْتُ وَأَنَا مَهْمُوْمٌ عَلَى وَجْهِي، فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلَّا وَأَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ، فَرَفَعْتُ رَأْسِي، وَإِذَا أَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ أَظَلَّتْنِي، فَنَظَرْتُ فَإِذَا فِيْهَا جِبْرِيْلُ علیہ السلام فَنَادَانِي، فَقَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالَى قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ، وَمَا رَدُّوْا عَلَيْكَ، وَقَدْ بَعَثَ إِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَأْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِيْهِمْ. فَنَادَانِي مَلَكُ الْجِبَالِ، فَسَلَّمَ عَلَيَّ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ، وَأَنَا مَلَكُ

الجِبالِ، وَقَدْ بَعَثَنِي رَبِّي إِلَيْكَ لِتَأْمُرَنِي بِأَمْرِكَ، فَمَا شِئْتَ، إِنْ شِئْتَ أَطْبَقْتُ عَلَيْهِمُ الأَخْشَبَيْنِ. فَقَالَ النبيُّ ﷺ بَلْ أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللهُ مِنْ أَصْلاَبِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللهَ وَحْدَهُ لاَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((الأَخْشَبَان)): الجَبَلاَن المُحيطان بمكّة. وَالأخشبُ: هُوَ الجبل الغليظ

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: آپ پر اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن گزرا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری قوم کی طرف سے مجھے بہت سی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں، اور سب زیادہ سخت ایذا جو مجھے ان سے پہنچی وہ عقبہ والا دن تھا۔ جس وقت میں نے ابن عبد یا لَیل بن عبد کُلال کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا، اور اس کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی، تو اس نے وہ دعوت قبول نہیں کی۔ میں وہاں سے ایسی حالت میں واپس چلا کہ میں بڑا غمگین تھا، اس غم کی حالت سے میں نے ابھی کچھ سکون وقرار بھی نہیں پایا تھا کہ میں مقامِ قرنِ ثعالِب میں پہنچا، جب میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک بادل سا آیا جس نے مجھ پر سایہ کرلیا، میں نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا: آپ نے قوم کی جو بات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے سنی اور انہوں نے جو جواب دیا وہ بھی سنا، اب آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا ہے تا کہ آپ ان کے سلسلہ میں اس فرشتہ کو جو چاہیں حکم کریں، وہ حکم بجالائے گا۔ چناں چہ پہاڑوں کے فرشتے نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا اور عرض کیا: اے محمد (ﷺ)! آپ کی قوم نے آپ کو جو جواب دیا وہ اللہ تعالیٰ نے سنا۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے تا کہ آپ ان کے سلسلہ میں جو چاہیں؛ حکم کریں، مَیں ایسا ہی کروں گا۔ فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو آس پاس کے ان دونوں پہاڑوں کو میں ایک کردوں (اور یہاں والے

درمیان میں پس جائیں۔) حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: نہیں! بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا کریں گے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں ہوں گے۔

افادات:- غزوۂ اُحد؛ مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان ۳ھ میں ایک جنگ ہوئی تھی۔ مشرکینِ مکہ لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے آئے تھے اور نبی کریم ﷺ مسلمانوں کو لے کر ان کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر- جہاں اُحد پہاڑ واقع ہے- تشریف لے گئے تھے، اور وہاں دونوں لشکروں کے درمیان مقابلہ ہوا، شروع میں تو مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا لیکن نبی کریم ﷺ نے کچھ لوگوں کو ایک مخصوص جگہ پر مقرر کیا تھا اور ان کا مورچہ بنایا تھا کہ اس جگہ کو نہ چھوڑنا، چاہے ہم کامیاب ہوں یا ناکام۔ لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کی کامیابی دیکھی، تو اپنی وہ جگہ- جہاں ان کو حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا- چھوڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں آخر میں مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ستر (۷۰) سے زیادہ صحابۂ کرامؓ شہید ہوئے۔ خود نبیٔ کریم ﷺ کو بھی بہت زیادہ چوٹ آئی، آپ کا چہرۂ مبارک زخمی ہو گیا، آپ کے دندانِ مبارک کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا، آپ کو اور بھی زخم آئے، یہ بڑا سخت دن تھا؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی کے متعلق پوچھا۔ اس سوال کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے وہ ارشاد فرمایا جو اوپر گزرا۔

دیکھئے! نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ دعوتِ ایمان پیش کرنے کے جواب میں قوم کی طرف سے جو نازیبا سلوک کیا گیا تھا؛ اس سے نبی کریم ﷺ کی طبیعتِ مبارکہ پر بڑا اثر ہوا تھا، غم وحزن اور تکلیف کی کیفیت آپ پر چھا گئی تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پاس فرشتہ بھیجا گیا، اگر آپ چاہتے تو قوم کی طرف سے کیے گئے

اس نازیبا سلوک کا بدلہ لے سکتے تھے۔ فرشتے نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے یہ بات پیش کی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معافی اور درگزر سے کام لیا، اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر یہ ایمان نہیں لائے تو ان کی نسلوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے لوگ پیدا کریں گے جو ایمان لائیں گے، اور خالص اللہ ہی کی عبادت کریں گے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل پیش کر کے ہمیں یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اتنا زیادہ ایذاء رسانی اور بداخلاقی کا سلوک کیا گیا، اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفوودرگزر اور چشم پوشی سے کام لیا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ بھیجا گیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو وہاں سے بھی منظوری مل چکی تھی، لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاف کر دیا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو نہیں مارا

۶۴۴:- وعنها رضی اللہ عنہا قالت: مَا ضَرَبَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شَيْئاً قَطُّ بِيَدِهِ، وَلَا امْرَأَةً وَلَا خَادِماً، إِلَّا أَنْ يُجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَمَا نِيلَ مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهِ، إِلَّا أَنْ يُنْتَهَكَ شَيْءٌ مِنْ مَحَارِمِ اللهِ تَعَالَى، فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ تَعَالَى. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، نہ کسی عورت کو، نہ خادم، نوکر اور غلام کو؛ البتہ اللہ کے راستہ میں اگر آپ جہاد میں شریک ہوتے؛ اس وقت دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی بات ہوتی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی گئی، آپ کو کسی نے تکلیف پہنچائی، تو آپ نے اس سے کبھی انتقام نہیں لیا، البتہ اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کا اگر کوئی آدمی ارتکاب کرتا، اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو

توڑتا؛ تو اس پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ناراض ہوکر اس سے انتقام لیتے تھے۔

افادات:- حدود تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے، مثلاً کسی نے زنا کا ارتکاب کیا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے وہ معاملہ پیش ہوا، اور زنا ثابت ہوگیا؛ تو حضور معاف نہیں کرتے تھے، کیوں کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب حاکمِ وقت کے سامنے مجرم کا کوئی ایسا جرم آجائے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے، تو حاکم اس کو معاف نہیں کرسکتا، اس لیے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اس کو معاف کرنے کا حاکم کو اختیار نہیں ہے

یہی مساوات ہے

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت فاطمہ مخزومیہ تھی، بنومخزوم قریش کا بڑا اونچا قبیلہ سمجھا جاتا تھا، ابوجہل بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر اس نے چوری کی، تو قبیلہ والے سہم گئے کہ چوری کا ثبوت ہوگیا ہے؛ اب ہاتھ کاٹا جائے گا اور پورے قبیلے کی بدنامی ہوگی۔ اس لیے لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بات کی جائے کہ درگزر سے کام لیجیے؛ لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جاکر کون کہے؟ لوگوں نے کہا: حضرت اسامہ بن زید کو تیار کرو، کیوں کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منھ بولے بیٹے تھے، اور حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہی کے بیٹے تھے۔ یہ بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بڑے لاڈلے تھے، اس لیے لوگوں نے کہا کہ اگر وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جاکر کہیں گے تو ہوسکتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کچھ چھوڑ چھاڑ دیں۔ چناں چہ سب بڑے لوگوں نے ان سے کہا اور یہ ان سب کے کہنے پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس پہنچے اور عرض کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سخت ناراض ہوئے، اور حضرت اسامہؓ سے فرمایا: "أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللهِ؟" اللہ تعالیٰ کی مقرر کی

ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کے معاملہ میں تم سفارش لے کر آئے ہو؟ اگلی قومیں اسی پر تو ہلاک ہوئی ہیں کہ ان میں سے جب کوئی نچلے درجہ کا آدمی کوئی قصور کرتا تو جو سزا مقرر ہوتی وہ اس کو دی جاتی، اور اونچے خاندان کا آدمی اگر وہی قصور کرتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا، پھر فرمایا: میری بیٹی فاطمہ (اعاذھا اللہ منہا) بھی اگر ایسے جرم کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔ (بخاری شریف: باب كَرَاهِيَةِ الشَّفَاعَةِ فِي الْحَدِّ، إِذَا رُفِعَ إِلَى السُّلْطَانِ. رقم:-۶۸۰۰، ۶۷۸۸، ۴۳۰۴، ۳۷۳۳، ۳۷۳۲، ۳۴۷۵، ۲۶۴۸)

دیکھئے! اسلام میں تو مساوات ہے۔ اور مساوات کا مطلب یہی ہے کہ قانون کے نافذ کرنے معاملہ میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کسی بڑے آدمی نے کی ہو، یا چھوٹے آدمی نے کی ہو؛ اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے، اس کے جاری کرنے کے معاملہ میں کسی کی کوئی رورعایت نہ برتی جائے؛ یہی مساوات ہے۔

قیامت تک کے لیے یہی اصول ہے

میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اگر شریعت کا کوئی حکم توڑا جاتا اور اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہوتی، اس سزا کو جاری کرنے کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی رورعایت نہیں فرماتے تھے، اور نہ رعایت کی جاسکتی تھی، قیامت تک کے لیے تمام حُکّام کو یہی حکم ہے کہ ایسے معاملہ میں کوئی رورعایت نہ کریں۔ ہاں! اگر اپنا ذاتی معاملہ ہوتا، آپ کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ کوئی آدمی اگر ناروا معاملہ کرتا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے کوئی انتقام اور بدلہ نہیں لیتے تھے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ اگر ہماری ذات کے ساتھ کسی نے کوئی ناروا سلوک کیا ہے تو ہم درگزر سے کام لیں۔

لیکن آج ہمارا معاشرہ بدل چکا ہے، دین کے معاملہ میں جہاں شریعت نے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی وہاں چھوٹ چھاٹ دیدیتے ہیں، کیوں کہ اس میں ہمارا تو کچھ نہیں بگڑتا، چاہے شریعت ٹوٹتی رہے اس کی ہمیں کوئی پروانہیں ہوتی۔اور جہاں اپنی ذات کا معاملہ آتا ہے، وہاں ہم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ اصل تو یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں آدمی درگزر سے کام لے اور معاف کردے۔اور جہاں شریعت کا کوئی حکم ٹوٹ رہا ہو، وہاں ذرا بھی رورعایت سے کام نہ لے، اس لیے کہ اصل چیز حکمِ الٰہی ہے۔

ایک دیہاتی کا طرز اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل

۶۴۵:-وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ كُنْتُ أمشي مَعَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَعَلَيْهِ بُرْدٌ نَجْرَانِيٌّ غَلِيظُ الحَاشِيَةِ. فأدْرَكَهُ أعْرَابِيٌّ فَجَبَذَهُ بِرِدَائِهِ جَبْذَةً شَدِيدَةً. فَنَظَرْتُ إِلَى صَفْحَةِ عَاتِقِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَقَدْ أَثَّرَتْ بِهَا حَاشِيَةُ الرِّدَاءِ مِنْ شِدَّةِ جَبْذَتِهِ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! مُرْ لِي مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِي عِنْدَكَ. فَالتَفَتَ إِلَيْهِ، فَضَحِكَ ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِعَطَاءٍ.

ترجمہ:-حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جارہا تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ مبارک پر نجران کی بنی ہوئی موٹے کنارے والی ایک چادر تھی، ایک دیہاتی آیا اور آپ کو اس چادر سے پکڑ کر زور سے اس طرح کھینچا کہ میں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن مبارک پر دیکھا کہ چادر کو زور سے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ گیا (دراصل وہ دیہاتی کچھ بات کرنا چاہتا تھا تو اس نے اس طریقہ سے معاملہ کیا) پھر کہنے لگا: اللہ تعالیٰ کا جو مال آپ کی تحویل اور تصرف میں ہے اس میں سے میرے لیے کچھ دینے کا حکم دیجیے (حالاں کہ یہ بات

ویسے بھی عرض کر سکتا تھا لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا) حضورِ اکرم ﷺ اس کو دیکھ کر مسکرائے اور اس کو دینے کا حکم فرمایا۔

افادات:- اس روایت کو لاکر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی صبر و تحمل اور بردباری سے کام لے، برداشت کرے، معاف بھی کرے اور مزید احسان بھی کرے؛ گویا یہ چاروں کام کرے۔ پہلا درجہ صبر کا ہے، پھر تحمل کا درجہ ہے، اس کے بعد معافی کا درجہ ہے، اور معافی کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا بتلایا ہوا اصل طریقہ یہی ہے۔ یہاں دیکھئے! آپ ﷺ نے اس کے اس معاملہ پر ذرّہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ نہ صرف یہ؛ بلکہ مسکرا کر اس کے ساتھ پیش آئے اور اس نے جو درخواست کی تھی وہ بھی پوری فرمائی۔

بردباری کا عجیب امتحان

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمیوں کے درمیان بحث ہوئی، ایک کہنے لگا: حضرت امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ- جو بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے- زیادہ بردبار اور حلیم ہیں۔ دوسرے نے کہا: حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ بردبار اور حلیم ہیں۔ جو حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو زیادہ بردبار کہتا تھا اس نے کہا کہ میں امتحان لیتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کتنے بردبار ہیں۔

چوں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ اس کا بھی قصہ یہ ہوا کہ (آپ کی عادت تورات کے آخری حصہ ہی میں اٹھنے کی تھی) ایک مرتبہ تشریف لے جا رہے تھے تو ایک بڑھیا نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کسی سے کہا: یہ نوجوان عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا ہے، امام

صاحبؒ نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہنے لگے: لوگ میرے متعلق ایسا گمان رکھتے ہیں اور میں تو ایسا ہوں نہیں۔ چناں چہ اسی دن سے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھنا شروع کردی، اور پھر چالیس سال تک آپ کا یہ معمول رہا۔

اسی معمول کی وجہ سے آپ رات بھر سوتے نہیں تھے۔ اور چوں کہ تجارت بھی تھی، علمی مشغلہ بھی تھا تو فجر کی نماز کے بعد سے ظہر تک مسائل بتلانے میں اور دوسرے کاموں میں لگے رہتے تھے اور ظہر کے بعد کھانا کھا کر عصر تک قیلولہ کرتے تھے۔ بس لے دے کر قیلولہ کا اتنا وقت ہی آپ کے آرام کا تھا۔

خیر! ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امام صاحب ظہر کے بعد لیٹنے کی تیاری ہی کررہے تھے کہ اس آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب نیچے اترے اور کہا: فرمائیے؛ کیا کام ہے؟ اس نے کہا: میں ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حالاں کہ سب کو معلوم تھا کہ آپ مسائل بتلانے کے لیے صبح کے وقت بیٹھتے ہیں، اس وقت وہ آیا نہیں، اور آرام کے وقت پہنچا۔ خیر! فرمایا: کہو کیا مسئلہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں بھول گیا کہ کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ امام صاحب نے اس سے کہا: اچھا جب یاد آجائے تو پوچھ لینا، آپ نے دروازہ بند کرلیا، اوپر جا کر ابھی لیٹنے کی تیاری ہی کررہے تھے کہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب اتر کر آئے تو وہی آدمی سامنے تھا۔ اس نے کہا: آپ اوپر تشریف لے گئے تو مجھے وہ مسئلہ یاد آگیا، لیکن آپ اتر کر ابھی آدھی سیڑھی پر ہی پہنچے ہوں گے کہ پھر میں بھول گیا، تو امام صاحب نے کہا: بہت اچھا! جب یاد آجائے تو پوچھ لینا اور اس کو رخصت کیا، دروازہ بند کیا اور اوپر گئے اور لیٹے بھی نہیں تھے کہ تیسری مرتبہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ پھر اترے تو وہی آدمی تھا، کہنے لگا: مجھے مسئلہ یاد آگیا ہے، آپ نے ذرّہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور فرمایا: اچھا بھائی! پوچھو کیا مسئلہ ہے؟ تو

اس نے سوال کیا کہ انسانی پاخانہ کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟ میٹھا یا کڑوا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: جب وہ تازہ ہوتا ہے تو اس کا مزہ میٹھا ہوتا ہے، اور سوکھنے کے بعد کڑوا ہوجاتا ہے۔ اس پر اس نے پوچھا: کیا آپ نے چکھا ہے؟ امام صاحبؒ نے کوئی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کہا: ہر چیز کا مزہ معلوم کرنا چکھنے ہی پر موقوف نہیں ہے، بہت سی چیزیں آدمی عقل سے بھی معلوم کرسکتا ہے، دیکھو! جب وہ تازہ ہوتا ہے تو اس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور سوکھنے بعد مکھیاں نہیں بیٹھتیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ تازہ ہونے کی حالت میں اس کا مزہ میٹھا ہوگا۔ خیر! جب امام صاحبؒ اس کو یہ جواب دے چکے تو اس نے کہا: حضرت! مجھے معاف کردیجیے گا، دراصل میری اپنے ایک دوست کے ساتھ بحث ہوگئی تھی، میں آپ کے صبر وتحمل، عفو ودرگزر کو آزمانا چاہتا تھا، میں اس سے ہار گیا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اتنا اونچا حوصلہ کون لاسکتا ہے! اسی لیے بزرگوں کے حالات اور قصے پڑھتے رہنا چاہئیں تاکہ ہماری بدمزاجی تھوڑی بہت ٹھیک ہوتی رہے، اگر ان کے حالات پڑھتے رہیں گے تو چاہے مکمل طور پر نہ سہی، کچھ نہ کچھ اعتدال تو آ ہی جائے گا۔

تکلیف دینے پر دعا دینے کا ایک نمونہ

۶۴۶:- وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ كَأَنِّي أَنظرُ إِلَى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَحْكِي نَبِيًّا مِنَ الأَنبياءِ، صَلَوَاتُ اللهِ وَسَلامُهُ عَلَيْهِمْ، ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ، وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ، ويقول: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي؛ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں گویا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی نظروں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک نبی کا حال بیان کر رہے ہیں جن کی قوم نے ان کو اتنا مارا پیٹا کہ ان کے جسم سے خون بہنے لگا، اور وہ اپنے چہرہ سے خون صاف کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ

سے دعا کر رہے ہیں: اے اللہ! میری قوم کو معاف کر دے، اس لیے کہ وہ مجھے نہیں جانتے (کہ میں تیرا رسول ہوں، اگر وہ مجھے جانتے تو میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرتے۔)

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے آدمی کوئی قصہ جو بہت مدت پہلے پیش آیا ہو اس کو ایسے انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا میری نگاہوں کے سامنے ابھی بھی وہ منظر بالکل تازہ ہے۔ یہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی انداز سے یہ حدیث بیان فرمائی۔

اس روایت میں بھی معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔

حقیقی پہلوان

۶۴۷:- **وعن أبي هريرة** رضی اللہ تعالیٰ عنہ **أنّ رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **قَالَ: لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔

افادات:- غصہ آئے تو اس کو برداشت کرنا اور غصہ کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا؛ یہی اصل بہادری ہے۔

(نوٹ:- یہ روایت حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد اول، صبر کے بیان صفحہ ۳۳۲ پر گزر چکی ہے، وہاں غصہ کے موضوع پر تفصیلی کلام موجود ہے۔ مرتب۔)

باب إحتمال الأذیٰ

تکلیف برداشت کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اوپر والے ہی مضمون سے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے: کوئی آدمی آپ کو تکلیف پہنچائے تو آپ اس تکلیف کو برداشت کر لیجیے۔ یہاں پر بھی امام نوویؒ دو آیتیں اور ایک روایت لائے ہیں، آیتوں کا ترجمہ اور تشریح تفصیل سے پہلے گزر چکی ہے۔

گرم راکھ ڈال رہا ہے

۶۴۸:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنَّ رَجُلاً قَالَ: يَارسول الله! إنَّ لِيْ قَرَابَةً أَصِلُهم وَيَقْطَعُونِي، وَأُحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَيُسِيئُونَ إِلَيَّ، وَأَحْلُمُ عَنهم وَيَجْهَلُونَ عَلَيَّ. فَقَالَ: لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ، فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ، وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللهِ تَعَالَى ظَهِيرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذَلِكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے حقوق ادا کرتا ہوں؛ وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے۔ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں، بھلائی واحسان کا معاملہ کرتا ہوں؛ وہ میرے ساتھ برائی کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ میرے اوپر زیادتی کرتے ہیں اور میں برداشت کرتا ہوں (گویا وہ میرے ساتھ جہالت اور نادانی والا سلوک کرتے ہیں اور میں برداشت کرتا ہوں) اس پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو جو بات کہہ رہا ہے اگر واقعتاً ایسا ہی ہے؛ تو گویا تو گرم راکھ ان کے منہ میں ڈال رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے ساتھ ان کے خلاف برابر ایک مددگار رہے گا، جب تک تو اسی حالت میں ہے۔

افادات:- ویسے بھی راکھ کا منہ میں جانا آدمی کے لیے بڑی تکلیف دہ بات ہوتی ہے، اور ساتھ ہی چولہے کی گرم راکھ اگر منہ میں ڈالی جائے تو کیا حال ہوگا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اس طرح معاملہ کر کے تو ان کو شکست دے رہا ہے۔ اور جب تک تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ تیری مدد کے لیے تیرے ساتھ رہے گا۔

فرشتہ گیا، شیطان آیا

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا بھلا کہہ رہا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالکل خاموش تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ پھر جب یہ سلسلہ جاری رہا اور دیر ہوگئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو جواب دینے لگے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رخ پھرلیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے آپ نے چہرہ پھیرلیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تک تم خاموش تھے، اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا تھا جو تمہاری طرف سے اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ لیکن جب تم نے جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ وہاں سے ہٹ گیا اور شیطان آگیا، اس لیے میں نے منھ پھرلیا۔ بہرحال! اللہ تعالیٰ کی مدد آدمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ (سنن ابوداود، باب فِي الاِنْتِصَارِ۔ حدیث رقم:۴۸۹۸)

بہادری یا بزدلی

آج کل تو ہمارے سماج اور معاشرہ میں اس چیز کو بزدلی کی علامت سمجھا جاتا ہے، گویا بدلہ لینا ہی بہادری ہے۔ لیکن جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گزرا کہ اصل بہادری غصہ کو پی جانا، صبر کرنا اور معاف کردینا ہے۔ غصہ کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے کا نام بہادری ہے۔ دنیا والوں کی اصطلاح چاہے کچھ بھی ہو لیکن شریعت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتلائی ہوئی اصطلاح میں بہادری اسی کا نام ہے کہ آدمی غصہ کو پی جائے، دنیا والے چاہے اس کو بزدلی سے تعبیر کرتے رہیں۔ آج کل تو کوئی آدمی اگر ایسا کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس میں کچھ جان ہے یا نہیں؟ ارے بھائی! اس میں جان ہے تب ہی تو برداشت کر رہا ہے اور درحقیقت یہی قوت کی بات ہے، ذرا برداشت کر کے تو دیکھو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

الغضب إذا انُتهكت حرمات الشرع والانتصار لدين الله تعالىٰ

شعائر دین کی بے حرمتی کے وقت غصہ کرنا اور اللہ کے دین کے لیے بدلہ لینا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

قال اللّٰہ تعالیٰ:- وَمَن يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِندَ رَبِّهٖ.

قال اللّٰہ تعالیٰ:- اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ.

غصہ کب کر سکتے ہیں؟

اب تک تو غصہ کی قباحت کو بیان کیا تھا کہ آدمی اپنے غصہ کے اوپر کنٹرول کرے اور اس کو پینے اور دبانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس باب کو لا کر ایک موقع ایسا بھی بتلاتے ہیں جہاں شریعت کی طرف سے غصہ کو استعمال میں لانے کا حکم دیا گیا ہے شریعت کی طرف سے جو حدود مقرر ہیں اگر کوئی آدمی ان سے تجاوز کرنے لگے، شریعت کی رعایت نہ کرے، ان حدود کو توڑنے لگے۔ یا شریعت نے جن کاموں کی تعمیل کا حکم دیا ہے کوئی آدمی ان کی تعمیل نہ کرے؛ تو ایسے مواقع پر آدمی کو اپنے غصہ کا اظہار کرنا چاہیے۔

”والانتصار لدین اللہ تعالیٰ“، اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے انتقام لینا۔ یعنی دین کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے غصہ اور ناراضگی کو استعمال کرتے ہوئے جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کر رہا ہے اس سے بدلہ اور انتقام لے۔ اپنی ذات کے لیے انتقام اور بدلہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے، لیکن

اس مقصد کے لیے بدلہ لینے کا حکم ہے۔

شعائر اللہ کی عظمت رضاءِ الٰہی کا ذریعہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَن يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی تعظیم وتکریم کا حکم دیا ہے، جو آدمی ان کا احترام کرے، ان کی عظمت اور ادب کو ملحوظ رکھے، تو یہ بات اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی اچھی ہے، درجات کی بلندی اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔

"حُرُمَات" میں دین کی ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ بعض چیزیں تو وہ ہیں جو دین کا شعار اور علامت بتلائی گئی ہیں، جیسے بیت اللہ، کتاب اللہ، نبی اللہ؛ ان کے ساتھ اگر کوئی آدمی زیادتی کا معاملہ کرے، اور ان کے ادب واحترام کے خلاف کوئی حرکت کرے، ایسے موقع پر کوئی دوسرا آدمی ان کے ادب واحترام کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے غصہ کو استعمال کرے؛ تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ اگر تم اللہ کی مدد کروگے (یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اٹھوگے) تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمائے گا۔

لوگوں کو دین سے متنفر نہ کرے

۶۴۹:- وعن أَبي مسعود عقبة بن عمرو البدري رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: إِنِّي لَأَتَأَخَّرُ عَن صَلاةِ الصُّبحِ مِنْ أَجْلِ فلانٍ مِمَّا يُطِيلُ بِنَا! فَمَا رَأَيتُ النَّبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غَضِبَ فِي مَوْعِظَةٍ قَطُّ أَشَدَّ مِمَّا غَضِبَ يَوْمَئِذٍ؛ فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ مِنكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَأَيُّكُمْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيُوجِزْ؛ فَإِنَّ

مِنْ وَرَائِهِ الْكَبِيرَ وَالصَّغِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: -حضرت ابومسعود عقبہ بن عمرو بدری انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ فلاں آدمی کی وجہ سے میں فجر کی نماز میں غیر حاضر رہتا ہوں، اس لیے کہ وہ بہت لمبی قراءت کرتا ہے (یہ بات سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو نصیحت فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں کہ) کسی نصیحت و وعظ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا زیادہ غضبناک اور غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا جتنا اس روز دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں دین کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں، اس لیے تم میں سے کوئی آدمی جب امامت کرے تو مختصر نماز پڑھائے، اور ایسا اس لیے کرے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے بوڑھے بھی ہوتے ہیں، بچے بھی ہوتے ہیں اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔

نماز کی مسنون قراءت

افادات: -ایک بات ذہن نشین رہے کہ ایسی لمبی قراءت ممنوع ہے جو شریعت کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو۔ کون سی نماز میں کتنی مقدار قراءت کرنی چاہیے کتنی آیتیں ہونی چاہئیں، کون سی سورتیں پڑھنی چاہئیں؛ یہ سب احادیث سے ثابت ہے، اور فقہاء نے ان کو واضح کر کے کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ قرآن کی سورتوں کا ایک حصہ ہے جس کا نام ''مفصلات'' ہے۔ ''سورۂ حجرات'' سے لے کر ''سورۂ ناس'' تک جتنی سورتیں ہیں ان تمام کو ''مفصلات'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان میں جتنی سورتیں لمبی ہیں ان کو ''طوالِ مفصل'' کہتے ہیں، اور وہ ''سورۂ حجرات'' سے ''سورۂ بروج'' تک ہیں۔ اور جو سورتیں درمیانی درجہ کی ہیں ان کو ''اوساطِ مفصل'' کہا جاتا ہے، وہ ''سورۂ

بروج'' سے ''سورۂ لم یکن الذین کفروا'' تک ہیں۔ اور جو سورتیں چھوٹی ہیں ان کو ''قصارِ مفصل'' کہا جاتا ہے، وہ ''سورۂ لم یکن الذین کفروا'' سے ''سورۂ والناس'' تک ہیں۔ اور کون سی نماز میں کون سی سورۃ پڑھی جائے؟ تو فقہاء نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ فجر اور ظہر میں ''طوالِ مفصل'' میں سے پڑھنا سنت ہے۔ عصر وعشاء میں ''اوساطِ مفصل'' میں سے پڑھی جائے۔ اور مغرب میں ''قصارِ مفصل'' میں سے پڑھی جائے۔ اب کوئی آدمی طبیعت کی سستی وکاہلی اور دین کے ساتھ بے رغبتی کی وجہ سے مسنون قراءت کو بھی اپنے لیے لمبا سمجھتا ہو تو یہ اس کی کوتاہی سمجھی جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے حدود بتلائے ہیں۔

احادیث کا غلط استعمال نہ کریں

بعض لوگ ایسی روایتیں سن کر ان کو غلط جگہ چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی امام حدود کی رعایت کرتے ہوئے قراءت کرتا ہے تو اس کے پاس جا کر یہ حدیث سنائیں گے کہ دیکھو! حدیث میں یہ آیا ہے، اور مطلب اپنی طرف سے نکالیں گے۔ اس لیے میں نے وضاحت کردی۔

''إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ'' شریعت نے دین کے تمام امور کے لیے حدود مقرر کیے ہیں اور ہر کام کے متعلق پوری تفصیل بتائی ہے۔ کونسی نماز کونسے وقت میں کس طریقہ سے پڑھی جائے اس کی تفصیل بتلادی ہے۔ کونسا کام کس درجہ کا ہے اور کون سے کام کی فضیلت کتنی ہے۔ اور موقع ومحل کے اعتبار سے کس کام کی فضیلت بڑھ جاتی ہے۔ کسی کام کی فضیلت آج کم ہے لیکن دوسرے موقع پر اسی کام کی فضیلت زیادہ ہوجائے گی۔ جو آدمی پوری شریعت سے واقف ہوتا ہے، قرآن وحدیث کی ساری تعلیمات اس کے

سامنے ہوتی ہیں، قرآن وحدیث سے جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جن کو فقہاء نے کتابوں میں وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے، وہ ساری باتیں اس کے پیشِ نظر ہیں، وہ سارے حدود کو اچھے طریقہ سے سمجھتا ہے کہ کس موقع پر کس چیز کی رعایت ہونی چاہیے۔

جب مستحب چیز بدعت بنتی ہے

اب کچھ لوگ شریعت کی مقرر کردہ حدود کی رعایت نہیں کرتے، جس چیز کو شریعت نے جو مقام دیا ہے، اس چیز کو اس سے آگے بڑھا، یا گھٹا دیتے ہیں۔ بعض لوگ اعتقادی طور پر ایسا کرتے ہیں، تو کچھ لوگ عملی طور پر ایسا کرتے ہیں۔ ایک چیز اپنی جگہ پر صحیح اور پسندیدہ ہوتی ہے لیکن لوگ اس کو اس کے درجہ سے بڑھا دیتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ ایک چیز مستحب ہے، لیکن لوگ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے لگے کہ اس کو واجب کا درجہ دیدیا، اس کو اتنی اہمیت دیدی گئی کہ اگر کوئی آدمی وہ کام نہیں کرتا تو طعن وتشنیع کی جاتی ہے، اس پر اعتراضات وتنقید کی جاتی ہے، تو اس صورت میں مستحب ہونے کے باوجود اس کام سے روک دیا جائے گا، اب اس کو بدعت وحرام قرار دیا جائے گا؛ جب تک کہ اس کے متعلق ذہنیت ٹھیک نہ ہوجائے۔ گویا اعتقادی طور پر بھی شریعت نے ہر چیز کا مقام بتادیا۔ لہٰذا عقیدہ کے اعتبار سے بھی اس کو اسی درجہ پر رکھیے، نہ بڑھایئے اور نہ گھٹایئے۔ جس چیز کا جو گریڈ (Grade) ہے، اس کو اس سے اوپر یا نیچے کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

عملی بے اعتدالی بھی صحیح نہیں

اور عمل کے لیے بھی شریعت نے حدود اور درجات بتائے ہیں، کوئی آدمی عملی طور پر آگے پیچھے کرنے لگے، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مثلاً شریعت نے کہا

کہ روزہ صبحِ صادق سے شروع ہو کر غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔ اس لیے حکم یہ ہے کہ جب غروبِ آفتاب کا یقین ہو جائے، اور کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے، تو آپ روزہ افطار کرنے میں تاخیر نہ کیجیے، ورنہ گنہ گار ہوں گے۔ کیونکہ اب تاخیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے وقت سے زائد بھوکا رہنے کو آپ اچھا سمجھ رہے ہیں، حالاں کہ شریعت نے تو عبادت اتنے ہی وقت کے لیے رکھی ہے، آپ اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔

اُدھر سحری کے لیے حکم یہ ہے کہ اس میں جتنی تاخیر کرو اتنا ہی اچھا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ دو روزے ایک ساتھ رکھوں تو اس کی اجازت نہیں۔ مثلاً آج صبح روزہ رکھا، شام کو روزہ نہیں کھولا، رات میں بھی نہیں کھایا، نہ سحری کی؛ اور دوسرے دن کا روزہ بھی ساتھ میں ملا لیا، اس طرح دو دن کے روزے لگا تار رکھ لیے، بیچ میں کھانا پانی کچھ نہیں کیا؛ جس کو شریعت کی اصطلاح میں صومِ وصال کہتے ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح روزے رکھتے تھے، جب صحابہ کرامؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی اس طرح روزے رکھنا شروع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا تو فرمایا کہ دیکھو! مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی قوت دی جاتی ہے جس سے میں اس کو برداشت کر سکتا ہوں، تم اس طرح روزے مت رکھو۔ آپ نے ان کو حرام ہونے کی وجہ سے نہیں روکا تھا، بلکہ ان کی حالت پر شفقت کرتے ہوئے منع کیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ رمضان کے آخر میں یہ صورت پیش آئی تھی۔ دو دن ہوئے تھے اور چاند نظر آ گیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر آج انتیس کا چاند نہ ہوتا تو میں ایک روزہ ملا لیتا، پھر دیکھتا کہ کتنے لوگ میرا ساتھ دیتے ہیں۔

(بخاری: بابُ التَّنْكِيلِ لِمَنْ أَكْثَرَ الْوِصَالَ)

قانون کو ہاتھ میں نہ لیں

تو شریعت نے ہر جگہ، ہر چیز میں اور ہر کام میں اتنی وضاحت کردی ہے کہ ہر کام کا ایک مقام و درجہ متعین کردیا، اور عمل کی شکلیں بتلادیں۔ بدعت کو حرام اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس شکل کو آدمی اپنی طرف سے متعین کرتا ہے۔ حالاں کہ وہ کام نیکی کے مشابہ ہے، لیکن شریعت نے وہ طریقہ نہیں بتلایا ہے۔ گویا بدعتی شریعت اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے، اسی لیے اس کی اجازت نہیں ہے، اور اس کو حرام اور بڑا سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کہے کہ یہ کرنا ہے تو وہ عبادت ہے۔ اور جہاں منع کرے کہ نہیں کرنا ہے تو وہ گناہ ہے۔ نماز جیسی نماز کے معاملہ میں دیکھئے، شریعت نے کہا کہ سورج جب طلوع ہو رہا ہو اس وقت مت پڑھو، اگر پڑھو گے تو گنہ گار ہو گے۔ روزہ ہی کو لیجئے اگر کوئی عید کے روز رکھے تو حرام کا ارتکاب کیا۔ اسی کو شریعت کے حدود کہا جاتا ہے

اجتماعی کاموں کا ایک سنہرا اصول

اس نصیحت میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گویا یہی بتلایا کہ شریعت نے جو طریقہ بتلایا آپ جوش میں آکر اس سے آگے بڑھنے جائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کام آپ تو جوش میں کرلیں گے، لیکن ہر آدمی آپ کے جوش کا ساتھ دے یہ ضروری نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے لوگ آپ سے کٹ جائیں گے، اسی کو تعبیر کیا "إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ"۔ تم میں سے بعض لوگ ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لوگ دین سے کٹ جاتے ہیں، ان کے دلوں میں دین کے اس کام کی طرف سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے تم میں سے کوئی آدمی جب امامت کرے، تو مختصر نماز پڑھائے (اور مختصر کی تفصیل میں بتلا چکا

ہوں) ایسا اس لیے کرے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے بوڑھے بھی ہیں، بچے بھی ہیں اور ضرورت مند بھی ہیں۔ اب اگر کوئی یوں کہے کہ سب مقتدیوں نے مل کر اجازت دی ہے کہ آپ لمبی نماز پڑھائیے تو؟ جواب یہ ہے کہ تب بھی منع کریں گے، اس لیے کہ آپ کے نماز شروع کرنے کے بعد کوئی ضرورت مند آ گیا تو اس کو تو یہ بات معلوم نہیں ہے، اس لیے وہ پریشان ہوگا۔

اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ نماز کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے مثلاً: اس مسجد کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ عشاء کی نماز ۰۰-۹ بجے شروع ہوگی۔ اگر آپ کو اس وقت سے آگے پیچھے کرنا ہے، تو بورڈ پر یہ وقت مت لکھئے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک آدمی ایسا ہے جس کو ۳۰-۹ بجے کی بس میں سوار ہونا ہے، اس نے بورڈ پر دیکھا کہ یہاں ۰۰-۹ بجے کی نماز ہے، دس منٹ میں جماعت ہو جائے گی، اس لیے میں جماعت سے نماز پڑھ کر آرام سے بس پکڑلوں گا، یہ سوچ کر وہ مسجد میں آیا، لیکن مسجد میں کوئی پروگرام ہو رہا تھا، اس لیے نماز بجائے ۰۰-۹ کے ۱۵-۹ بجے شروع ہوئی، اب اس کی تو ساری گنتی فیل ہوگئی، اس کا جی نماز میں کیسے لگے گا؟ اس لیے جتنے بھی اجتماعی کام ہوتے ہیں، ان میں ان ساری چیزوں کی رعایت کی جانی چاہیے؛ کیوں کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کے دوران اگر کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تھے، تو نماز کو مختصر کر دیتے تھے کہ اس کی ماں کا جی بچے میں اٹکا ہوا رہے گا (بخاری شریف: باب من أخف الصلاۃ عند بکاء الصبی) اُس زمانہ میں عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں۔

بہر حال! یہاں شریعت کی مقرر کردہ حدود سے جو تجاوز ہو رہا تھا، ان حدود کو

برقرار رکھنے کے لیے حضور اکرم ﷺ ناراض ہوئے۔ اگرچہ لمبی نماز دیکھنے کے اعتبار سے کام کی اچھی شکل معلوم ہو رہی تھی، لیکن حضور اکرم ﷺ ٹوک رہے ہیں کہ یہی چیز آگے جا کر لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب بنے گی، اس لیے اسی وقت تنبیہ فرمائی کہ دین کے مقرر کئے ہوئے حدود کو توڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا غصہ

۶۵۰:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قَدِمَ رسولُ الله ﷺ مِنْ سَفر، وَقَدْ سَتَرْتُ سَهْوَةً لِي بِقِرَامٍ فِيهِ تَمَاثِيلُ، فَلَمَّا رَآهُ رسول الله ﷺ هتكهُ وَتَلَوَّنَ وَجهُهُ، وقال: يَاعائِشَةُ! أَشَدُّ النَّاسِ عَذَاباً عِنْدَ اللهِ يَوْمَ القيامَةِ الَّذِينَ يُضَاهُونَ بِخَلْقِ اللهِ.

((السَّهْوَةُ)): كَالصُّفَّةِ تَكُونُ بَيْنَ يدي البيت. وَ((القِرام)) بكسر القاف سِتر رقيق، وَ((هَتَكَه)): أَفْسَدَ الصُّورَةَ الَّتي فِيهِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک سفر سے واپس تشریف لائے، میں نے ایک باریک پردے کے ذریعہ- جس پر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں- ایک طاقچہ کو ڈھانپ رکھا تھا (ان کو تصویر کی حرمت کا علم نہیں تھا) حضور اکرم ﷺ نے اس پردے کو دیکھا تو آپ کا چہرۂ انور بدل گیا، آپ نے وہ پردہ پھاڑ دیا اور فرمایا: اے عائشہ! قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب والے وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کرنے کی صفت کی مماثلت و مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے تو ایسی صورت بنائی کہ اس میں جان بھی ڈال دی، لیکن یہ صرف صورت بناتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کی مشابہت اختیار کرنا

چاہتے ہیں، برابری کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ پوری پوری برابری نہیں کرسکتے۔ اسی لیے قیامت میں ان سے کہا جائے گا کہ تم نے جو تصویر بنائی تھی، اس میں جان ڈالو۔ اللہ تعالیٰ تو ایسی تصویر بناتے ہیں کہ اس میں جان بھی ڈالتے ہیں، اب تم بھی جان ڈالو، اور وہ جان ڈال نہیں سکیں گے (آخر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے)

باب کا جو عنوان قائم کیا تھا اس میں یہ بھی تھا: "والانتصار لدین اللہ تعالیٰ" اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے انتقام اور بدلہ لینا۔ تو دیکھو! ایک غلط چیز ہوئی، اس کو روکنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے عملی اقدام بھی کیا اور آئندہ کے واسطے غصے کے ساتھ تنبیہ بھی کردی۔

حدود اللہ میں رواداری نہیں

۶۵۱:- وعنها أن قريشاً أهَمَّهُمْ شَأْنُ المَرْأَةِ المخزومِيَّةِ الَّتي سَرَقَتْ، فقالوا مَنْ يُكَلِّمُ فِيهَا رسول الله ﷺ؟ فقالوا: مَنْ يَجْتَرِئُ عَلَيْهِ إِلاَّ أُسَامَةُ بنُ زَيْدٍ حِبُّ رسول الله ﷺ؟ فَكَلَّمَهُ أُسَامَةُ. فَقَالَ رسول الله ﷺ: أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ الله تَعَالَى؟ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الحَدَّ، وَايْمُ الله! لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعتُ يَدَهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کو قبیلۂ مخزوم کی عورت کے معاملہ نے بہت فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کی تھی۔ لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس بارے میں اللہ کے رسول سے کون بات کرے؟ لوگوں نے طے کیا کہ اسامہ بن زید- جو حضور ﷺ کے محبوب ہیں- ہی بات کرسکتے ہیں۔ خیر! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے بات کی، تو نبی کریم ﷺ نے ناراضگی سے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کو معاف

کرانے کے معاملہ میں تم میرے پاس سفارش لے کر آئے ہو؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: تم سے پہلی امتیں اس لیے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کا کوئی شریف (یعنی بڑے گھرانے کا) آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے (چشم پوشی سے کام لیتے تھے اور درگزر کردیتے تھے) اور کوئی کمزور (چھوٹے گھرانے کا) آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے (پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا) اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا (أعاذھا اللہ منھا) نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔

افادات:- یہ واقعہ ۸ سنہ ھ فتح مکہ کے موقعہ پر پیش آیا تھا۔ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت جس کا نام فاطمہ مخزومیہ رضی اللہ عنہا تھا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی چیزیں عاریۃً لے کر مُکر جاتی تھیں، اور کبھی کبھار کوئی چیز چُرا بھی لیا کرتی تھیں۔ اب چوری میں پکڑی گئیں، اور وہ ثابت ہوگئی (اور چوری والے جرم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے) سب کو یقین ہوگیا کہ ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا (اس لیے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزا - حد - ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا مقرر کی جاتی ہے، اس کو عربی زبان میں "حَدٌّ" کہتے ہیں۔) تو سب کو فکر لاحق ہوا کہ یہ عورت قریش کے بڑے خاندان مخزوم کی ہے، اور یہ خاندان بڑا باعزت سمجھا جاتا تھا، اگر اس کا ہاتھ کٹے گا تو پورے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ لوگ آپس میں مشورہ کے لیے بیٹھے اور یہ بات زیرِ بحث آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جا کر کوئی آدمی سفارش کرے کہ اس عورت کو سزا نہ دی جائے، چھوڑ دیا جائے اور اس کا ہاتھ کٹنے سے بچ جائے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جا کر کہے کون؟ سب لوگ اس بات پر متفق ہوئے کہ یہ جرأت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کر سکتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لاڈلے ہیں۔ ان کا لقب ہی حِبُّ رسول اللہ تھا۔ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تھے جو غلاموں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں، اور حضور اکرم ﷺ نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا، اور لوگ ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ کوئی آدمی کسی کو منہ بولا بیٹا بنالے تو اسی کی طرف اس کی نسبت کرتے اور اسی کا بیٹا کہتے تھے، لیکن بعد میں قرآنِ پاک میں اس پر ممانعت آگئی پھر زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

تو نے خرید کر مجھے انمول کر دیا

بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ یہ ایک مرتبہ کسی قافلے میں جارہے تھے، اس قافلہ پر کسی قبیلے نے شب خون مارا (اس زمانہ میں عموماً لوگ قافلہ کی شکل میں چلتے تھے اس میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے تھے۔ حملہ کی صورت میں عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر غلام باندی بنالیتے، پھر ان کو بیچ دیتے تھے) یہ پکڑے گئے اور ان کو مکہ مکرمہ لا کر بیچا گیا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں آئے۔ انہوں حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔ جب ان کے والد کو معلوم ہوا کہ قافلہ لوٹا گیا، میرا بیٹا پکڑا گیا اور اب پتہ نہیں وہ کہاں ہے، وہ بیٹے کی محبت میں بڑے پریشان تھے، ہر آنے جانے والے سے پوچھتے تھے کہ میرے بیٹے کو کہیں دیکھو تو بتانا۔

یہ مکہ مکرمہ ہی میں تھے اور بیت اللہ کی زیارت کے لیے ان کے علاقہ کے کچھ لوگ آئے، کسی نے ان کو دیکھ لیا، ان کے والد کو جا کر اطلاع دی کہ تمہارے بیٹے کو ہم نے وہاں دیکھا ہے۔ ان کے والد اور چچا دونوں مکہ مکرمہ اپنے بیٹے کو لینے کے واسطے آئے، تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس ہے۔ یہ دونوں خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ آپ کی سخاوت بڑی مشہور ہے، آپ جو قیمت چاہیں؛ ہم ادا

کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ ہمارے بیٹے کو ہمارے حوالہ کیجئے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسی سے پوچھ لو، اگر وہ آنے کو تیار ہو تو ویسے ہی لے جاؤ، اور اگر وہ انکار کرے تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ خیر! ان کو بلایا اور پوچھا کہ ان دونوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! یہ میرے ابا، اور یہ چچا ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں، میری طرف سے اختیار ہے، اگر ان کے ساتھ جانا چاہو تو جاؤ، اور میرے پاس رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں تو آپ کے پاس ہی رہوں گا۔ ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے والد اور چچا کو بڑا تعجب ہوا، ان سے کہا: غلامی کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو؟ دونوں نے بہت اصرار کیا، منایا اور سمجھایا، لیکن وہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے یہ اعلان فرمایا: تم گواہ رہو کہ میں ان کو اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ اس طرح یہ حضور ﷺ کے محبوب بنے۔ انہی کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید ہیں، یہ بھی حضور کے بڑے لاڈلے تھے اور انہی کا لقب حِبُّ رسولِ اللہ تھا۔

روایتوں میں آتا ہے حضور اکرم ﷺ اپنی ایک ران پر حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھاتے تھے، دوسری ران پر حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھاتے تھے اور دعا فرماتے تھے کہ: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے، اس سے بھی محبت فرما۔ (سیر اعلام النبلاء)

خیر! لوگوں نے کہا کہ حضور ﷺ سے سفارش تو یہی کر سکتے ہیں، ایسے موقعوں پر ایسے ہی لوگوں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ لوگوں نے ان سے کہا اور بڑے لوگوں کے کہنے کی وجہ سے وہ بھی آمادہ ہو گئے، حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ اب وہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ کتنی اہم چیز ہے، نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی سزا کے

معاملہ میں سفارش چل نہیں سکتی، اس لیے انہوں نے گفتگو کی، ان کی بات سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ’’أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللهِ تَعَالىٰ؟‘‘ اے اسامہ! تم اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کو معاف کرانے کے معاملہ میں میرے پاس سفارش لے کر آئے ہو؟ پھر آپ ﷺ نے ایک تقریر فرمائی کہ تم سے پہلی امتیں اسی لیے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کا کوئی شریف یعنی بڑے گھرانے کا آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، درگزر کر دیتے تھے۔ اور کوئی کمزور اور چھوٹے گھرانے کا آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا (أعاذ ھا اللہ منھا) چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹتا۔

یہاں پر حضور اکرم ﷺ نے جو غصہ کا اظہار فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی ایک حد کو قائم رکھنے کے لیے فرمایا۔ اور ایسی چیزوں میں نہ کوئی سفارش قبول کی جاتی ہے، اور نہ رواداری برتی جاتی ہے۔

قبلہ کی طرف تھوکنے پر حضور ﷺ کی ناراضگی

۶۵۲:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى نُخَامَةً فِي الْقِبْلَةِ، فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِ حَتّٰى رُؤِيَ فِي وَجْهِهِ، فَقَامَ فَحَكَّهُ بِيَدِهِ، فَقَالَ: إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ فِي صَلَاتِهِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ، وَإِنَّ رَبَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَلَا يَبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ، وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهِ، أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ. ثُمَّ أَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهِ فَبَصَقَ فِيهِ، ثُمَّ رَدَّ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ، فَقَالَ: أَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وَالْأَمْرُ بِالْبُصَاقِ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ هُوَ فِيمَا إِذَا كَانَ فِي غَيْرِ

المسجِدِ، فَأَمَّا فِی المسجِدِ فَلاَ یَبصُقُ إِلاَّ فِی ثَوبِہٖ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبلہ کی دیوار کے اندر بلغم کا اثر دیکھا، یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑی شاق اور گراں گزری، یہاں تک کہ اس کا اثر آپ کے چہرۂ انور میں محسوس کیا جانے لگا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُٹھے اور اپنے دستِ مبارک سے کھرچ کر اس کو صاف کیا اور فرمایا: آدمی جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنے رب سے سرگوشی کررہا ہوتا ہے، اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ گویا اس کے بالکل سامنے ہوتا ہے (قِبلَۃٌ، فِعلَۃٌ کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں چہرے کے سامنے کی حالت کو قبلہ کہتے ہیں۔ آدمی کا چہرہ کسی مخصوص جہت کی طرف ہونا) اس لیے نماز کی حالت میں سامنے کی طرف نہ تھوکے (جیسے کوئی بڑا آدمی سامنے ہو اس کی طرف تھوکنا کتنی بڑی گستاخی کی بات سمجھی جاتی ہے) اور اگر اس حالت میں تھوکنے کی ضرورت پیش آہی جائے تو بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوکے، پھر آپ نے اپنی چادر کا کنارہ پکڑ کر اس میں تھوکا، ملا اور فرمایا: یا ایسا کرے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوکنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ مسجد کے باہر کسی میدان اور صحن وغیرہ کا حکم ہے، لیکن اگر مسجد میں ہو اور تھوکنے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر ایک ہی شکل رہ جاتی ہے کہ اپنے کپڑے میں تھوک لے۔

افادات:- اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں تھوکنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے شریعت نے ایک حد مقرر کی ہے اور اس کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔ جس آدمی نے اس کے خلاف کیا اور قبلہ کی طرف تھوکا تو اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جہاں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، وہاں آدمی کو اپنی ناراضگی ظاہر کرنی چاہیے، تاکہ آئندہ ایسی نوبت نہ آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھا رہا تھا، دورانِ نماز اس نے قبلہ کی جانب تھوکا۔ بعد میں نبیٔ کریم ﷺ نے لوگوں سے کہا: آئندہ یہ آدمی تمھیں نماز نہ پڑھائے۔ چناں چہ دوسرے وقت وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا تو لوگوں نے روک دیا کہ ہم تمھاری اقتداء نہیں کریں گے۔ پوچھا: کیوں؟ سب نے کہا کہ نبیٔ کریم ﷺ منع فرمایا ہے۔ تو وہ آدمی نبیٔ کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! میں نے منع کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم نے نماز کی حالت میں قبلہ کی طرف تھوک کر اللہ اور اس کے رسول کو اذیت و تکلیف پہنچائی ہے (ابوداود شریف، باب فی کراھیۃ البزاق فی المسجد، حدیث نمبر:۴۸۱) اس لیے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں امامت کی اجازت دی جائے۔

معلوم ہوا کہ شریعت کے خلاف کوئی بات ہوئی ہو تو اس موقع پر آدمی کو اپنی ناراضگی اور ناگواری کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ آئندہ یہ سلسلہ جاری نہ رہے اور شریعت کے حدود پامال نہ ہوں۔